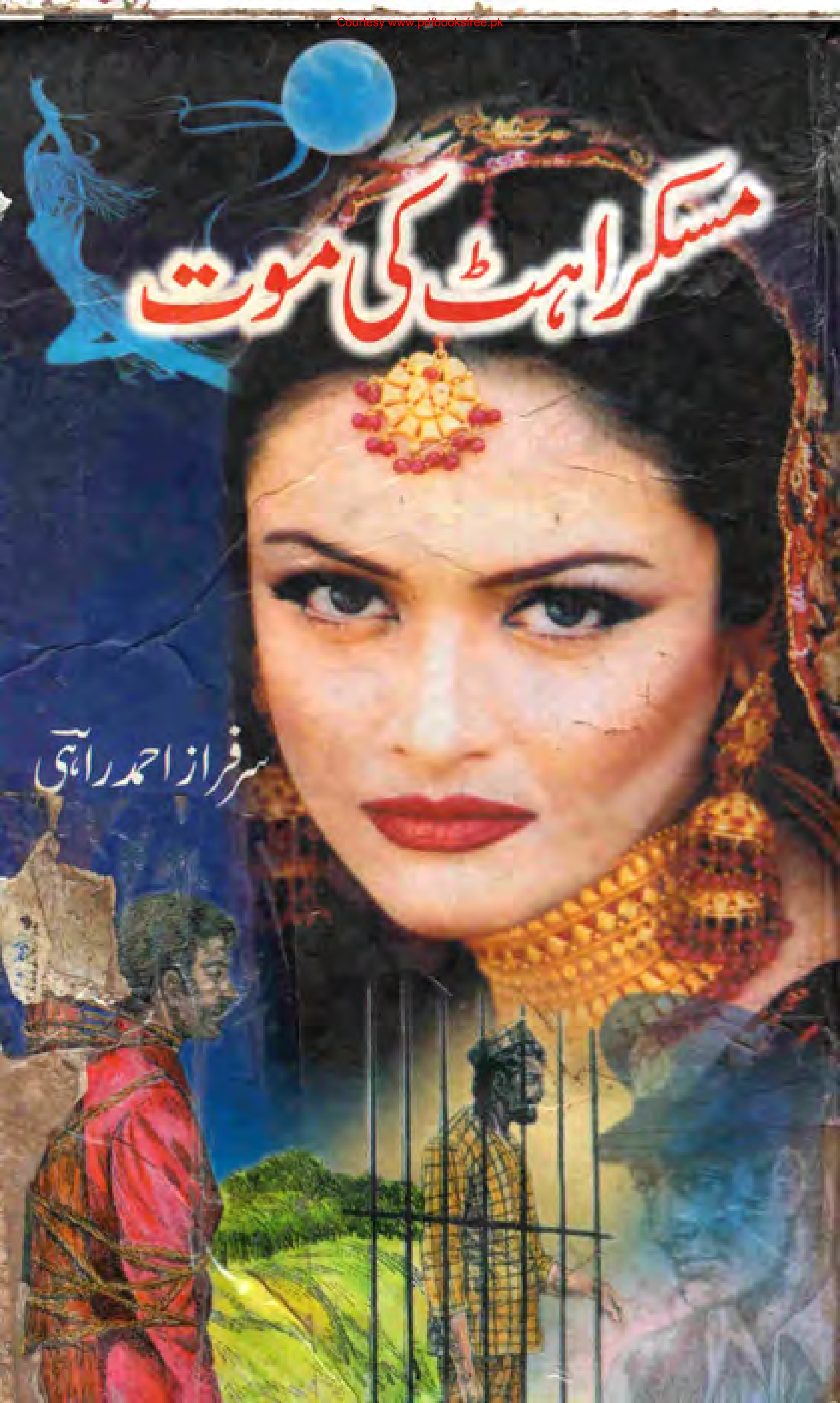

مسکراہٹ کی موت
سرفراز احمد راہی

اگر......!!

انسانی رشتے، محبت اور عقیدت کی اس ڈور سے بندھے ہوتے ہیں جس کی مضبوطی فولاد اور کمزوری پانی کے بلبلے جیسی ہوتی ہے۔ زمان ومکاں، حیات وفنا اس احساسِ عجیب کے راستے میں کوئی بند نہیں باندھ سکتے جو تعلق کے نام پر دو انسانوں یا دو جانداروں کے درمیان اور کبھی جاندار اور بے جان کے درمیان بھی جنم لیتا ہے۔

زندگی کی حدود ختم ہونے کے بعد جو دنیا موجود ہے وہاں چلے جانے والے لوٹ کر نہیں آتے مگر یہ ثابت ہے، یہ طے ہے کہ سب نہیں تاہم جن سے ہمارا دلی رشتہ اور جذباتی تعلق قائم رہتا ہے، وہ چند لوگ روحانیت کے اثبات پر مہریں لگاتے ہوئے کبھی ہمارے خوابوں میں چلے آتے ہیں۔ ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ ہماری سنتے ہیں۔ اپنی کہتے ہیں۔ گذری باتوں کو دہراتے ہیں۔ موجودہ حالات پر گفتگو کرتے ہیں۔ آنے والے وقت کے اسرار سے پردے اٹھاتے ہیں۔ ہمیں آگاہ کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں یا کبھی ایک ایسی مہک، اک ایسی خوشبو کی صورت میں ہمارے اردگرد اپنے ہونے کا احساس دلانے چلے آتے ہیں جو ہماری دنیا کے کسی پھول، کسی چمن سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ مہک جب بھی آتی ہے سکون دے جاتی ہے۔ یہ خوشبو جب بھی محسوس ہوتی ہے آنکھوں میں شبنم اور دل میں طمانیت بھر دیتی ہے۔ اپنے پیاروں کی یہ آمد ان لطیف ترین لمحات کا عکس ہوتی ہے جن سے ایک بار جڑ جانے کے بعد جدا ہونے کا خیال ہی سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں محمود اصغر کا کردار ایک ایسے ہی وجود کا اثبات ہے جو اپنے محسن، اپنے

پیارے کے لئے جب بھی خوشبو کے دوش پر سوار آتا ہے، مادیت اور روحانیت کے درمیان ایک انمٹ تعلق کی ایک نئی جہت کا در کھول جاتا ہے۔

انتقام کے بے شمار طریقے ہیں۔ سب سے آسان اور سکون دینے والا رستہ یہی ہے کہ اپنے دشمن سے نجات حاصل کر لی جائے۔ زیرِ نظر ناول اسی منزل کی جستجو ہے مگر انتقام لیتے ہوئے انسان کو اپنے مقام سے گرنا نہیں چاہئے۔ جنگ میں برابر کی سطح پر رہ کر لڑنے کا مطلب دونوں میں سے ایک کی فتح ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے اگر انسپکٹر منیر کی مکاری مدِمقابل ہو تو رانا سہیل اور استاد رؤف کی دوستی بھی ضروری ہے۔ حق ہُو کی صدائیں اور شمشاد بائی کے غیر متزلزل اصول زندگی کے دونوں رخ اجاگر کرتے ہیں۔ یہ گزرے وقت کا نوحہ، حال کا قصہ اور مستقبل کا شاخسانہ ہے۔ اسے پڑھئے اور سر دُھنئے...... اگر آپ کے سینے میں ایک حساس دل دھڑکتا ہے تو......!

آفتاب ہاشمی



"میں اپنا حق مانگ رہا ہوں۔ آپ لوگ اسے کیوں مسئلہ بنا رہے ہیں۔" شیراز نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں اور ان کے جوان بیٹوں کی طرف دیکھ کر ذرا تلخی سے کہا۔

"حق ضرور مانگو شیراز مگر اس کا وقت ہوتا ہے۔" بڑے بھائی حمید نے نمبرداری کی پگ سر پر درست کرتے ہوئے تحمل سے جواب دیا۔

"میں دو سال سے آپ لوگوں کی منتیں کر رہا ہوں۔ آخر کب آئے گا وہ وقت جب آپ لوگ مجھے میرے حصے کی زمین اور روپیہ دیں گے۔" شیراز نے اب بھی اسی لہجے میں کہا۔

"دیکھو شیراز...... بات کرو آرام سے۔ یہ تلخی ہمیں نہ دکھاؤ۔" یہ چھوٹا بھائی نذیر تھا' جو اسے بڑی تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں اب بھی تلخی نہ دکھاؤں؟" حیرت سے شیراز نے کہا۔ "دو سال سے آپ لوگ مجھے مسلسل ٹال رہے ہیں اور اب بھی میں منہ میں شکر لے کر آپ سے بات کروں۔ اس کی امید آپ مجھ سے کیوں کرتے ہیں؟"

"چچا......" اچانک حمید کے دونوں بیٹے اکرم اور آصف بندوقیں سنبھالتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "زبان سنبھال کر بات کرو چچا ورنہ......" انہوں نے کھڑ کھڑ کرتی رائفلیں اس پر سیدھی کر لیں۔

"واہ......" شیراز اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تو نوبت یہاں تک آ گئی۔"

"اے......' حمید نے ہاتھ بڑھا کر دونوں منہ زور بیٹوں کو روک دیا۔

"خبردار...... کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا...... آخر کو وہ تمہارا چچا ہے۔" آخر کو الفاظ پر اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"جتنا میں ان کا چچا ہوں اور جتنے یہ میرے بھتیجے ہیں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں حمید بھائی۔" شیراز نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے۔ اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔

"بات کو مت بڑھاؤ شیراز۔" نذیر نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمہارے کون سے چھوٹے چھوٹے بچے رو رہے ہیں' جو تم اتنے بے تاب ہو رہے ہو۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں' ورنہ شاید آج وہ بھی آپ کی بندوقوں کے نشانے پر ہوتے۔"

"شیراز...... بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔" حمید نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے ان سورماؤں سے کہئے کہ بندوقیں ہٹا لیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ان کھلونوں سے نہیں ڈرتا۔"

"ہٹاؤ...... ہٹاؤ الو کے پٹھو...... کیوں بات کو بڑھا رہے ہو۔" نذیر نے دونوں بھتیجوں کو ڈانٹا۔

"سورمائی تو ہم ابھی دکھا دیں چچا...... مگر ابا نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔" آصف نے کڑے لہجے میں کہا اور اکرم کے ساتھ ہی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"بھائی...... آپ ان کے ہاتھ کھول کیوں نہیں دیتے۔" شیراز نے حمید کی طرف دیکھا۔ "ان کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور میری یہ روز روز کی بے عزتی بھی ختم ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ ان کی کامیابی سے آپ کے راستے کا یہ کانٹا بھی صاف ہو جائے۔" اس کا اشارہ اپنی طرف تھا۔

"دیکھو شیراز...... فی الحال تم اس بات کو چھوڑ دو۔ جھگڑے میں کچھ نہیں رکھا۔ جونہی ہاتھ ذرا سیدھا ہوتا ہے' ہم تمہارے حصے کا روپیہ ادا کر دیں گے۔"

"دو سال میں جو ہاتھ سیدھا نہیں ہوا وہ مزید کتنی دیر میں سیدھا ہو گا' ابھی بتا دیں۔" شیراز کا لہجہ طنز لیے ہوئے تھا۔

"یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" لاپرواہی سے حمید نے شانے اچکائے۔ "دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ دو سال بھی اور...... اس سے زیادہ بھی۔"

"یہ تو نہ دینے والی بات ہوئی ناں......" شیراز نے القاب و آداب کو ایک طرف رکھ دیا۔

"اگر تم ہم پر شک کر رہے ہو تو یونہی سہی۔" نذیر نے جھلا کر دخل دیا۔

"ٹھیک ہے......" شیراز نے کھڑے کھڑے کہا۔ "اور زمین کے بارے میں کیا دیر ہے؟"

"زمین لے کر تم کیا کرو گے۔ تم نے کون سا اس پر ہل چلانا ہے؟ ظاہر ہے تم اسے کسی کے ہاتھ فروخت کرو گے۔"

"ہاں......" شیراز نے سر جھٹکا۔ "میں اسے اپنی مرضی سے بیچوں گا۔"

"تو اسے ہمارے پاس ہی رہنے دو۔ قیمت لے لو اس کی۔" حمید نے کہا۔

"آپ سے کس طرح لے لوں۔ آپ باپ کے چھوڑے ہوئے روپے میں سے ایک پائی تو دے نہیں رہے۔ اب کیا زمین آپ کے حوالے کر کے اس سے بھی ہاتھ دھو لوں۔"

"زمین کی قیمت تمہیں جلدی مل سکتی ہے۔"

"کتنی جلدی؟" شیراز نے نذیر کی طرف دیکھا۔

"یہی کوئی چھ ماہ میں...... فصل کٹتے ہی......"

"نہ نہ...... نہ نہ بھائی...... فصلیں کٹتے تو میں دو سال سے دیکھ رہا ہوں۔ ہر بار یا تو فصل اچھی نہیں ہوتی یا قیمت کم ملتی ہے اور مجھے ملتی ہے' صبر کی نصیحت۔ آپ مجھے یہ بتائیں صاف صاف...... کہ روپیہ کب دے رہے ہیں اور زمین کب میرے نام کر رہے ہیں۔ میں اسے جس کے پاس چاہوں بیچوں۔ یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔"

"شیراز...... زمین پر ہم کسی غیر کا وجود برداشت نہیں کریں گے۔" حمید نے اچانک دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "جب تمہیں زمین فروخت کرنا ہی ہے۔ تو ہم سے اس کی قیمت لے لو۔"

"پھر وہی بات......" شیراز تنک کر بولا۔ "جب آپ دے ہی کچھ نہیں رہے تو میں لوں کس سے اور محض وعدوں اور تسلیوں پر میں اب ٹرخنے والا نہیں ہوں۔"

"اچھا......" نذیر نے مونچھ کو مروڑا دیا۔ "تو کیا کر لو گے تم؟"

"میں سمجھا نہیں؟" شیراز کا سارا بدن تن گیا۔

"میرا مطلب ہے' اگر ہم تمہیں نہ روپیہ دیں نہ زمین...... تو کیا کر لو گے تم؟"

"میں......" شیراز کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اسے شک تو تھا کہ ایسا لمحہ آ سکتا ہے' مگر یقین نہیں تھا اور اب جب بدلحاظی' بے مروتی اور انکار سراپا اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے' تو وہ چند لمحوں کے لیے خالی الذہنی کے عالم میں دونوں بھائیوں اور جوان بھتیجوں کو دیکھا رہ گیا۔

وہ سب ہونٹوں پر تحقیر آمیز طنزیہ مسکراہٹ لیے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے' جیسے بلی چوہے کو جال میں پھنستا دیکھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔

"ہاں ہاں...... بولو...... کیا کرو گے تم؟" یہ حمید کی آواز تھی۔

"یہ آپ لوگ ٹھیک نہیں کر رہے۔" شیراز کی آواز بھرا سی گئی۔ اسے اپنے بھائیوں سے اس بے رحمی کی توقع نہیں تھی۔

"ہم جو کر رہے ہیں ٹھیک ہے یا نہیں وہ ہم جانتے ہیں۔ تم بولو...... کیا کرو گے؟" نذیر نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

"میں......" شیراز نے خود کو سنبھالا۔ "میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔"

”یعنی تم ہمیں عدالت میں گھسیٹو گے۔“

”یہ آپ کی مرضی پر ہے۔ میں تو چاہتا ہوں آپ مجھے فارغ کر دیں۔ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“ شیراز نے بے حد نرمی سے کہا۔

”ہم تمہیں ضرور فارغ کر دیں گے شیراز۔“ نذیر نے عجیب سے لہجے میں کہا اور حمید کی طرف دیکھا۔ ”اب اس کا وقت آ گیا ہے۔“

”کب؟“

”کل......“ نذیر نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

”نہیں...... آج ہی...... رات کو......“ حمید نے سخت لہجے میں کہا۔

”مگر کیسے بھائی جی؟“ نذیر نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”میں ابھی فون کرتا ہوں' اپنے دوست منیر کو...... وہ سب بندوبست کر دے گا۔“

”مگر اتنا روپیہ؟ ایک دم......“ نذیر ہکلایا۔ ”میں تو چاہتا تھا کہ شیراز کو فی الحال چار لاکھ دے دیا جائے۔ باقی......“

”نہیں بھائی......“ شیراز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں ساری رقم اکٹھی لوں گا۔ میں اب اس گاؤں میں ایک پل رکنا نہیں چاہتا۔“

”اکٹھی ہی مل جائے گی۔“ حمید نے پھر اسی عجیب مگر بظاہر خشک لہجے میں کہا۔ ”منیر میرا بہت اچھا دوست ہے۔ تھوڑا بہت سود ضرور لے گا مگر اس ساری رقم کا وہ دو گھنٹوں میں انتظام کر دے گا۔ پچیس لاکھ نقد اور زمین کے کتنے ہوئے تمہارے؟“

”ستر لاکھ۔ میں نے قیمت لگوا رکھی ہے۔“ شیراز نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پانچ لاکھ ہم دونوں کی طرف سے اس بات کے شامل کر لو کہ تم ہم سے چھوٹے ہو۔ پورا ایک کروڑ روپیہ رات کو آٹھ بجے آ کر لے جانا۔“

”سوچ لیں بھائی......“ شیراز کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مگر...... اس کے ساتھ ایک درخواست ہے تم سے!“

”جی...... فرمایئے۔“

”آج ہی رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ آج کے بعد ہم دونوں' ہماری اولاد یا بیویوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔“

”بھائی......“ شیراز نے احتجاج کرنا چاہا۔

”بس...... یہ درخواست بھی ہے اور ہمارا فیصلہ بھی۔“

”ٹھیک ہے بھائی......“ شیراز کا لہجہ شکست خوردہ ہو گیا۔ ”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“

”بس اب جاؤ۔ رات کو ٹھیک آٹھ بجے آ جانا۔“ حمید نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ایک دو لمحوں تک شیراز بڑے بھائیوں کو دیکھتا رہا جو منہ پھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر اس نے دونوں بھتیجوں کو دیکھا جو اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے اور ان کے ہاتھ بندوقوں پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ سر ہلا کر وہ آہستہ سے گھوما اور بڑے تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”بھائی...... یہ آپ نے کیا کیا؟“ اس کے جانے کے فوراً بعد نذیر نے حمید کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”ہاں ابا...... یہ تم نے کیا احمقانہ فیصلہ کر دیا؟“ آصف اور اکرم بھی غصے سے بولے۔

”میں نے جو کچھ کیا۔ تم لوگ اس کی تہہ تو کیا اس کی سطح کو بھی نہیں چھو سکتے۔“ بڑے پراسرار انداز میں حمید مسکرایا۔

”یعنی......؟“ نذیر اس کی طرف جھک آیا۔ اکرم اور آصف نے بھی کان لگا دیے۔

”تم جانتے ہو منیر کون ہے؟“

”نہیں...... آپ کے دوستوں میں تو اس نام کے کسی آدمی کو میں نہیں جانتا۔“ نذیر نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ اپنے سگے باپ کا دوست نہیں میرا کیسے ہوگا۔“

”تو پھر......؟“

”چھوڑو...... میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ پانچ بجے وہ شہر سے لوٹے گا۔ ابھی چار بجے ہیں۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔“

”مگر بھائی وہ ہے کون؟“

”ابھی بتانا کیا ضروری ہے؟“

”بھائی کچھ تو......“ نذیر نے زبان روک لی۔

”پہلے تم بتاؤ تم اسے کل تک کا وقت کیوں دے رہے تھے؟ کیا کل تک تم اس کے پیسے کا بندوبست کر سکتے تھے؟“

”نہیں بھائی...... میرا خیال یہی تھا کہ اسے چار لاکھ تک دے کر کچھ عرصے کی مہلت لیں گے۔ کل تک اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔“

”اور اگر وہ تمہاری بات نہ مانتا تو......“

"تو میں اس کی ہڈیاں توڑ کر ہسپتال میں ڈال دیتا۔" نذیر نے تلملا کر کہا۔

"یہ تو الٹا پھنسنے والی بات ہوتی۔" حمید نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ "تم جانتے ہو وہ پڑھا لکھا ہے۔ شہر میں پروفیسری کر رہا ہے۔ قانون کو ہم سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس کا بیان ہمیں لے ڈوبتا۔"

"تو پھر ...... کیا کریں ...... میری سمجھ میں تو یہی آیا تھا۔"

"نذیر ......" حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں جو کرنے جا رہا ہوں اس کے بارے میں تمہیں بھی آ کر بتاؤں گا مگر یہ جان لو کہ اگر شیراز فیصلہ کر چکا ہے تو اب وہ کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوگا اور اگر سمجھوتہ مشکل بلکہ ناممکن ہے تو اب گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑے گا' یا تیز آگ پر گرم کر کے۔ اور میں اسی کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔"

"بھائی ......" نذیر نے کہنا چاہا۔

"بس ...... باقی سب واپسی پر۔" وہ اپنی چادر کو گلے میں ٹھیک سے ڈالتے ہوئے چل پڑا۔

"ابا ...... ہم چلیں ساتھ؟" اکرم اور آصف اٹھے۔

"نہیں ......" اس نے سختی سے کہا۔ "گھر میں رہو۔ میرے آنے تک کہیں مت جانا اور نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنا۔ میرا مطلب شیراز سے ہے۔ اسے دھمکانے یا اسے بھگانے کی کوشش مت کرنا۔"

بُرا سا منہ بنا کر دونوں بھائی واپس اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ نذیر نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر زنان خانے کو چل دیا۔ حمید بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ میں جیپ کی چابیاں تلملا رہی تھیں۔



حمید' نذیر اور شیراز' چوہدری شجاع کے بیٹے تھے۔ وہ ایک بڑا زمیندار تھا۔ دس گاؤں کا نمبردار بھی تھا۔ کورٹ کچہری میں اس کی بڑی مانی جاتی تھی۔ صوبائی اسمبلی تک ہو کر لوٹا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس نے دونوں بڑے بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔ گھر میں رونق لگ گئی۔ شیراز بڑے بھائیوں سے کافی چھوٹا تھا۔ حمید کے ہاں اپنی بیوی ثریا سے دو بیٹے اکرم اور آصف پیدا ہوئے۔ نذیر کی بیوی شریفاں ابھی تک اولاد سے محروم تھی۔

شیراز باپ کا اس لیے بھی لاڈلا تھا کہ سب سے چھوٹا ہونے کی ساتھ ساتھ وہ پڑھ لکھ بھی گیا تھا۔ حمید اور نذیر تو مڈل سے آگے نہ جا سکے تاہم شیراز نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اب شہر کی ایک تعلیمی اکیڈمی میں انگلش کا پروفیسر تھا۔

چوہدری شجاع اچھا خاصا صحت مند تھا۔ بیوی کے مرنے کا اس نے روایتی چوہدریوں کی طرح اس لیے بھی زیادہ سوگ نہ منایا کہ وہ بیوی کی زندگی میں بھی طوائفوں کا رسیا تھا۔ تمام چوہدرانیوں کی طرح اس کی بیوی نفیسہ بھی اس کے سارے کرتوتوں سے آگاہ اور ہمیشہ چپ رہتی تھی۔ اسے صرف اپنے گھر سے غرض تھی' جہاں وہ چوہدرانی تھی۔ خاوند مناسب توجہ دیتا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اس لیے اسے بولنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کے مرتے ہی چوہدری شجاع کے پر اور کھل گئے۔ اب وہ کھل کھلا کر رنڈی بازی اور شراب نوشی کرنے لگا۔ اس کے لیے اس نے گاؤں کے شروع میں بنایا ہوا اپنا ڈیرا آباد کر لیا جہاں اب اس کا زیادہ تر وقت گزرنے لگا۔

اگر وہ بیمار ہوتا تو شاید جائیداد وغیرہ بیٹوں میں تقسیم کرنے کی سوچتا مگر اچھا بھلا تھا اس لیے اس طرف دھیان ہی نہ گیا کہ بے خبری میں ایک دن موت نے آ دبوچا۔ موت کی کوئی خاص وجہ نہ نکلی۔ اسے بڑے اہتمام سے دفنا دیا گیا اور اس کی موت کے چوتھے مہینے پہلی بار تینوں بھائیوں میں زمین اور روپے کی تقسیم کا قضیہ کھڑا ہوا۔

شیراز اب گاؤں میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی عمر تیس سال ہو چکی تھی۔ وہ ابھی شادی بھی نہ کر رہا تھا۔ شاید وہ اپنی طرح کوئی پڑھی لکھی لڑکی چاہتا تھا۔ اس کی بھابیوں نے بارہا اسے شادی کے لیے آمادہ کرنا چاہا' مگر وہ ہر بار طرح دے جاتا۔ دونوں بھابیوں کی خواہش تھی کہ وہ اس کی کسی ایک بہن سے شادی کر لے' مگر شیراز کے دل میں نجانے کیا تھا کہ وہ ان کے ہتھے نہ چڑھا۔

بہر حال ...... ترکے میں چھوڑے ہوئے روپے میں سے شیراز کے حصے میں پچیس لاکھ آتا تھا جو اس کے دونوں بڑے بھائی دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی بات کرتا اسے کبھی فصل کٹنے پر اور کبھی زمینوں اور باغات سے سالانہ آمدن وصول ہونے کی امید پر ٹرخا دیا جاتا۔ اصل بات یہ تھی کہ حمید اور نذیر نے باپ کے سارے روپے پر قبضہ جما لیا تھا۔ کچھ تو دونوں نے جوئے میں اڑا دیا اور کچھ رنڈی بازی کی نذر کر دیا۔ اب لے دے کے اس روپے میں سے آٹھ دس لاکھ پڑا تھا' جو شیراز کے لیے ناقابل قبول تھا۔

آج وہ شہر سے فیصلہ کر کے آیا تھا کہ بھائیوں سے اپنا حصہ لے کر لوٹے گا یا اس قضیے کو کسی انتہائی صورت حال پر پہنچا کر دم لے گا۔ بات جس ماحول میں ہوئی وہ کوئی اچھا نہ تھا۔ شیراز کو اس بات کا وہم تو تھا کہ اس کے بھائی اس سے تلخی کریں گے' مگر یہ امید نہ تھی کہ بھتیجے اس پر بندوقیں تان لیں گے اور بھائی اس سے قطع تعلقی کا اعلان کر دیں گے۔

وہ جب بھی شہر سے آتا باپ کے ڈیرے پر ٹھہرتا تھا۔ آج بھی وہ وہیں ٹھہرا۔ اس کے پاس اپنی ہونڈا سوک تھی جو اس نے ڈیرے پر چھوڑی اور حویلی چلا آیا۔ حویلی تک کا فاصلہ ایک میل کے

برابر تھا جو گاؤں والوں سے صاحب سلامت کرتے ہوئے پیدل طے کیا۔ سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ ہر ایک سے پیار اور اخلاق سے ملتا تھا اور بھائیوں کے اس ظلم و زیادتی میں کبھی حصے دار نہ بنا' جو وہ گاؤں والوں پر چوہدری ہونے کے ناطے روا رکھتے تھے۔

ڈیرا...... آٹھ دس پختہ اور وسیع و عریض کمروں پر مشتمل تھا۔ جہاں ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ چوہدری شجاع نے وہاں ٹیلی فون بھی لگوا رکھا تھا۔ اور یہ گاؤں میں سب سے بڑی عیاشی تھی جو چوہدری فیملی کو حویلی میں اور ڈیرے پر بھی حاصل تھی۔

وہ جب سے حویلی سے آیا تھا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز سوچوں میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ابال اٹھ رہا تھا۔ بھائیوں اور بھتیجوں کا سلوک اسے بار بار دکھ دے رہا تھا۔ ان کی باتیں اس کے دل میں کچوکے لگا رہی تھیں۔

سوچتے سوچتے اس کی ذہن رو بھٹکی اور ایک اور طرف بہہ نکلی۔ وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور آج رات آٹھ بجے کے اس وعدے کے بارے میں سوچنے لگا جو اس کے بھائیوں نے اس سے کیا تھا۔

کہاں تو وہ اسے مہینوں بلکہ سالوں پر ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے اور کہاں وہ ایکدم چار گھنٹے بعد اسے ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

وہ جوں جوں اس پر سوچتا گیا' اندیشے اور خطرے اس کے دماغ میں پھن اٹھاتے چلے گئے۔ جس طرح کا رویہ انہوں نے شیراز کے ساتھ اختیار کیا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اس کا دل یہ بات قبول کر رہا تھا نہ اس کے یقین کو یہ بات ہضم ہو رہی تھی' مگر دماغ مسلسل اسے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

ایک بار اس کے جی میں آئی کہ یہ روپیہ زمین سب چھوڑ کر واپس شہر لوٹ جائے۔ اکیلی جان تھی۔ معقول آمدن تھی۔ شہر میں اس نے باپ کی زندگی ہی میں اپنا مکان خرید لیا تھا۔ رہائش کی کوئی پرابلم نہ تھی۔ بینک میں بھی آٹھ نو لاکھ روپیہ جمع تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ بھائیوں سے یوں بگاڑ پیدا کرتا۔

ابھی وہ اس سوچ کو پوری طرح کسی امکانی فیصلے کے حوالے نہ کر پایا تھا کہ خون میں ابال پیدا ہوا۔ اس کے بھائیوں نے اس کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ الٹا اس کی مسلسل بے عزتی میں اپنے بیٹوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ بے عزتی کے احساس نے اسے ایک دم آگ کی زمین پرا

کھڑا کیا۔ نرمی بھری ساری سوچ پگھل کر ہوا ہو گئی۔

"میں اپنا حق لے کر رہوں گا۔ کیوں چھوڑوں میں اپنا روپیہ اور زمین ان کے اللوں تللوں کے لیے۔ میں ان سے اپنی رشتے داری نبھاتا رہوں اور وہ میرا حق رنڈیوں کے قدموں میں لٹاتے رہیں، یہ نہیں ہوگا۔ میں ان سے اپنا روپیہ وصول کر کے رہوں گا۔"

اس نے فیصلہ کیا اور الماری میں رکھے اپنے بریف کیس کی طرف بڑھ گیا۔ اسے کھولا۔ اس میں سے اپنا ریوالور نکالا، لوڈ کیا اور ہپ پاکٹ میں رکھ لیا۔ اپنی حفاظت کا خیال تھا' جو اسے اب تک ستا رہا تھا۔ ریوالور جیب میں رکھتے ہی اس کا آدھا اضطراب ختم ہو گیا۔

"چوہدری جی۔ کھانا تیار ہے۔ حکم ہو تو لگا دوں۔" دروازے میں کھڑے نوردین نے کہا تو وہ چونکا۔

"ہاں...... آں......" اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ "ارے...... ساڑھے سات بج گئے۔" وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔

"جی چوہدری جی۔" بوڑھے نوردین نے ادب سے کہا۔ وہ ڈیرے کا رکھوالا تھا اور منتظم بھی۔ اس کے نیچے چار پانچ ملازم کام کرتے تھے۔

"میں ذرا حویلی فون کر لوں۔ پھر بتاتا ہوں۔" شیراز نے تپائی پر رکھے فون کی طرف قدم بڑھائے۔

"جی چوہدری جی......" نوردین سر جھکا کر لوٹ گیا۔

"ہیلو......" رابطہ ہونے پر شیراز نے بڑی سپاٹ آواز میں کہا۔ "بھائی جی...... میں بول رہا ہوں' شیراز۔"

"ہاں...... تم آ جاؤ بھئی۔ تمہاری رقم تیار ہے۔" دوسری طرف سے حمید نے جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

حیرت سے فون کی طرف دیکھتے ہوئے شیراز نے ریسیور کریڈل پر ڈالا۔ اس کے سامنے ایک بار پھر بے یقینی کا گرداب کروٹیں لے رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... یہ کیسے ہو گیا؟" وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے سر جھٹکا۔

"بہرحال...... مجھے کیا...... یہ ان کا دردِ سر تھا کہ وہ کیسے انتظام کرتے ہیں۔ آخر دو سال سے وہ میرا روپیہ اور زمین استعمال بھی تو کر رہے ہیں۔ کبھی منافع کے نام پر ایک پائی نہیں دی مجھ کو۔"

وہ آرام کرسی کی طرف آیا۔ اس کی پشت پر پڑی جیکٹ اٹھا کر پہنی۔ ہپ پاکٹ میں موجود ریوالور کو ٹٹول کر اطمینان کیا اور کمرے سے نکل آیا۔

"نوردین...... میں حویلی جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے آواز دی۔

"کھانا واپس آ کر کھاؤں گا۔"

"جی چوہدری جی......" نوردین نے برآمدے میں پڑی بڑی چارپائی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

کار کو سٹارٹ کر کے وہ ڈیرے سے نکلا اور حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس نے وہاں پیدل جانا مناسب نہ سمجھا۔ نجانے کیوں؟



"لو بھئی...... رقم گن لو...... پورے دس لاکھ ہیں۔" حمید نے بریف کیس اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"دس لاکھ!" اس نے بریف کیس کو چھوتے چھوتے رک کر کہا۔

"ہاں ہاں۔ گھبراؤ مت۔" حمید نے اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"باقی نوے لاکھ کے زیورات ہیں۔"

"زیورات؟" وہ بھڑک گیا۔ حیرت سے اس نے نذیر' آصف' اکرم اور آخر میں پھر حمید کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے۔ "زیورات کا میں کیا کروں گا بھائی؟"

"بیچ دینا۔" لاپرواہی سے حمید نے کہا۔ "زیورات کی رسیدیں ساتھ موجود ہیں۔ تمہیں دقت نہیں ہو گی۔ سمجھنا کہ زمین کے بجائے زیورات فروخت کرنا پڑ گئے۔"

"مگر بھائی جی۔" اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

"نہ بھی بیچو تو اپنی بیوی کو پہنا دینا۔ نوے لاکھ کے زیورات اس کے لیے کم پرکشش نہ ہوں گے۔" حمید نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔

"بیوی ابھی کہاں ہے میری؟" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"کبھی تو ہو گی۔" نذیر نے طنز سے کہا۔ "زمین کی طرح زیور بھی کبھی کم قیمت نہیں ہوتا۔ یہ بھی وقت کے ساتھ اپنی بولی بڑھاتا رہتا ہے۔ سودا گھاٹے کا نہیں ہے۔"

"بحث مت کرو شیراز۔" حمید نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نجانے کس طرح سے یہ سب بندوبست کر پایا ہوں۔"

"مگر بھائی یہ تو میرے علم میں نہیں تھا کہ آپ...... اس طرح مجھے ذلیل کریں گے۔ میں اپنی بھابیوں کے زیورات لیتا کیا اچھا لگوں گا؟"

"مجبوری ہے شیراز...... میں اب مزید نہ تو بدمزگی چاہتا ہوں' نہ تم سے کوئی رشتہ رکھنا چاہتا

ہوں۔" حمید نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرے دوست منیر نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا ہے کیونکہ اس سے بھی فوری طور پر نقد روپے کا بندوبست نہیں ہو سکا۔"

"تو بھائی...... آپ یہ زیورات رکھ لیں۔" شیراز نے اس کی کڑوی بات کو برداشت کرتے ہوئے بڑے حوصلے سے کہا۔ "جب آپ آسانی سے دے سکیں دے دیجئے گا میرا حق۔"

"تمہارا حق...... تمہارا حق......" حمید ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ وہ طیش میں لرزتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "اٹھاؤ اپنا یہ حق اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ہم لوگ تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔" شیراز کا دماغ گھوم گیا۔

وہ مسلسل نرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر حمید اور نذیر اسے بے عزتی کے نشانے پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور بریف کیس اٹھا لیا۔

"رکو......" حمید نے تلخی سے کہا۔ "اسے کھولو۔ چیک کرو اور اس کاغذ پر سائن کرو۔ پھر جانا۔"

اس نے ایک سٹیمپ پیپر اس کے آگے کر دیا۔ شیراز نے سٹیمپ پیپر لیا اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ حمید مونچھوں کو مروڑے دیتا ہوا اسی طرح کھڑا رہا۔

وہ اقرار نامہ تھا اس بات کا کہ شیراز نے اپنے بھائیوں سے ترکے کا روپیہ اور زمین کی قیمت وصول کر لی ہے۔ صاف اور ابہام سے پاک عبارت تھی جس کے مطابق اب حمید اور نذیر کے ذمے کوئی واجب الادا رقم ایسی نہ تھی' جو اس کا حق بنتی ہو۔

اس نے سٹیمپ پیپر سامنے میز پر رکھا۔ بریف کیس کھولا۔ اندر موجود ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ وہ دس تھیں۔ پھر زیورات کے اوپر پڑی رسیدیں دیکھیں جو تقریباً نوے لاکھ روپے کی مالیت کی تھیں۔

بریف کیس بند کر کے اس نے حمید کی طرف دیکھا جو واپس اپنی جگہ بیٹھ چکا تھا اور نذیر' آصف اور اکرم کی نظریں شیراز پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی نظر میں اس کے لیے شناسائی تھی نہ خواہش۔ احترام تھا۔ نہ پیار۔

اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ایک بوجھ سا اس کی روح پر آن گرا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر ان رشتوں کو گلے لگا لے جو اس روپے کی وجہ سے اس سے ناراض ہو رہے ہیں۔ روٹھے جا رہے ہیں۔ ٹوٹنے والے ہیں۔

"سوچو مت۔ سائن کرو اور نکلو یہاں سے چچا۔" ایک دم بھڑکا دینے والے انداز میں آصف نے کہا۔

اور...... وہ بھڑک گیا۔

ایک فقرے کی آگ نے سارے احساسات' سارے جذبوں اور ساری نرمیوں کو چاٹ لیا۔ قلم نکال کر اس نے سٹیمپ پیپر پر سائن کئے۔ قلم بند کر کے جیب میں ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر نظر اسے طنز سے دیکھ رہی تھی۔ ہر انداز میں اس کے لیے تمسخر تھا۔ ہر آنکھ اس کو بے لباس کر رہی تھی۔ ہر شخص اس کا تماشائی تھا۔

''خدا حافظ بھائی......''

اس نے بریف کیس اٹھایا اور ایک جھٹکے سے دروازے کی طرف پلٹا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اللہ ہی حافظ۔'' حمید کی طنزیہ آواز نے اس کے قدموں کو ایک لمحے کے لیے روکا۔ اس نے گردن گھما کر ان سب کو ایک نظر دیکھا۔ سب کے ہونٹوں پر عجیب سی بے رحم مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے نکال کر' اس سے رشتہ توڑ کر' اس کو فارغ کر کے بے حد خوش لگ رہے تھے۔

رخ پھیر کر اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اسے محسوس ہوا زنان خانے کے دروازے میں اس کی بھابیاں کھڑی ہیں۔ اس نے اس طرف دیکھنا چاہا۔

''خاموشی سے کسی طرف دیکھے بغیر دفعان ہو جاؤ۔ اب اس گھر کے کسی فرد سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' حمید کی دھاڑتی ہوئی آواز ابھری اور ٹھٹک کر رکتا ہوا شیراز لرز کر رہ گیا۔

قدم قدم پر بے عزتی' قدم قدم پر توہین۔ طعنے' طنز' بیگانگی کا احساس دلاتے ہوئے فقرے' رشتے توڑتے ہوئے جملے۔ تیزی سے دروازہ عبور کر کے وہ کاریڈور میں آیا۔

''ہونہہ...... بے غیرت کہیں کا۔'' یہ اس کی بڑی بھابی ثریا کی آواز تھی۔

''بے شرم بھی ہے۔'' شریفاں نے ساتھ نبھایا۔ اس سے چلنا دوبھر ہو گیا۔

وہ نمکین پانی سے لبالب حلق میں درد کے احساس کو شدت اختیار کرتے پا کر لڑکھڑا گیا۔ آنکھوں میں شبنمی دھند پھیلنے لگی تھی۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ' بڑا جبر کرتے ہوئے کار تک آیا۔ دروازہ کھولا۔ بریف کیس پچھلی سیٹ پر پھینکا۔ خود اگلی سیٹ پر گر پڑا۔ پھر ہچکیوں کی آواز اتنی بلند ہوئی کہ اگنیشن میں چابی گھومنے پر غراتے ہوئے' انجن کی آواز اس میں دب کر رہ گئی۔

وہ رو رہا تھا' بلک رہا تھا اور...... لرزتے ہاتھوں سے اسٹیرنگ گھما رہا تھا۔ دھندلے راستے پر اس کی کار ڈولتی ہوئی یوں آگے بڑھ رہی تھی' جیسے کسی اکیلے آدمی نے کوئی لاش کندھوں پر اٹھا رکھی ہو اور گرتا پڑتا قبرستان کی طرف جا رہا ہو۔





نور دین مسلسل اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ اس نے شیراز کو گودوں کھلایا تھا۔ چوہدری کا بیٹا ہونے کے باوجود شیراز نے اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ نور دین اس کا ملازم ہے۔ تاہم نور دین نے کبھی حفظ مراتب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے چوہدری جی۔ چوہدری صاحب کہہ کر ہی بلاتا تھا اور اس کی جی جان سے خدمت بھی کرتا تھا۔

نور دین کو شیراز نے ہچکیوں کے درمیان ساری بات بتائی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا مگر شیراز کو دلاسہ دینا تو اس کے بس میں تھا' سو وہ اسے دیے جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے شیراز کی حالت سنبھلی۔ اس نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ متورم آنکھوں سے اب بھی آنسو نکلتے آ رہے تھے۔ تاہم اب صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ تولیے سے ہاتھ منہ خشک کرتے ہوئے وہ باہر نکلا۔

''کھانا لگا دیا ہے' چوہدری جی۔'' نور دین نے سامنے میز کی طرف اشارہ کیا جس پر کھانا چنا ہوا تھا۔

''نہیں نور دین...... میرا جی نہیں چاہ رہا......'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں بس اب واپس جا رہا ہوں۔''

''تھوڑا بہت کھا لیں چوہدری جی۔ میری خاطر۔'' نور دین نے صافے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار رو دیا تھا۔

''ایک لقمہ نہیں اترے گا حلق سے نور دین۔'' اس نے تولیہ ایک طرف ڈال دیا۔ ''بس...... تم میرا سامان گاڑی میں رکھ دو۔''

''جی چوہدری جی۔'' دین نور دین نے بحث فضول سمجھتے ہوئے سپر ڈال دی۔ اسی وقت باہر

کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔

"کون ہو سکتا ہے؟" ایک دم شیراز کے دل میں خیال آیا...... "شاید اس کے بھائیوں کو اس کی محبت کھینچ لائی ہو۔ شاید وہ اس پر کی گئی اپنی زیادتی کی تلافی کے لیے اسے لینے آئے ہوں شاید...... شاید...... اور یہ شاید اس وقت یقین میں بدل گیا۔ جب واقعی اس نے دروازے سے حمید نذیر، آصف، اکرم، ثریا اور شریفاں کو داخل ہوتے دیکھا۔ مگر...... ان سب سے آگے جو شخص تھا۔ اس کے بارے میں تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کا یہاں کیا کام؟

"یہی ہے جی ہمارا بھائی......" حمید نے ہاتھ میں ڈنڈا گھماتے ہوئے انسپکٹر کو بتایا۔ جو سب سے آگے کھڑا شیراز کو بڑی سرد نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"کیا مطلب...... کیا ہوا بھائی جی......" شیراز ہکلا کر رہ گیا۔ "آپ سب لوگ یہاں اور یہ......" اس نے انسپکٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ انسپکٹر منیر...... دو ہفتے پہلے ہمارے گاؤں کی پولیس چوکی میں تعینات ہوا ہے۔" حمید نے بڑے عجیب لہجے میں تعارف کرایا۔ "اور منیر...... یہ ہے میرا بھائی شیراز......"

"جو تمہارے گھر سے دس لاکھ نقد اور نو لاکھ کے زیورات چوری کر کے بھاگا ہے۔"

"چوری......" شیراز کے سر پر جیسے بم پھٹا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر؟"

"میں نہیں...... یہ سب کہہ رہے ہیں......" انسپکٹر نے سب لوگوں کی جانب اپنے سیاہ ڈنڈے سے اشارہ کیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ تڑپ کر بولا۔ "وہ میرا حق ہے جو ان لوگوں نے اپنی مرضی سے مجھے دیا۔ میں تو لے ہی نہیں رہا تھا۔"

"بڑے حاتم طائی ہو ناں تم......" نذیر، آصف اور اکرم کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ "ایک کروڑ ہمیں دان کر کے جا رہے تھے۔"

ثریا اور شریفاں بھی ایک طرف آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اسی وقت ان سب کے پیچھے موجود چار سپاہی بھی رائفلیں تانے اندر چلے آئے۔

"بات اتنی ہے انسپکٹر منیر......" حمید نے اپنی چادر کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنا حصہ شہر کی ہیرا منڈی میں اڑا چکا ہے۔ بار بار ہم سے مزید روپے کا تقاضا کرنے آ دھمکتا ہے۔ اس بار میں نے کچھ دینے سے انکار کیا تو اس نے اس وقت گھر میں چوری کی جب میں تم سے ملنے چوکی آیا ہوا

تھا۔ گھر میں موجود عورتوں کو اس نے ڈرا دھمکا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اکرم اور آصف اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔ نذیر ابھی ابھی شہر سے لوٹا ہے اور اس کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ یہ گھر میں موجود روپیہ اور زیور سمیٹتا اور رفو چکر ہو جاتا۔ وہ تو بھلا ہو تمہارا کہ تم نے مجھے جلدی فارغ کر دیا اور میں گھر چلا آیا۔ گھر کے تینوں نوکر بھی آج چھٹی پر تھے۔ نوکرانیاں شام ہوتے ہی اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی جو اسے اس کام سے باز رکھ پاتی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کے فرار ہونے سے پہلے ہم لوگ پہنچ گئے ورنہ مشکل ہو جاتی۔"

"مشکل کیا ہو جاتی۔" انسپکٹر نے بڑی بے رحم نظروں سے شیراز کو گھور کر دیکھا۔ "بس شہر تک جانا پڑتا پھر میں اسے وہاں سے خارش زدہ کتے کی طرح مارتا ہوا یہاں لے آتا۔"

"زبان کو روکو انسپکٹر......" شیراز نے صورت حال کو اتنی دیر میں جانچ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ بڑی بری طرح پھنس چکا ہے۔

"وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

"کون سا بریف کیس؟" شیراز نے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جس میں تم سارا مال لے کر آئے ہو؟"

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں بریف کیس میں مال لے کر آیا ہوں۔" شیراز نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائے رکھیں۔

"میرے سامنے تم نے بریف کیس...... سیاہ رنگ کے بریف کیس میں روپے اور زیورات ڈالے تھے۔" ثریا نے بپھر کر کہا۔

"اور میں بھی وہیں موجود تھی۔ سیاہ بریف کیس اس نے ہمارے ہی گھر سے لیا تھا۔" شریفاں نے گواہی دی۔

"بھابی...... خدا کا خوف کرو۔" شیراز نے ثریا اور شریفاں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہو اور بھائی......" وہ حمید اور نذیر کی طرف پلٹا۔ "جب میں سب کچھ اپنی خوشی سے آپ لوگوں کو دے رہا تھا تو کیوں آپ ایسا گھناؤنا منصوبہ بنا کر مجھے پھنسا رہے ہیں؟"

"منصوبہ...... اور ہم بنا رہے ہیں۔" حمید حیرت سے بولا۔ "منصوبہ تو تم نے بنایا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ ہم تو تمہاری پڑھی لکھی سیاست سے مار کھا گئے۔ تم پر اعتماد کرتے رہے اور تم نے ہمیں لوٹ لیا۔"

"بھائی....." وہ چیخ پڑا۔

"چیخو مت......" انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔"ایک تو چوری کرتے ہو اوپر سے سینہ زوری۔"

"میں نے کوئی چوری نہیں کی۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"یہ تو ابھی مال برآمد ہونے پر پتہ چل جائے گا۔ جلدی بولو۔ کہاں ہے بریف کیس؟"

"بریف کیس......" شیراز نے دہرایا۔ اگر ان کو بریف کیس نہ ملے تو فوری طور پر بات اتنی خطرناک نہیں ہوگی۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر اس کی نظر دروازے سے باہر کھڑے نوردین کی طرف اٹھ گئی جس کے بوڑھے چہرے پر اضطراب جھلک رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور نوردین خاموشی سے کھسک گیا۔

"جلدی بولو...... کہاں ہے بریف کیس؟" انسپکٹر نے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔

"اے......" اس نے چاروں سپاہیوں کی طرف دیکھا۔"کمرے کی تلاشی لو۔"

پھر رائفلیں کندھوں پر لٹکا کر وہ چاروں اس کے کمرے کی ایک ایک چیز پر ٹوٹ پڑے۔

"انسپکٹر صاحب...... کمرے میں کہیں بھی بریف کیس یا روپیہ زیور نہیں ہے۔"

چاروں سپاہیوں کی مشترکہ رپورٹ پر انسپکٹر کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے ریوالور نکال لیا۔

"فوراً اگل دو وہ بریف کیس۔" اس نے ریوالور کی نالی شیراز کی پیشانی پر ٹکا دی۔"ورنہ میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

"بریف کیس......"

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ......اوپر اٹھاؤ" وہ گرجا تو شیراز نے طوعاً کرہاً دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔

"تم ٹھیک نہیں کر رہے انسپکٹر منیر......" دھیرے سے شیراز نے کہا۔

"سر.....اس کی جیب میں تو ریوالور بھی ہے۔" اچانک اس کے پیچھے کھڑا سپاہی لپکا اور اس کی ہپ پاکٹ سے اس نے ریوالور نکالنا چاہا۔

"نہ نہ....." انسپکٹر نے اسے اشارے سے روکا۔"ہاتھ مت لگاؤ اسے۔ تم خود نکالو اپنا ریوالور۔ جلدی کرو۔" ایک وحشت ناک چمک انسپکٹر کی آنکھوں میں لہرائی۔

ایک ہاتھ پیچھے لے جا کر شیراز نے ریوالور نکالا اور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنے ریوالور کی نالی ابھی تک شیراز کی پیشانی پر ٹکا رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب سے رومال نکالا اور ریوالور شیراز کے ہاتھ سے اس رومال میں لپیٹتے ہوئے لے لیا۔

"اس کی گاڑی چیک کرو۔ بریف کیس شاید ابھی تک اس میں پڑا ہوگا۔" اچانک حمید نے کہا۔"یہ حویلی گاڑی پر آیا تھا۔"

اب ان سب نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ دیں اور کھلی کھلی گفتگو کرنے لگے۔

شیراز ایک ایسے چوہے دان میں پھنس چکا تھا جس سے باہر نکلنے کا راستہ فی الحال اس کے سامنے کوئی نہ تھا۔

"اے......رکو...... تم نوردین۔" اچانک باہر نکلتے آصف اور اکرم نے زور سے کہا۔

بریف کیس لے کر ڈیرے سے باہر جاتے نوردین کے قدم تیز ہو گئے۔ اس نے شیراز کی آنکھ کے اشارے کو صحیح سمجھا تھا۔ گاڑی سے بریف کیس لے کر وہ دور نکل جانا چاہتا تھا' مگر قسمت کی خرابی کہ اسی وقت اکرم اور آصف نے اسے آ لیا۔ وہ رکا نہیں' بھاگنا چاہا۔

"لگتا ہے' باہر کوئی گڑبڑ ہے۔ تم لوگ اسے سنبھالو میں دیکھتا ہوں۔" انسپکٹر نے چاروں سپاہیوں سے کہا اور انہوں نے رائفلیں تان کر شیراز کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

انسپکٹر نے ریوالور کی نالی شیراز کی پیشانی سے ہٹائی اور حمید اور نذیر کے ساتھ باہر کو لپکا۔

آصف اور اکرم شور مچاتے بھاگتے ہوئے نوردین کے پیچھے لپک رہے تھے۔

"اے.....رک جاؤ تم دونوں۔" انسپکٹر نے زور سے آواز دی۔ اکرم اور آصف نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نوردین پر ریوالور تان چکا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے ایک طرف رک گئے۔

پھر......دو فائر ہوئے۔

دونوں فائر نوردین کی کمر پر دل کے عین پچھلے حصے پر کیے گئے۔

دونوں فائر رومال میں لپیٹے شیراز کے ریوالور سے ہوئے۔ نوردین چیخ کر گرا اور تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

اکرم اور آصف نے بھاگ کر بریف کیس اٹھا لیا۔

"اندر لے آؤ......" انسپکٹر نے اپنی جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اکرم اور آصف بریف کیس لیے اندر چلے گئے۔ انسپکٹر نے اپنے ڈیش بورڈ سے پولیتھین بیگ نکالا اور شیراز کا ریوالور اس میں ڈال کر پیک کر دیا۔ ریوالور پر شیراز کی انگلیوں کے نشان تھے۔ نوردین مارا جا چکا تھا۔

انسپکٹر کے لبوں پر ایک زہریلی اور پراسرار مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اسے وہ پانچ لاکھ ہضم کرنا آسان ہو گیا' جو حمید نے اسے اس سارے کارنامے کے لئے آج سہ پہر پانچ بجے ادا کیا تھا۔

"لو بھئی چوہدری ...... تمہارا کام اور بھی آسان ہو گیا۔" انسپکٹر منیر نے پولیتھین بیگ میں پیک شیراز کا ریوالور اونچا کر کے دکھاتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

"کیا ہوا؟" حمید لپک کر اس کے پاس چلا آیا۔

"بتاتا ہوں ......" اس نے چاروں سپاہیوں کی طرف دیکھا' جو اب بھی شیراز کو ہینڈز اپ کیے کھڑے تھے۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو۔"

دو سپاہیوں نے بندوقیں کندھوں پر ڈالیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر بستر پر پڑی چادر کو پھاڑا اور شیراز کی مزاحمت کے باوجود اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر سختی سے باندھ دیے۔

"انسپکٹر...... یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ بھائی جی خدا کے لیے میرے ساتھ یہ ظلم نہ کیجیے۔ میں سارا روپیہ سارا زیور آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں آج کے بعد اپنا حق اور اس گاؤں کا نام بھی یاد نہ رکھوں گا۔" شیراز نے بار بار اپنے الفاظ دہرائے۔

مگر......وہاں تو سب پتھر ہو چکے تھے۔ کسی نے اس کی بات سنی اَن سنی کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ ہاں نذیر اور حمید نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بار بار یہ ضرور کہا۔ "اب اپنا حق لے اور موج کر......"

"بڑا شوق تھا تجھے ہم سے روپیہ نقد وصول کرنے کا۔ لے......اب ہضم کر اسے۔"

آصف اور اکرم اس پر قہقہے برساتے رہے۔ ثریا اور شریفاں اسے طعنے دیتی رہیں۔ حمید اور نذیر اسے گالیاں نکالتے رہے اور انسپکٹر منیر......اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان سب کے سامنے کھڑے بے بس شیراز کی جانب کینہ توز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب تک یہ صرف ڈکیتی کا مجرم تھا۔ اب قاتل بھی ہے۔"

"قاتل......" بے اختیار حیرت سے شیراز لڑکھڑا کر رہ گیا۔

"کسے قتل کر دیا اس حرام زادے نے؟" حمید نے فضا کو سونگھ لیا۔

"اپنے باپ کے وفادار ملازم نوردین کو۔" انسپکٹر نے اطمینان سے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میں تو یہاں موجود تھا۔ نوردین کو گولی تم لوگوں نے ماری ہو گی۔" شیراز تڑپا۔

ایک زوردار ٹھوکر انسپکٹر منیر نے شیراز کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا اور ہاتھ بندھے ہونے کے باعث لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔

"اسے ہم نے نہیں تم نے قتل کیا ہے۔ اپنے اس ریوالور کے ساتھ جس پر تمہاری انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔" انسپکٹر نے اسے پولی تھین بیگ میں بند ریوالور دکھایا۔ "اس کی دُھنائی کرو اچھی

طرح۔" اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

وہ چاروں بندوقیں ایک طرف رکھ کر اس پر ٹوٹ پڑے۔

شیراز چیختا رہا۔ چلاتا رہا۔ فریاد کرتا رہا اور مار کھاتا رہا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ورم آلود ہو گیا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر چوٹ نہ آئی ہو۔ بالآخر وہ بے ہوش ہو گیا۔

"بس......بس کرو......" انسپکٹر منیر نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور ہانپتے ہوئے شیر جوانوں نے ہاتھ روک لیے۔ ایک نہتے' بے گناہ اور ہاتھ آئے ہوئے انسان کی انہوں نے وہ درگت بنائی تھی کہ سچ نے اپنا منہ چھپا لیا اور جھوٹ بے لباس ہو کر ناچنے لگا۔

یہ سارا تماشہ وہاں موجود ہر مرد اور ہر عورت نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ان کا بھائی تھا' دیور تھا' چچا تھا' مگر سارے رشتے خودغرضی، طیش اور ناانصافی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ظلم' زیادتی اور اندھیر نگری کا راج اور طاقتور ہو گیا۔

"باہر نوردین کی لاش پڑی ہے۔ وائرلیس پر عملے کو طلب کرو اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کرو۔" انسپکٹر منیر نے تین سپاہیوں کو روانہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم......" چوتھے سپاہی کی جانب انگلی اٹھا کر وہ بڑے سرد لہجے میں بولا۔ "ان دونوں کے ساتھ مل کر مجرم کو چوکی لے جاؤ۔ میرے آنے تک اسے اگر ہوش آ جائے تو مزید خاطر کر دینا...... مگر خیال رہے یہ مرنے نہ پائے۔ ورنہ معاملہ مشکل ہو جائے گا اور حوالات سے باہر کچھ مت کرنا۔ اب جاؤ۔"

چوتھا سپاہی آصف اور اکرم کے ساتھ آگے بڑھا اور وہ مڑے تڑے شیراز کو کسی مردہ کتے کی طرح گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔ فرش پر اس کا زخمی بدن خون کی ایک لمبی لکیر بناتا چلا گیا۔

ثریا اور شریفاں بستر پر بیٹھ گئیں۔ حمید اور نذیر انسپکٹر کے ساتھ پڑی کرسیوں پر آ بیٹھے۔

"اب بولو چوہدری...... کیس تو خاصا مضبوط بن گیا ہے۔ مزید کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیس کیا بنے گا؟" نذیر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ڈکیتی اور قتل کا۔" انسپکٹر لاپروائی سے بولا۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا ریوالور برآمد ہو گیا جس پر اس کی انگلیوں کے نشان بھی موجود ہیں۔ ورنہ کچھ اور کرنا پڑتا۔"

"ہاں......یہ بہت اچھا ہو گیا۔" حمید نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کیس میں اسے سزا کتنی ہو سکتی ہے۔"

"کوشش تو میری یہ ہوگی کہ ایسی ایف۔آئی۔آر لکھوں جو اسے سیدھی پھانسی کے تختے پر لے جائے ورنہ عمر قید تو راہ میں پڑی ہے۔"

"ہوں..... لیکن ایک خطرہ تو ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر اسے عمر قید ہوگئی تو واپس آکر وہ ہمارا کیا حشر کرے گا۔" نذیر فکر مندی سے بولا۔

"جیل میں ہی مروا دینا اسے۔"

"وہ کیسے؟" دونوں آگے کو جھک آئے۔ ثریا اور شریفاں نے بھی کان ان کی طرف لگا دیے۔

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم مال پانی کا بندوبست رکھو۔"

"وہ سب ہو جائے گا۔ مال پانی کون سا ہم نے اپنا لگانا ہے۔ اسی کا حصہ ہے اسی پر خرچ کر دیں گے۔" حمید نے قہقہہ لگا کر کہا اور سب لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

"اب یہ بریف کیس ایف۔آئی۔آر کے بعد سرکاری تحویل میں رہے گا۔" انسپکٹر منیر نے حمید اور نذیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ کیوں؟" وہ دونوں چونکے۔

"سرکاری کام ہے۔ میں اس کے بغیر ایف۔آئی۔آر لکھ نہیں سکتا۔ مال تو شو کرنا پڑے گا۔"

"ایک بات میں پہلے بتا دوں انسپکٹر منیر۔" حمید اس کی نیت بھانپ کر جلدی سے بولا۔

"زیورات اس میں سارے کے سارے نقلی ہیں۔"

"ایں....." وہ اچھل پڑا۔

"ہاں......" حمید نے سر ہلایا۔ "میں اصلی زیورات کا رسک کیسے لے لیتا اور ویسے بھی اصلی زیورات اتنی مالیت کے گھر میں ہیں کہاں؟" وہ پہلو بچا گیا۔ "رہی بات دس لاکھ روپوں کی تو وہ بے شک تم ضروری کارروائی کے لیے تحویل میں رکھ لو۔ مگر یہ بتا دو کہ کتنی دیر بعد یہ وصول ہو سکیں گے۔"

"یہی کوئی دو تین ماہ تک۔" انسپکٹر مایوسی سے بولا۔ اس کے چہرے پر تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ "ویسے زیادہ دیر بھی لگ سکتی ہے۔ عموماً کیس ختم ہونے پر ہی سپرد داری دی جاتی ہے۔"

"خیر ہے....." حمید نے سر ہلایا۔ "تم صرف دس لاکھ نقد شو کرو۔ زیورات گول کر جاؤ۔"

"کرنے ہی پڑیں گے، ورنہ کیس الٹا ہمارے گلے پڑ جائے گا۔" انسپکٹر منیر نے درشتی سے کہا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔

"تو..... بریف کیس سے روپیہ نکال لوں؟" حمید نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں....." وہ سختی سے بولا۔ "روپیہ اس میں رہنے دو اور زیورات نکال لو۔"

حمید نے بریف کیس سے سارے زیوارات اور رسیدیں نکال کر ثریا کی طرف بڑھا دیے جنہیں اس نے چادر کے پلو میں لپیٹ لیا۔ دس لاکھ روپے کی دس گڈیاں بریف کیس ہی میں رہنے دیں۔ بریف کیس بند کیا اور انسپکٹر منیر کو تھما دیا۔

"چلیں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہوں۔" انسپکٹر منیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور وہ تینوں اٹھ گئے۔ "ابھی سرکاری عملہ آنے والا ہے۔ بلکہ چوہدری حمید، ہم سب کو ابھی یہیں رکنا ہوگا۔ عملے کے آنے تک ہم جا نہیں سکتے۔ ان عورتوں کو گھر روانہ کرو۔ یہ وہیں رہیں تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" حمید نے کوئی بحث نہ کی۔ "ثریا۔ تم اور شریفاں گھر چلو۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں آئی ہی نہیں، یاد رکھنا۔ ہم فارغ ہو کر آجائیں گے جاؤ۔"

حمید کے کہنے پر وہ دونوں چادریں سروں پر ٹھیک کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ایک سپاہی نے کمرے کے دروازے پر آکر کہا۔ "سر...... وہ لوگ آرہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ بھئی چوہدری۔" ناگوار انداز میں انسپکٹر منیر اٹھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں پولی تھین بیگ تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

"بھائی جی۔ یہ نقلی زیورات کا چکر آپ نے خوب چلایا۔" دبی دبی آواز میں نذیر نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خاموش....." حمید نے اسے جھڑکنے کے انداز میں سرگوشی کی۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو نوے لاکھ کے زیورات منیر کے پیٹ میں جا چکے ہوتے۔ یہ پولیس والے سگے باپ کو نہیں بخشتے۔ ہم تم کس کھیت کی مولی ہیں۔"

نذیر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حمید کے قدموں کا ساتھ دیا اور دونوں لپکتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔



نور دین کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد انسپکٹر منیر نے ثریا اور شریفاں کے بیانات لکھے جو اس کے اپنے ذہن کی اختراع تھے۔ حمید اور نذیر کو ساتھ لے کر جب وہ چوکی پہنچا تو حوالات سے شیراز کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کا اوپری بدن برہنہ کر کے اسے حوالات میں الٹا لٹکا

دیا گیا تھا۔ دوسپاہی آصف اور اکرم اس پر گھونسے' لاتیں اور ڈنڈے برسا رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتا۔ وہ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیتے۔ ہوش آجاتا تو وہ چاروں پھر اس پر مشق ستم شروع کر دیتے۔

"اسے نیچے اتارو الو کے پٹھو۔ جان سے مارو گے کیا؟" انسپکٹر منیر نے شیراز کی حالت دگرگوں دیکھی تو دھاڑا۔

سپاہیوں کے ہاتھ اور آصف اور اکرم کے قہقہے رک گئے ۔ وہ دونوں تو مونچھوں کو تاؤ دیتے باہر نکل آئے اور سپاہی شیراز کو نیچے اتارنے لگے۔ فرش پر لٹانے کے بجائے انہوں نے اس کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں گڑے کنڈوں کے حلقوں میں باندھ دیے۔ وہ بے سدھ آگے کو یوں جھک آیا' جیسے تالاب پر جھک کر اس کے پانی میں کسی شے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

حمید اور نذیر نے اس کی حالت دیکھ کر آپس میں نظریں ملائیں۔ دونوں کے دل میں رحم کے بجائے ہونٹوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا اور انسپکٹر منیر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے ۔ جو ایف۔ آئی۔ آر لکھنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

حمید اور نذیر کی طرف سے شیراز کے خلاف ڈکیتی اور قتل کی ایف۔ آئی۔ آر لکھی گئی ۔ نور دین کے بارے میں لکھا گیا کہ وہ شیراز کو فرار ہونے سے روکنے کی کوشش میں شیراز کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ آصف اور اکرم کے ساتھ انسپکٹر منیر نے قتل کے عینی شاہدین کے طور پر اپنی گواہی ڈالی کہ وہ شیراز کا پیچھا کر رہا تھا جب شیراز نے نور دین کو گولی مار دی۔ ڈکیتی میں ثریا اور شریفاں کو مدعی بنایا گیا اور ایف۔ آئی۔ آر کے شکنجے میں شیراز کو اس طرح جکڑا گیا کہ وہ پھانسی سے کم سزا پا ہی نہ سکتا تھا۔

"لو بھئی چوہدری حمید۔" انسپکٹر منیر نے ایف۔ آئی۔ آر مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا۔ "ہم نے اپنا یارانہ نبھا دیا۔ اب آگے بھی اگر میرے مشورے پر چلتے رہو گے تو پوں بارہ ہو جائیں گے۔"

"منیر خان۔" حمید نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم نے جس طرح میرا ساتھ دیا کوئی سگا بھی نہیں دیتا۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔" انسپکٹر منیر نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "سگے تو تمہارے بھائی جیسے ہوتے ہیں۔" فوراً ہی اس نے بات بدلی۔ "روپے کے لیے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں۔"

"وہ تو ہے......" چور سے لہجے میں حمید نے کہا اور نذیر کی جانب دیکھا جو سر جھکائے ہوئے تھا۔

"آؤ......ذرا اس سورے کی طرف چلیں جو تم لوگوں کے آڑے آرہا تھا۔" انسپکٹر منیر کے

ساتھ ان دونوں نے بھی کرسیاں چھوڑ دیں۔

حوالات میں داخل ہوئے تو زنجیروں میں بندھا شیراز ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زخم ہی زخم تھے۔ سینے اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اوپری بدن پر گردن تک نیل ہی نیل دکھائی دے رہے تھے۔

آصف اور اکرم حوالات کے باہر چاروں شیر جوانوں کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی اندر آگئے۔

"کرم داد......رشید خان......اسے ہوش میں لاؤ۔" انسپکٹر منیر نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے۔

چاروں میں سے دوسپاہی تیزی سے اندر داخل ہوئے ۔ ایک کونے میں بنے فلش کے ساتھ دیوار میں نصب ٹونٹی کھول کر دونوں ہاتھوں میں پانی لیا اور شیراز کے چہرے پر پھینک دیا۔

جھرجھری لے کر شیراز نے آنکھیں کھول دیں۔ متورم اور خون آلود آنکھیں محض درزی پیدا کر سکیں۔ اس کے ہونٹ سوج گئے تھے اور ان سے رستے ہوئے خون کے ساتھ کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس نے بمشکل سانس لیتے ہوئے ان لوگوں کو باری باری دیکھا اور آخر میں اس کی نظریں انسپکٹر منیر پر ٹک گئیں۔

"انسپکٹر......" اس کے ہونٹوں سے بڑی کمزور سی آواز نکلی۔ "تم نے اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میں بے گناہ ہوں اور تم ......تم ان ظالموں کا ساتھ دے رہے ہو......صرف......صرف چند کاغذ کے ٹکڑوں کی خاطر۔" وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔

"بکومت۔" انسپکٹر منیر کا پارہ چڑھ گیا۔ "سعید......شفیق......" اس نے باہر کھڑے دونوں سپاہیوں کو آواز دی۔ وہ سلاخوں والا دروازہ کھول کر اندر چلے آئے۔

"لگتا ہے تم نے اس کی دھلائی اچھے طریقے سے نہیں کی۔ ابھی تک اس کا میل باقی ہے۔"

اس نے کمر سے بیلٹ کھول لی۔ ایک دم اسے نوے لاکھ کے نقلی زیورات یاد آ گئے۔ پھر اس کا غصہ شیراز پر نہ نکلتا تو کس پر نکلتا۔ وہ پاگل کتے کی طرح اس پر پل پڑا۔ شیراز کی چیخوں سے حوالات کی دیواریں لرزتی رہیں۔ ایک منٹ بعد ہی وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

"سر......یہ کہیں مر ہی نہ جائے۔" رشید نے آہستہ سے اس کے کان کے قریب منہ کر کے کہا۔ ہانپتا ہوا انسپکٹر منیر رک گیا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں شیراز پر جمی ہوئی تھیں۔

"اسے......اسے ہوش میں لاؤ سعید......" اس نے بیلٹ کمر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیس سر......" چوتھا سپاہی جو اس کے پیچھے کھڑا تھا' سامنے چلا آیا۔

"اسے سونے مت دینا۔ اسے ہوش میں لاؤ اور جگاؤ۔ جب بھی سونے لگے۔ اس پر پانی ڈالو۔ ابھی آٹھ دن تک میں اس کا چالان عدالت میں پیش نہیں کروں گا۔ آٹھ دن تم لوگوں کے لیے بہت ہیں۔ اسے مارتے رہو۔ جگاتے رہے۔ کھانے کے لیے کم سے کم اور پینے کے لیے بالکل کچھ مت دو۔ سمجھے..... اگر میرے حکم کے خلاف کچھ ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" وہ گرجتا ہوا حوالات سے نکل گیا۔

حمید اور نذیر نے بے سدھ اور کراہتے ہوئے شیراز کو نفرت سے دیکھا اور آصف اور اکرم کے ساتھ وہ بھی باہر چلے آئے۔ سعید نے رشید کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر صاحب تو شاید پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ اب مزید مار برداشت نہ کر سکے گا۔ مر جائے گا۔"

"جس طرح بھی ممکن ہو اس حکم کی تعمیل کرتے رہو۔" رشید نے اس کی طرف دیکھا۔ "ورنہ انسپکٹر منیر نے جو کہا ہے۔ وہ اس سے زیادہ بُرا ثابت ہوگا۔"

"مگر یار......" سعید نے کہنا چاہا۔

"رشید ٹھیک کہہ رہا ہے۔" کرم داد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اپنی مرضی مت کرو۔ صرف حکم مانو۔"

"میں بھی یہی کہوں گا کہ حکم ضرور مانو مگر ہاتھ پیر بچا کر۔ اگر یہ واقعی مر گیا تو ہم بھی دھر لیے جائیں گے۔" یہ شفیق تھا جو بڑی گہری نظروں سے شیراز کے بے حد سُست سانس پر غور کر رہا تھا۔

"ویسے بھی ہم ان کے کارنامے میں برابر کے شریک ہیں۔" رشید نے کہا۔

"صرف دو دو ہزار لے کر؟" سعید نے طنز سے کہا۔

"ہاں....." کرم داد نے سر ہلایا۔ "اگر وہ دو دو ہزار بھی نہ دیتے تو ہم کیا کر لیتے۔ شکر کرو انہوں نے اتنے بھی دے دیے۔"

"ہم لوگ بھی کیسے پاپی ہیں۔" شفیق نے بیزاری سے کہا۔ "آٹے میں نمک سے بھی کم حرام کھاتے ہیں اور پہاڑ جیسے جرم میں ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونے بن جاتے ہیں۔"

"ایسے خیالات کو ذہن سے نکال دو شفیق۔ اگر انسپکٹر صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو اچھا نہ ہوگا۔" سعید نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"میں نے سنا ہے اس سے پہلے انسپکٹر منیر جس جگہ تعینات تھے وہاں انہوں نے ایک آدمی اور

اس کی بیوی کو برہنہ کر کے سارے گاؤں میں پھرایا تھا۔ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔"

"طاقتور کے آگے سب بونے ہوتے ہیں بھائی۔" رشید نے آہ بھر کر کہا۔ "یہ اگر ان دونوں کو جان سے بھی مار دیتے تو کیا ہوتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" کرم داد نے سر جھکا لیا۔

اسی وقت شیراز کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔

"پانی.....پا......نی......" وہ بے حد کمزور آواز میں کہہ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" رشید نے سعید کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر صاحب پانی دینے سے منع کر گئے ہیں۔" سعید نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے۔" رشید نے شانے اچکائے۔ "پھر سنتے رہو اس کی آواز اور دھیان مت دو۔"

"کان بند کر لو۔ اسے ہوش آئے تو صرف مارتے رہنے کا حکم ہے۔" سعید نے سینہ تان کر کہا۔

"مگر ذرا احتیاط سے، اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔" کرم داد نے باہر کا رخ کیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" شفیق نے اسے روکا۔

"رات کے بارہ بج رہے ہیں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔"

"میں بھی دو گھنٹے کی نیند لے لوں۔" رشید کرم داد کے ساتھ حوالات سے باہر نکل گیا۔

سعید اور شفیق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ کراہتے ہوئے شیراز کی طرف بڑھ گئے۔

"اے....." سعید نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"آ......ہ......آہ......آہ......" وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"ڈرامہ کرتا ہے سالا۔" رشید نے اس کے پیٹ میں گھونسہ رسید کیا۔

"آ......ہ......پانی......پا......نی......" شیراز تکلیف میں بھی اپنی پیاس کے احساس کو دبا نہ سکا۔

"ابھی پلاتے ہیں تجھے پانی۔" سعید نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ رسید کرتے ہوئے بے دردی سے کہا۔

"ظالم..... خدا کا خوف کرو......" اذیت سے شیراز کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"ظالم ہم نہیں۔ ظالم کوئی اور ہے الو کے پٹھے۔" سعید نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مارتے

ہوئے چیخ کر کہا۔ ''ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تجھے سونے نہ دیا جائے۔ پانی نہ دیا جائے۔ کھانا نہ دیا جائے۔ بس مارا جائے اور یہ حکم ماننا ہم پر فرض ہے۔ ورنہ یہاں تیری جگہ بندھے نظر آئیں گے۔''

شفیق نے بھی سعید کا ساتھ دیا۔ وہ دونوں اس پر وقفے وقفے سے اپنا زور آزماتے رہے۔ پانی کی ایک بوند بھی اس کے حلق میں نہ جانے دی گئی۔ سرد اور اندھیری رات اس سارے فسانہ ستم کو خاموشی سے سنتی رہی اور گونگوں کی طرح ویران آنکھوں سے بے رحمی کے نظاروں کو دیکھتی رہی۔ حمید، نذیر، آصف اور اکرم' انسپکٹر منیر سے رخصت ہوئے تو دور سے انہوں نے مار کھاتے' چیختے چلاتے' پانی کے گھونٹ کے لیے فریادیں کرتے' شیراز کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے بند دیکھا۔ پھر بڑی آسودہ چال چلتے چوکی سے باہر نکل گئے۔ انسپکٹر منیر نے ان کو چوکی کے گیٹ سے باہر جاتے دیکھا اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

''حرامزادے۔ فراڈیے۔ دلال کہیں کے۔ زیورات بھی گھر میں نقلی رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے چوہدری بنے پھرتے ہیں۔ کنگلے ......'' وہ غصے میں پھنکارتا ہوا پلٹا اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔



آٹھ دن شیراز نے جس عذاب میں گزارے وہ جانتا تھا یا اس کا خدا۔ انسپکٹر منیر نے حمید نذیر کے ساتھ مل کر اس پر تشدد کی انتہا کر دی۔

نویں دن ایک دم اس پر مشق ستم روک دی گئی۔

حوالات کے فرش پر پڑا وہ سسک رہا تھا کہ گاؤں کا ایک کمپاؤنڈر کرم داد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ کمپاؤنڈر نے اس کے زخموں پر ہلکی پھلکی ڈریسنگ کی۔ ایک انجکشن لگایا اور کرم داد کے ساتھ نکل گیا۔

وہ اس مہربانی پر دم بخود تھا کہ انسپکٹر منیر حوالات کی سلاخوں کے پاس آیا۔ ''جلدی ٹھیک ہو جا بھائی۔ تجھے عدالت میں لے کر جانا ہے۔ چالان تیار ہے تیرا۔'' وہ بڑے عجیب لہجے میں بولا۔

بڑی مشکل سے سر گھما کر شیراز نے اس کی طرف دیکھا اور غنودگی کے عالم میں ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔

''اوئے..... شفیق......'' انسپکٹر نے دور کھڑے سپاہی کو آواز دی۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آ گیا۔ ''اسے چائے پانی پلاؤ اور خبردار اگر اب کسی نے اسے ہاتھ لگایا تو...... اسے دو چار دن

میں ٹھیک کرو۔ اس کا چالان پیش کرنا ہے۔''

''یس سر......'' شفیق نے مستعدی سے کہا۔

بس...... اس دن کے بعد اسے پانی جیسی چائے' سوکھے سڑے رس اور دال چپاتی ملنے لگی۔ زخم بھرتے بھرتے دس بارہ دن لگ گئے۔

تقریباً دو ہفتے بعد جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا' تو اس کی حالت اتنی بُری نہ تھی کہ عدالت پولیس کے خلاف کوئی ایکشن لیتی۔ اسے اپنا وکیل کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس نے عدالت سے درخواست کی کہ اس کی اکیڈمی کے پرنسپل کو اس کے بارے میں اطلاع دی جائے۔ آدھ گھنٹے میں پرنسپل شیخ فیاض عدالت پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ دو پروفیسر بھی تھے۔

جب ان کو شیراز کی زبانی ساری صورت حال کا علم ہوا تو وہ دم بخود رہ گئے۔ ان کے ایک استاد کے ساتھ ایسا بھیانک سلوک......؟ مگر اس کا ثبوت کیا تھا کہ شیراز سچ کہہ رہا ہے۔ ہاں...... انسپکٹر منیر کے پاس شیراز کے خلاف سارے ثبوت موجود تھے۔ وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا اور عدالت کے برآمدے میں ان چاروں کی رام لیلا دیکھتا رہا۔

پرنسپل شیخ فیاض نے فوری طور پر ایک اچھے وکیل کا بندوبست کیا جس نے اگلی پیشی پر شیراز کی ضمانت کرا لینے کی یقین دہانی کرائی۔

انسپکٹر منیر اسے اپنی جیپ میں واپس گاؤں کی چوکی میں لے آیا۔ حمید اور نذیر اس کے بعد چوکی میں دکھائی دیئے' نہ آصف اور اکرم نے ادھر کا رخ کیا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس بار یہ مہربانی ضرور ہوئی کہ پرنسپل شیخ فیاض کے دیئے ہوئے روپوں سے وہ کچھ بہتر کھانے پینے لگ گیا اور اس پر تشدد کے نام پر ہاتھ بھی نہ اٹھایا گیا۔

پندرہ دن بعد اسے دوبارہ عدالت میں لے جایا گیا۔ اس پر فردِ جرم عائد کی گئی۔ اس کے وکیل نجم الدین نے اس کی طرف سے وکالت نامہ داخل کیا۔ اس نے ضمانت کی اپیل کی جو اس بنا پر خارج کر دی گئی کہ اس کے خلاف ثبوت بے حد ٹھوس تھے۔

اکیڈمی کے چند اساتذہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور پرنسپل شیخ فیاض بھی۔ شیخ فیاض نے اسے ایک بُری خبر سنائی کہ انتظامیہ نے اسے نوکری سے معطل کر دیا ہے۔ اس کا سامنے آنے والا کردار اکیڈمی کی بدنامی کا باعث بن رہا تھا اور سٹوڈنٹس پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

اس نے اپنی کار کے بارے میں شیخ فیاض کو بتایا جو گاؤں میں ڈیرے پر کھڑی تھی۔ اس میں اس کے ضروری کاغذات' کچھ رقم اور شہر والے مکان کی چابیاں تھی۔ مگر شیخ فیاض نے اسے بتایا کہ

ڈیرے پر اس کی کار موجود نہیں تھی۔ انسپکٹر منیر نے بھی اس سے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کار غائب کر دی گئی ہے۔ شاید اس کے بھائیوں اور پولیس نے مل بانٹ کر اسے بھی ہضم کر لیا تھا۔

شیراز نے اپنے وکیل نجم الدین کو گھر کا پتہ دیا اور تالا کھلوا کر چیک بک وغیرہ نکال لانے کو کہا۔ انسپکٹر منیر نے نجانے کیا سوچ کر عدالت کے برآمدے میں اس کے ساتھ ایک گھنٹہ رکنے پر ہامی بھر لی۔ نجم الدین اپنی گاڑی پر گیا اور پون گھنٹے میں ہانپتا کانپتا لوٹ آیا۔ شیراز نے پچاس ہزار کا چیک کاٹ کر اس کے حوالے کیا۔ چیک بک بھی نجم الدین کے پاس چھوڑی اور انسپکٹر منیر کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اسے کیس کے فیصلے تک رہنا تھا۔

انسپکٹر منیر نے ایف۔ آئی۔ آر اس قدر مضبوط لکھی تھی کہ شیراز کا وکیل کچھ کر ہی نہ سکا۔ اس کی ہر دلیل کے جواب میں حمید موجود تھا۔ نذیر کا بیان سامنے آ جاتا۔ شریفاں اور ثریا کی دروغ گوئی نے سچ کا روپ دھار لیا۔ اکرم اور آصف کی گواہیاں بے حد ٹھوس تھیں۔ نور دین کا قتل اس کے گلے پڑ گیا۔ ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشان پھانسی کے پھندے سے جا ملتے اگر نجم الدین کی کوشش اور اس کی قسمت زور نہ مار جاتی...... اسے چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی۔

سنٹرل جیل کے گیٹ پر افسردہ شیخ فیاض نے اسے بیرونی دنیا کی جو آخری خبر سنائی وہ یہ تھی کہ اس کی نوکری ختم کر دی گئی ہے۔

اس نے بڑے تحمل سے سنا۔ شیخ فیاض کا شکریہ ادا کیا۔ آسمان کی طرف بڑی اداس نظروں سے دیکھا اور ایک آہ بھر کر سنٹرل جیل کے دروازے میں داخل ہونے کے لیے سر جھکا دیا۔





جیل میں اسے جس بیرک میں رکھا گیا اس میں پہلے سے تین افراد موجود تھے۔ شاید پڑھا لکھا ہونے کے سبب اس سے یہ رعایت کی گئی کہ اسے کم افراد کے ساتھ جگہ ملی ورنہ تو وہاں ایک ایک بیرک میں دس دس بارہ بارہ لوگ ٹھونسے گئے تھے۔

ان تین افراد میں سے ایک کا نام استاد رؤف تھا۔ چھوٹی چھوٹی مگر گھنی داڑھی، سر کے بال لمبے، بڑی بڑی مونچھیں، گٹھا ہوا بدن اور اچھے قد کاٹھ کا استاد رؤف جب اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مدمقابل کو گھور کر دیکھتا تو خوف کی ایک لہر سارے بدن میں دوڑا کر رکھ دیتا۔ اس کی آواز ایسی پاٹ دار اور گونجیلی تھی کہ سننے والے کو اپنے بہرا ہونے کا گمان ہونے لگتا۔ ویسے وہ بولتا بہت کم تھا۔ سارا وقت باقی کے دو افراد امتیاز اور ظہور اس کی مٹھی چاپی کرتے رہتے یا وہ آنکھیں موندے اپنی چٹائی پر کسی خونخوار مگرمچھ کی طرح پڑا رہتا۔ امتیاز اور ظہور اس کے چیلے نہیں تھے۔ مگر وہ اس کے دبدبے اور رعب کے مارے اس کے ایسے مرید ہوئے کہ اب وہ استاد استاد کرتے نہ تھکتے تھے۔

استاد رؤف نے جب پہلے دن شیراز کو کمبل اور تکیہ بغل میں دبائے بیرک میں داخل ہوتے دیکھا تو چند لمحوں تک اسے اپنی لہو رنگ آنکھوں سے گھورتا رہ گیا۔ شیراز نے خاموشی سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھر ایک خالی کونے کی طرف بڑھ گیا۔ تکیہ دیوار کے ساتھ رکھا۔ اس سے ٹیک لگائی اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

استاد رؤف نے اس کے اس طرح لیے دیے رہنے پر امتیاز اور ظہور کی طرف دیکھا۔

''نیا ہے استاد......'' ظہور نے سرگوشی کی۔ ''بالکل نیا!''

''اناڑی بھی لگتا ہے شکل ہی سے۔'' امتیاز نے رائے دی اور استاد کے شانے پر ہاتھوں کا دباؤ برابر کرنے لگا۔

استاد نے ان کی باتوں پر کوئی رائے نہ دی اور خاموشی سے بڑی گہری نظروں کے ساتھ شیراز کو دیکھتا رہا۔

دو دن گزر گئے۔ ان تینوں نے شیراز سے کوئی بات نہ کی۔ استاد نے ان دونوں کو سختی سے منع کر دیا کہ جب تک وہ نہ کہے وہ اس نئے قیدی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ وہ تو حکم کے بندے تھے۔ آنکھیں بند کر کے حکم مان لیا۔

تیسرے دن سنتری نے آ کر بیرک کے دروازے کا تالا کھولا۔

"چل بھئی ماسٹر..... تیری ملاقات آئی ہے۔"

"میری.....؟" حیرت سے شیراز چونکا۔

"ہاں ہاں...... تیری...... اور کیا میری آئے گی۔"

"کون ہے؟" شیراز نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب جا کر دیکھ لینا۔ میں کیا تیرا سیکرٹری ہوں' جو ساری تفصیل مجھ سے پوچھے گا۔" سنتری نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے بدزبانی کا ہتھیار آزمایا۔ خاموشی سے شیراز یہ سوچتا ہوا سلاخوں والے دروازے سے باہر نکلا کہ شاید اس کے بھائی' یا بھتیجوں میں کوئی آیا ہو۔ "شاید......" اس کے ذہن میں یہ لفظ امید بن کر جگمگا اٹھا۔

"ماسٹر......" اسے سنتری کے ساتھ جاتا دیکھ کر استاد بڑبڑایا۔ امتیاز اور ظہور نے بھی حیرت سے آنکھیں پٹ بنائیں۔ "تو یہ پڑھا لکھا یونہی نہیں لگتا تھا مجھے......" استاد نے پھر بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہا۔

"استاد......" امتیاز بولا۔ "اس نے قتل بھی کیا ہے اور ڈکیتی بھی۔"

"غلط......" استاد نے ہاتھ اٹھا کر اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ "یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میری یہ آنکھیں مرچیں پڑ جانے سے سرخ نہیں ہوئیں امتیاز...... یہ شخص نہ قتل کر سکتا ہے نہ ڈکیتی...... معاملہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا استاد؟"

"اب یہ میں کیا جانوں؟" استاد ظہور پر الٹ پڑا۔ "میں کیا نجومی ہوں۔ البتہ یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص نہ قاتل ہے نہ چور ڈکیت۔"

اس کی بلند آواز نے ظہور اور امتیاز کی سٹی گم کر دی۔ وہ استاد کے لمبے ہاتھوں اور پہنچ سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کی پراسرار شخصیت نے ان دونوں کو یونہی خوفزدہ نہیں کر رکھا تھا۔ وہ جب چاہتا رات کو

غائب ہو جاتا تھا اور جب چاہتا لوٹ آتا تھا۔ سنتری ان کا سپرنٹنڈنٹ سے زیادہ احترام کرتے تھے اور سپرنٹنڈنٹ اس کے آگے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ نجانے کیا وجہ تھی کہ وہ جیل میں پڑا تھا ورنہ امتیاز اور ظہور کے خیال میں تو وہ جب چاہتا جیل سے باہر جا سکتا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔



سنتری کے پیچھے مختلف خیالوں کے بھنور میں غوطے کھاتا شیراز چلتا رہا۔ اسے رہ رہ کر اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کی وہ طنزیہ نظریں یاد آ رہی تھیں جن سے انہوں نے اسے اس وقت خاص طور پر دیکھا تھا جب عدالت میں اسے چودہ سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان سب کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس کو جیل میں بھیج کر انہوں نے زندگی بھر کا سکھ خرید لیا ہو۔

عدالت کے فیصلے پر نجم الدین نے احتجاج کیا مگر جج فیصلہ لکھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

انسپکٹر منیر نے اسے ساتھ لیا اور حمید' نذیر' آصف اور اکرم کے آگے آگے اسے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنی جیپ تک لے آیا۔

"لو بھئی چوہدری حمید..... اب تم جا کر لمبی تانو اور سو جاؤ۔ میں اسے سرکاری مہمان خانے والوں کے حوالے کر کے شام تک گاؤں پہنچوں گا۔" انسپکٹر نے ان چاروں سے باری باری ہاتھ ملایا اور اسے جیپ کے پچھلے حصے میں سوار کرا کے چل پڑا۔

وہ بڑی دور تک تینوں باپ بیٹوں اور چوتھے نذیر کو بڑھکیں مارتے' قہقہے لگاتے اور رقص کرتے دیکھتا رہا۔

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ مگر...... دل میں ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی' جس پر بے بسی کا احساس مسلسل تیل ڈال رہا تھا۔ اس کے زخموں پر بیگناہی کا خیال نمک چھڑک رہا تھا۔ وہ دانت بھینچے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست کر کے خاموش بیٹھا رہا' جیسے ذرا بھی حرکت کی تو ترخ جائے گا۔

اس کی جیپ کے پیچھے شیخ فیاض اپنی گاڑی میں دو پروفیسروں کے ساتھ آ رہا تھا۔ جیل کے دروازے پر اسے اداس اور نم آلود آنکھوں سے رخصت کر کے وہ چلے گئے اور شیراز نے ایک انجانی دنیا کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھ دیا۔

"لے بھئی ماسٹر..... وہ ہے تیرا ملاقاتی۔" سنتری نے اسے جالی لگے حصے کے قریب لا کر چھوڑ دیا۔

وہ چونک پڑا۔ خیالوں کا تانا بانا بکھر گیا۔

اس کے سامنے جالی کے پار نجم الدین...... اس کا وکیل کھڑا تھا۔

''السلام علیکم شیراز صاحب۔'' نجم الدین نے خوش اخلاقی سے کہا۔ اس کی بغل میں ایک دو فائلیں تھیں۔ درمیان میں سوراخ دار جالی ہونے کے باعث وہ ہاتھ نہ ملا سکے۔ شیراز پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''ہیلو نجم صاحب...... '' وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بے حد قریب کھڑے تھے۔

''کوئی تکلیف تو نہیں یہاں آپ کو۔'' نجم الدین نے پوچھا اور پھر خود ہی جھینپ گیا۔

''معاف کیجئے گا۔ میں نے کیا احمقانہ سوال کر دیا۔ ظاہر ہے' جیل کوئی آرام کی جگہ تو ہے نہیں ۔''

''نہیں نجم صاحب...... '' شیراز نے دھیرے سے کہا۔ ''ابھی تک مجھے یہاں واقعی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بس...... وقت نہیں کٹتا۔''

''کچھ دیر تو لگے گی شیراز صاحب اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے۔'' نجم الدین کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''چھوڑیے۔ آپ کہئے کیسے تشریف لائے؟'' شیراز نے سر جھٹک کر کہا۔

''ایک تو آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ کیا آپ اگلی عدالت میں اپیل کرنا چاہیں گے؟ اگر آپ رضامند ہوں تو میں سزا کے خلاف...... ''

''دوسری بات...... '' شیراز نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''دوسری بات یہ ہے شیراز صاحب...... '' نجم الدین نے اس کا ایک دو پل تک گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا' مگر باریک بینی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ شیراز اپیل کے لیے راضی نہیں۔ پھر اس نے صاف لہجے میں کہا۔ ''آپ کا مکان خالی پڑا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے کرائے پر چڑھا دوں۔''

''اگر آپ میرے اٹارنی بننے کو تیار ہوں تو نجم صاحب...... تو جو بہتر سمجھئے وہ کیجئے۔ میں اندر رہ کر کسی بھی معاملے میں بے بس ہوں۔''

''آپ مجھ پر اعتماد کر سکیں گے؟'' نجم الدین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہ بھی کروں تو کیا ہو گا؟ سگوں نے جو گل کھلایا وہ آپ کے علم میں ہے۔ آپ کوئی چوٹ دیں گے تو میں اُف نہیں کروں گا۔''

''نہیں شیراز صاحب۔ میں ایک شریف اور خاندانی آدمی ہوں۔'' نجم الدین نے جلدی سے کہا۔

''میرے بھائی بھی بڑی اچھی نسل سے ہیں نجم صاحب۔ بہرحال یہ بڑی کڑوی بحث ہے۔ آپ شوق سے میرا مکان کرائے پر چڑھا دیں۔ میرا سارا سامان اوپر کے پورشن میں بند کر دیں۔ باقی کرائے داروں کے استعمال میں دے دیں۔''

''تیسری بات...... '' نجم نے جیب سے چیک بک نکالی۔ ''یہ آپ کی چیک بک ہے۔ بینک میں آپ کا بارہ لاکھ چونتیس ہزار نو سو روپیہ پڑا ہے۔ میں ماہانہ کرائے کی رقم بھی آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا رہوں گا۔ آپ نے مجھے پچاس ہزار کا چیک دیا تھا۔ اس میں سے چالیس ہزار میری فیس کے تھے۔ باقی دس ہزار میں سے آپ کے یہاں تک آنے کے دوران سات ہزار دو سو تیس روپے خرچ ہوئے۔ دو ہزار سات سو ستر روپے لایا ہوں۔ رکھ لیجئے۔ یہاں آپ کو اکثر ضرورت رہے گی۔'' اس نے نوٹوں کی گول مول بتی سی بنا کر جالی کے سوراخ سے اس تک پہنچا دی۔ ''اور دھیان رکھئے گا کہ ان سنتریوں' پہریداروں اور وارڈن کو آپ کے ان روپوں کی بھنک نہ ملے' ورنہ آپ کی جیب خالی ہونے میں دیر نہ لگے گی۔''

سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے خاموشی سے شیراز نے نوٹ تھام کر بڑی راز داری سے پاجامے کی جیب میں ڈال لیے۔

''آپ مجھ سے چیک سائن کرا لیجئے۔ آپ کی فیس...... ''

''آپ کا ماہانہ کرایہ اتنا ہو گا شیراز صاحب کہ میں اپنی فیس رکھ کر باقی کے پیسے بنک میں جمع کرا سکوں' فکر مت کریں۔ آپ کی چیک بک میرے پاس امانت ہے۔ انشاء اللہ جب آپ باہر آئیں گے تو آپ کی ہر شے آپ کے حوالے کرنے میں مجھے آپ متردد نہ پائیں گے۔''

''میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں نجم صاحب۔'' متاثر ہو جانے والے انداز میں شیراز نے کہا۔ ''آپ میرے لیے اس قدر PAIN لے رہے ہیں۔''

''نہیں شیراز صاحب۔ آپ کے لیے نہیں۔ میں اپنی شرمندگی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کے کیس میں' میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اصل میں ہمارے ملک میں جو قانون رائج ہے۔ اس میں ایف۔ آئی۔ آر وہ بنیاد ہوتی ہے جس پر عدالت کے فیصلے کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ انسپکٹر منیر نے ایف۔ آئی۔ آر میں اس قدر مہارت سے کام لیا تھا کہ میں اس میں کوئی رخنہ پیدا ہی نہیں کر سکا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ناکام رہا...... ایک بے گناہ کو نہ بچا سکنے کا ذلت آمیز

احساس مجھے راتوں کو بے چین کر دیتا ہے۔ میں اس کیفیت کو آپ کے کام آ کر ختم نہ بھی کر سکوں تو کم ضرور کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی نہیں اپنی مدد کر رہا ہوں شیراز صاحب۔'' نجم الدین نے بڑی طویل بات کی۔

''مجھ سے دوستی کریں گے نجم صاحب۔'' شیراز نے اچانک دونوں ہاتھ کھول کر جالی پر رکھ دیئے۔

''شیراز صاحب۔'' نجم نے اس کی طرف بڑے جذباتی انداز میں دیکھا۔

''میں نے زندگی میں کوئی دوست نہیں بنایا۔ اکیلا ہی زندگی گزارتا رہا۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ آج اگر میرا کوئی دوست ہوتا تو آپ سے کم نہ سوچتا میرے لیے...... بولیے...... مجھ سے دوستی کریں گے؟''

''ضرور کروں گا شیراز صاحب۔'' نجم نے بے اختیار ہاتھ کھولے اور اس کی ہتھیلیوں سے ہتھیلیاں ملا دیں۔ فائلیں اور چیک بک زمین پر گر پڑیں' مگر وہ دونوں اردگرد سے بے خبر لوہے کی تاروں کے اِدھر اُدھر موجود اپنے ہاتھوں کی گرمی سے ایک دوسرے کی دوستی پر صداقت کی مہریں لگا رہے تھے۔ شیراز نے محسوس کیا اس کی آنکھوں میں ایک دم ڈھیر سارا پانی بھر آیا ہے..... مگر نہیں ...... یہ پانی صرف اسی کی آنکھوں میں نہیں' نجم الدین کی آنکھوں میں بھی تھا۔

''قید کے یہ سال اب میرے لیے گزارنا آسان ہو جائیں گے نجم۔ میرے دوست۔ اب مجھے یہ خیال نہ ستائے گا کہ جیل سے باہر میرا کوئی نہیں ہے۔''

''باہر کیوں شیراز...... '' نجم نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔'' میں تمہیں جیل کے اندر بھی تنہا نہ رہنے دوں گا۔ میں تم سے بہت جلدی جلدی ملنے آیا کروں گا۔''

''ضرور آنا نجم..... اب مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔'' شیراز نے کہا۔ پھر وہ ایک دم پلٹا اور تقریباً بھاگتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

نجم نے زور سے آنکھیں بھینچ لی۔

دوستی کا یہ انمول انداز اسے عجیب سا سکون دے گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر آنکھیں خشک کیں۔ زمین پر گری فائلیں اور چیک بک اٹھا اور ملاقات کے لیے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کی حیرت بھری نظروں سے مڈبھیڑ کیے بغیر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔



شیراز جب سے آیا تھا مسلسل سسک رہا تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے روئے جا رہا تھا۔ پچھلے دس ماہ کی ساری بھڑاس آج نکل رہی تھی۔ اسے ں اپنے کے ہونے کے احساس نے بے کل کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا دیواروں سے لپٹ کر ے۔ فرش پر گر کر روئے۔ کسی کے شانے پر سر رکھ کر روئے...... مگر...... یہاں کون اس کا ایسا وار تھا جس کے شانے پر وہ آنسو بہا سکتا۔

''بس کرو ماسٹر..... '' اچانک ایک مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پر آ جما۔'' اتنا مت روؤ کہ ا تا رؤف تمہیں سینے سے لگا کر خود بھی رو پڑے۔''

ہچکیاں لیتے ہوئے شیراز نے سر اٹھایا اور استاد کے مضبوط ہاتھوں میں مچل گیا۔ استاد نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے گرم سینے سے لگ کر شیراز جو بلکا تو پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو گیا۔ امتیاز اور ظہور اس کے پاس کھڑے ہونقوں کی طرح کبھی ایک دوسرے کی طرف اور کبھی ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

بہت دیر بعد چڑھی ہوئی ندی اتری۔

استاد نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے شیراز کے آنسو پونچھے۔ اسے ساتھ لیا اور اپنی چٹائی پر آ گیا۔

''اوئے ظہورے...... سنتری سے کہہ...... گرما گرم چائے کا بندوبست کرے۔'' استاد نے تحکم سے کہا۔

''جی استاد..... '' ظہور سلاخوں کی طرف لپکا۔ پھر اس نے سلاخوں پر ماتھا ٹکا کر دائیں بائیں دیکھا۔ سنتری ذرا پرے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

''سنتری بادشاہ۔'' ظہور نے اسے آواز دی۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔ ''استاد نے کہا ہے چار کپ چائے فوراً پیدا کرو۔''

''اچھا ظہور بادشاہ۔'' سنتری نے سر ہلایا اور اس کے ہاتھ سے پچاس کا نوٹ سنتری کے ہاتھ میں سرک گیا۔ سنتری کے جاتے ہی ظہور واپس لوٹ آیا۔ شیراز اب دیوار سے ٹیک لگائے خاموش اور کسی سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ اس کی متورم اور سرخی آلود آنکھیں فرش پر جمی تھیں۔

دس منٹ بعد سنتری نے سلاخوں سے ہاتھ اندر کر کے چائے کی چینک اور چار کپ امتیاز کو تھما دیئے۔ یہ سارا عرصہ بالکل خاموشی میں گزرا۔ امتیاز نے چائے کا کپ سب کے سامنے رکھا اور اپنی چائے لے کر پرے ہو گیا۔ ظہور بھی اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔

''لو ماسٹر..... چائے پیو۔'' استاد نے چائے کا کپ اس کے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔

شیراز نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر کپ تھام لیا۔ چائے خاموشی گئی۔ چائے کے گرم گرم محلول نے شیراز کے اندر بھڑکتی آگ کو شانت کر دیا۔ خالی کپ زمین رکھنے کے بعد اس نے پھر دیوار سے ٹیک لگا لی اور نظریں استاد کی طرف اٹھائیں' جو اس کے سامنے بیٹھا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"کچھ سکون ہوا؟" استاد نے نرمی سے پوچھا۔

شیراز محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"کون ملنے آیا تھا؟"

"میرا وکیل..... نجم الدین۔" دھیرے سے شیراز نے جواب دیا۔

"کیا کہہ گیا تم سے کہ تم بادل کی طرح کھل کر برس پڑے۔" استاد نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔

"کچھ نہیں..... " شیراز پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔"ایک رشتہ جوڑ گیا ہے مجھ سے..... بر..... وہی برداشت نہ ہو پایا۔"

"دوستی کا رشتہ..... " بے اختیار استاد کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں..... " شیراز نے کہا اور حیرت سے استاد کو تکنے لگا۔"مگر..... آپ کو کیسے معلوم؟"

"آپ نہیں..... تم..... تم کہو۔" استاد نے تیزی سے کہا۔"میں اتنا تو جانتا ہوں تم ماسٹر ہو۔ درس دیتے رہے ہو بچوں کو۔ اچھائی کا۔ نیکی کا۔ پر مجھ جیسے استاد کو آپ کہہ کر اپنا رتبہ کیوں کم کرتے ہو۔ تم کہو مجھے تم..... " استاد نے اسے جیسے حکم دیا۔

"تم..... چلو تم ہی سہی۔" شیراز نے ہنس کر کہا۔"تو تمہیں کیسے معلوم ہوا استاد کہ دوستی کا رشتہ..... "

"صرف دوستی کا رشتہ وہ کندھا فراہم کرتا ہے ماسٹر جس پر سر رکھ کر انسان رو بھی لیتا ہے۔ لٹ بھی جاتا ہے۔"

شیراز اس کی گہری بات پر پاگل سا ہو گیا۔

"مگر استاد..... یہ دوستی اتنی کم کم کیوں ہے؟ میں نے زندگی میں پہلا دوست بنایا ہے اور اسی کو سمجھ نہیں پا رہا۔"

"مشک ہر ہرن کے ناف میں نہیں ہوتی ماسٹر۔ ایسے ہی بڑی کمیاب ہوتی ہے یہ دوستی بھی۔" استاد نے مسکرا کر کہا۔"تم تو مجھ سے زیادہ جانتے ہو گے ان باتوں کو۔"

"ہاں..... مگر تجربہ بالکل نہیں ہے میرا۔" شیراز آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

"تم پر قتل اور ڈکیتی کا الزام ہے؟"

"مگر میں نے نہ قتل کیا نہ ڈکیتی۔" شیراز نے اس کی بات اچک لی۔

"میں نے الزام کہا ہے ماسٹر اور الزام تو اکثر غلط ہوتے ہیں۔ بہتان بے گناہوں پر ہی لگتے ہیں۔" استاد نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

"مگر عدالت کو کون سمجھا سکتا ہے یہ بات۔" شیراز نے سر جھٹک کر کہا۔

"کوئی نہیں۔" استاد نے ہاتھ کو دائیں بائیں حرکت دی۔"وہ تو ایف۔ آئی۔ آر اور ثبوت کے دائرے میں گھومتی ہے اور بس..... تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا ہو گا۔"

"ہاں..... " شیراز کا لہجہ شکستہ ہو گیا۔

"کون تھے مقابلے پر؟"

"سگے بھائی۔ سگی بھابیاں۔ سگے بھتیجے۔" شیراز کا لہجہ کڑواہٹ سے بھر گیا۔

"تھانیدار کو خرید لیا ہو گا انہوں نے۔"

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں پھنستا کیسے؟"

"یہ چوٹوں کے نشان ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے۔" استاد نے اس کے ماتھے کی جانب اشارہ کیا۔

"جو زخم دل پر آئے ہیں استاد۔ وہ نہیں بھر پائیں گے کبھی۔"

"ان کو بھرنے بھی مت دینا۔ جب ذرا انگور آ جائے' فوراً ان کو کھرچ دینا۔ کبھی ان چوٹوں کو آرام نہ آنے دینا ماسٹر ورنہ بے غیرت ہو جاؤ گے۔" استاد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" شیراز سیدھا ہو بیٹھا۔

"جب انسان کے اندر جلتی انتقام کی آگ بجھ جائے۔ جب وہ صبر شکر کر کے ظلم کے آگے سر جھکا دے۔ جب وہ اپنی بے عزتی کو بھول کر توہین کا مطلب سمجھنے سے دامن بچانے لگے تو وہ بے غیرت ہو جاتا ہے ماسٹر۔ کبھی ان کو معاف کرنے کے خیال سے اپنے سینے کے آتش کدے کو سرد نہ ہونے دینا جنہوں نے تمہیں یہاں پہنچایا ہے۔ کبھی اپنی نامردی کو صبر کا نام دے کر اللہ کے مجرم نہ بننا۔ انا کے خون کو انتقام کی نماز کے لیے وضو کے طور پر سنبھال رکھو۔ یہ دو رکعت تمہیں پڑھ کر ہی سکون ملے گا۔ ورنہ تو تم قبر میں بھی کروٹیں ہی بدلتے رہو گے۔" استاد نے کہا اور آنکھیں بند کر کے سر چھت کی طرف اٹھا دیا۔

"اللہ......" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور سانس روک لیا۔ پھر کتنی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ شیراز نے دیکھا ان کی سرخی اور گہری ہو گئی تھی اور ان کی چمک میں خاطر خواہ اضافہ۔

"میری باتوں کا بُرا ماننا نہ دل پر لینا ماسٹر......" استاد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں سیدھا آدمی نہیں ہوں کھرا ضرور ہوں۔ جو کہتا ہوں صاف صاف اور دل میں اتارنے کے لیے کہتا ہوں۔"

"میں نے تمہاری ہر بات دل میں اتار لی ہے استاد۔" شیراز نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "مگر میں چودہ سال کی سزا کاٹنے آیا ہوں۔"

"بس......" استاد نے لاپرواہی سے کہا۔ "اتنی سی بات۔ ارے ماسٹر تم جب بھی اپنے رب کے آگے سر جھکاؤ، جب بھی اس کے آگے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ، تو ایک ہی دعا کرو کہ تمہارے دشمنوں کو خدا زندگی دے۔ لمبی زندگی دے۔ اتنی زندگی ضرور دے کہ جب تم جیل سے باہر جاؤ تو وہ زندہ ہوں کہ تم انہیں مار سکو۔ موجود ہوں کہ تم انہیں نیست و نابود کر سکو۔"

"میں چودہ سال تک انتظار کے کٹہرے میں کھڑا نہیں رہ سکتا استاد۔" شیراز نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "یہاں......" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "یہاں جو آگ جل رہی ہے ناں وہ چودہ سال سے پہلے ہی مجھے راکھ کر دے گی۔"

"پگلے ہو ماسٹر......" استاد ہنسا۔ "آگ بھی کبھی آگ کو جلاتی ہے۔ وہ تو آگ میں مل کر طاقت بڑھا دیتی ہے۔ اپنی بھی اور دوسری آگ کی بھی۔ جلتے وہ ہیں جن کے ضمیر میں جرم، گناہ اور ناانصافی کی خشک پرالی ہوتی ہے۔ تم تو اس آگ سے انتظار کا غسل کرتے رہو تر و تازہ رہو گے۔"

"نہیں استاد نہیں۔" شیراز بے چین ہو گیا۔ "میں کتنا بھی خود کو سمجھا لوں انتظار میرے لیے بہت عذاب ناک ہے۔"

"اچھا۔" استاد نے اس پر کڑی نظر ڈالی۔ "اس کا حل بھی تلاش کر لیں گے۔ پہلے تم ایک کام کرو۔"

"کیا استاد؟" شیراز نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے اپنی رام لیلا سناؤ۔ میں بھی تو دیکھوں تم کس خارزار سے گزر کر آئے ہو کہ تمہارے آبلے پھوٹے جا رہے ہیں۔"

"لمبی بات نہیں ہے استاد۔ چند فقروں کی کہانی ہے۔"

"مجھے فقروں ہی میں سناؤ مگر پوری تفصیل سے۔ ایک ایک اذیت کا لمحہ یوں بتاؤ مجھے جیسے

کوئی استاد اپنے شاگردوں کو شعر کی تشریح کر کے سمجھاتا ہے۔ سمجھ لو تمہاری داستان ایک غزل ہے اور تم مجھے اس کے ہر ہر لفظ کی، ہر ہر مصرعے کی، ہر ہر شعر کی تشریح کر کے بتا رہے ہو، چلو...... شروع ہو جاؤ۔"

اور......" شیراز نے اپنے باپ چوہدری شجاع کے مرنے سے بات کی ابتدا کر دی۔



شام اتر آئی تھی، جب شیراز نے اپنی داستان سنٹرل جیل میں نجم الدین سے ملاقات پر ختم کی۔ اس سارے عرصے میں امتیاز اور ظہور تو خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ استاد یوں جھومتا رہا جیسے اسے وجد آ رہا ہو۔ انسپکٹر منیر اور اس کے سپاہیوں کے تشدد کا حال سن کر تو اس نے "اللہ...... ......" کے دو چار نعرے بھی لگا دیے تھے۔

"بہت سخت جان ہے ماسٹر تو۔" استاد نے اس کی بات ختم ہونے پر اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کا کھردرا، ہتھوڑے جیسا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ شیراز کے سینے میں درد کی ایک لہر پیدا کر گیا جسے وہ ضبط کر کے پی گیا۔

"سخت جان تو پتہ نہیں میں ہوں یا نہیں استاد۔ ڈھیٹ ضرور ہوں جو اتنی مار کھا کر بھی زندہ بچ گیا۔"

"وہ تجھے اس سے بھی زیادہ مارتے تب بھی تو نہ مرتا۔" استاد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ "جانتا ہے کیوں؟"

"کیوں استاد؟"

"اس لیے کہ ابھی اوپر سے تیرا بلاوا نہیں آیا۔" استاد نے شہادت کی انگلی چھت کی طرف کھڑی کر دی۔ "اور جب بلاوا آ جاتا ہے ناں...... تب چیونٹی کاٹ لے تو ہاتھی مر جاتا ہے۔"

"وہ تو ہے استاد۔" شیراز کے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

"تیری کہانی میں بڑی جان ہے ماسٹر...... مگر میرا ایک مشورہ ہے اگر تو مان لے تو......"

"کیا استاد؟" شیراز نے اس کی جانب دیکھا۔

"تھوڑا سا انتظار کر۔ دیکھ...... تیرے سگے باہر خاموش بیٹھتے ہیں یا پھر بھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"مطلب؟" شیراز نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"ان کے خیال میں تجھے موت کی سزا ہونی چاہیے تھی جو نہیں ہوئی۔ آگے تو اپیل نہیں کر رہا

اور یہ تو نے اچھا نہ کیا۔ اب وہ تیرے باہر آنے کا انتظار کریں گے یا کچھ اور...... اس بات کا پتہ چاہئے۔"

"میں سمجھا نہیں استاد۔" شیراز الجھ سا گیا۔

"تو اندر سے صاف ہے ناں۔ باہر کا میل کچیل بھی تجھے جلدی دکھائی نہیں دیتا۔" استادنا انداز میں بولا۔ "دیکھ...... اگر تو سزائے موت کے حوالے ہو جاتا تو ان کی مرادیں بر آتیں۔ ان راستے کا کانٹا ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتا۔ اب وہ تو یہ اپیل کر نہیں سکتے کہ تجھے ضرور ہی پھانسی جائے البتہ تو سزا کے خلاف اپیل کر سکتا تھا جو تو نے نہیں کی۔ یہ ان کے لیے اچھا نہیں ہوا۔ اب کے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ تجھے یہاں سے باہر ہی نہ جانے دیں۔ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ تجھے باہر جاتے ہی اڑا دیں۔ اس کے لیے وہ پلاننگ کر رہے ہوں گے۔ چودہ سال عرصہ بہت طویل ہوتا ہے مگر اس سارے عرصے میں ان کی نیندیں خراب ہوتی رہیں گی۔ وہ ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہیں گے کہ تو رہا ہو کر باہر آتے ہی ان پر ٹوٹ پڑے گا۔ اس کا بندوبست وہ یہ کر سکتے ہیں کہ تجھے اندر ہی سڑتا رہنے پر مجبور کر دیں۔ تجھے یہاں جان کا خطرہ نہیں ہے مگر پولیس کے ساتھ مل کر وہ تجھے ایسی صورت حال کا شکار ضرور کرا سکتے ہیں جو تیری سزا میں اضافے کا باعث جائے اور تو مسلسل جیل کا مہمان بن کر رہ جائے۔"

"وہ کیسے؟" شیراز بُری طرح چونکا۔

"کسی قیدی سے تیرا جھگڑا کرا کے۔ کسی غیر قانونی حرکت میں تجھے ملوث کرا کے۔ سو طریقے ہوتے ہیں کسی کو عذاب دینے کے۔"

"مگر اب تو انہیں میرا پیچھا چھوڑ دینا چاہئے استاد...... جو وہ میرے ساتھ کر چکے ہیں اس سے زیادہ بُرا کیا کریں گے۔" شیراز نے افسردگی سے کہا۔

"اگر وہ تیرا پیچھا چھوڑ دیں تو بہت بے وقوف ہوں گے۔" استاد نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سانپ کو زخمی کر کے چھوڑ دیا جائے تو اسے چیونٹی مار ڈالتی ہے مگر زخمی شیر پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ تو سانپ اس لیے نہیں ہے کہ تجھے ڈسنا نہیں آتا۔ چیتا ہو سکتا ہے۔ شیر ہو سکتا ہے کہ دھاڑنا جانتا ہے۔ للکارنا جانتا ہے۔ وہ تجھ سے خوفزدہ ہیں۔ انہیں خوفزدہ ہونا چاہئے کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں تو کب اور کس وقت یہاں سے باہر چلا جائے۔"

"معلوم کیوں نہیں استاد۔ چودہ سال کا تو وہ ایک ایک دن گن چکے ہوں گے۔" شیراز نے پھیکے سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"نہیں...... میں چودہ سال کی بات نہیں کر رہا۔" استاد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ یں۔ "میں تو آج کل کی بات کر رہا ہوں۔"

"آج کل...... وہ کیسے استاد؟" شیراز بہت بری طرح چونکا۔

"بتاؤں گا...... بتاؤں گا۔ تیرا زخم ایسا نہیں کہ جس پر چودہ سال کا مرہم رکھا جائے۔ اس پر تو ری ڈریسنگ کرنا ہوگی مگر...... پہلے تو میری چند باتوں کا جواب دے۔"

"پوچھو استاد؟" شیراز کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"تو اپنے سگوں سے کیسا انتقام لینا چاہتا ہے؟"

"کیسا...... کیا مطلب استاد؟ انتقام تو انتقام ہوتا ہے؟"

"نہیں...... تو میرا مطلب نہیں سمجھا۔" استاد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر امتیاز اور ظہور کی طرف یکھا جو پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔ دوبارہ شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے استاد بولا تو اس کی واز میں عجیب سا گھمبیر پن اتر آیا۔

"دیکھ ماسٹر...... ایک انتقام تو سب سے بڑا ہوتا ہے۔ تو بہت پڑھا لکھا ہے مجھ سے زیادہ جانتا ہے پھر بھی بتانا پڑے گا کہ سب سے بڑا انتقام ہوتا ہے دشمن کو معاف کر دینا۔"

"نہیں استاد ہرگز نہیں......" شیراز تڑپ اٹھا۔ "میں عیسیٰ ہوں نہ ارسطو کہ ایک تھپڑ کھا کر سرا گال آگے کر دوں یا زہر کا پیالہ پی کر جان دے دوں۔ میں ایک انسان ہوں۔ عام سا انسان مجھے عام انسانوں ہی میں رہنا ہے فرشتہ نہیں بننا۔ میں جو اذیت ان کے ہاتھوں سہہ چکا ہوں اس کا جواب دینا ہے مجھے...... معاف نہیں کرنا۔"

"چلو...... یہ مسئلہ تو حل ہوا۔" استاد نے سر ہلا کر کہا۔ "اب یہ بتا ماسٹر تو ان کو صرف اذیت ل دینا چاہتا ہے یا......" وہ رک گیا۔

"یا کیا استاد...... رکو مت۔ مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ صاف صاف کہو۔" شیراز چڑ سا گیا۔

"یا جان سے مارنا چاہتا ہے۔"

ایک دھماکہ تھا جو شیراز کے سر پر ہوا۔ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا اور وہ لرز کر رہ گیا۔ اس کی کھیں اب بھی استاد کی سرخ اور متورم آنکھوں میں پیوست تھیں۔

"جان سے......؟" وہ جیسے عالم خواب میں بڑبڑایا۔ "مگر کیسے؟"

"صرف میری بات کا جواب دے۔" استاد نے بڑے تحمل سے کہا۔ "سوچ مت یہ اگر مگر کیسے ب فضول فل سٹاپ ہیں جو بات کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اسے نثری نظم بلکہ مادر پدر آزاد نظم بنا دیتے

ہیں۔"

"جان سے مارنا چاہتا ہوں۔" شیراز نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سب کو......؟"

"ہاں......سب کو۔" وہ مشینی انداز میں بولا۔ "کیونکہ وہ اب تک مجھے مار چکے ہو یا آئندہ ماردیں گے۔"

"یہ......" استاد نے دونوں ہاتھوں کو زور سے آپس میں ٹکرا کر کہا۔ تالی کی بے حد زور آواز پیدا ہوئی۔ استاد کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔ اس پر رونق سی پھیل گئی۔ جوش دیکھنے والا تھا جو وقت استاد کو وجد میں مبتلا کر رہا تھا۔

"یہ ہے وہ بات جو تجھے سمجھانے کے لیے مجھے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنی پڑی۔" استاد اس کا شانہ تھام کر زور سے جھنجھوڑا۔ "سن ماسٹر۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تو اس کی آواز کڑک سی آ گئی۔ "دشمن جسے معاف کیا جاتا ہے وہ اور طرح کا ہوتا ہے۔ معافی کا ذلیل احساس دشمن کو خودکشی پر آمادہ کر دیتا ہے جس میں عزت نفس اور انا سانس لے رہی ہو۔ تیرے سگے تو رو کے پجاری ہیں۔ روپے کی پوجا کرنے والا فرعون اور قارون ہوتا ہے۔ وہ روپیہ دے کر ایمان خ لیتا۔ ایمان سے منہ پھیر کر اونٹوں پر خزانوں کی چابیاں لا دتا ہے اور جہنم کو چل دیتا ہے۔ اگر تو ا معاف کر دے گا تو وہ سیدھے راستے پر نہیں آئیں گے۔ رخ پھیرتے ہی تجھ پر پیچھے سے وار کر گے اور تجھے اوپر پہنچا دیں گے۔ اللہ میاں کے پاس......اپنی جان کی حفاظت کے لیے دوسرے جان لینے کا حکم تو ہمارا یہ بے بس اور چور دروازوں سے لبالب قانون بھی دیتا ہے۔ پھر تو کیوں رشتو کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہونا چاہتا ہے۔ جو تیرے لیے صرف اور صرف موت کا ہیں۔ اچھا ہوا جو بات تیری سمجھ میں آ گئی۔ تجھے ان سب کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ بس...... فیصلے پر ڈٹ جا۔ جب انسان یہ سوچ لیتا ہے ناں ماسٹر کہ اسے کوئی کام کرنا ہے تو ہاتھ کی لکیریں ا راستہ دیتی بھی ہیں۔ راستہ بتاتی بھی ہیں۔ تو ارادہ کر لے کہ تجھے انتقام لینا ہے اور یقین رکھ تیرا ارا تیرے ہاتھ کی لکیروں کو وہ ہتھیار بنا دے گا جس کا توڑ تیرے دشمنوں کے پاس ہو ہی نہیں سکتا۔"

شیراز خاموشی سے استاد کی بات سنتا رہا جس کا ایک ایک لفظ اسے امرت لگ رہا تھا۔ اس بدن میں ایک نئی توانائی ابھر رہی تھی۔

"کبھی یہ مت سوچ کہ وہ تیرے بھائی ہیں۔ تیری بھابیاں ہیں۔ تیرے بھتیجے ہیں۔ کیا انہو نے سوچا کہ تو ان کا بھائی ہے؟ دیور ہے؟ چچا ہے؟ جب وہ یہ سب کچھ بھول سکتے ہیں۔ تو تیر

اشت اتنی اچھی کیوں ہو کہ تو ان پر رحم کرنے کے لیے ان رشتوں سے ناطہ جوڑے رکھے زبردستی تجھے

"میں پوری کوشش کروں گا استاد کہ کوئی رشتہ میرے آڑے نہ آئے۔" شیراز نے بڑے عز کہا۔

"کوشش کبھی کبھی ناکام بھی ہو جاتی ہے ماسٹر۔" استاد نے تحکم سے کہا۔ "بھول جا۔ ابھی ے۔ اسی وقت سے بھول جا کہ دنیا میں تیرا کوئی بھائی' بھابی یا بھتیجا ہے۔"

"اور وہ انسپکٹر منیر......اور اس کے چاروں چیلے؟" اچانک رفیق کے نتھنے تنفر سے سکڑ گئے۔

"ہاں......آں۔" استاد نے بڑی لمبی "ہاں" کی۔ "ان کو میں بھول ہی گیا۔ جبکہ سب سے پہلے یاد رکھنے والی چیز ہی وہ ہیں۔ فکر مت کر ان کو بھی اپنی فہرست میں لکھ لے' ان کا نمبر بھی لگ جائے گا۔"

"استاد......" شیراز نے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ "استاد۔ تم نے میرے اندر عجیب سی آگ لگا دی ہے۔ میں چودہ سال اندر رہ کر صرف منصوبے بناتا رہتا' جلتا رہتا' کڑھتا رہتا' انتظار کرتا رہتا اور شاید باہر جا کر اپنے کسی بھی منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے ہی ان کے کسی وار کا شکار ہو جاتا۔ مگر اب......اب تو میں صبر کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہوتا جا رہا ہوں۔ میں یہ وقت کس طرح گزاروں گا استاد۔ یہ تو نے مجھے کس بھٹی میں جھونک دیا۔" اس نے پیشانی استاد کے ہاتھ پر ٹکا دی اور سسک اٹھا۔

"بس یہی آگ تیرے اندر جلتی رہنی چاہئے ماسٹر۔" استاد نے اس کے سر کے بالوں کو تھام کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ "میں نے آگ نہیں جلائی۔ آگ تو تیرے اندر موجود تھی۔ میں نے تو اس پر صرف تیل ڈال دیا ہے تاکہ یہ بجھنے نہ پائے' اس کی آنچ کم نہ ہونے پائے' یہ الاؤ دہکتا رکھ ماسٹر......دہکتا لھا ہے۔"

"میں جل کر خاک ہو جاؤں گا استاد۔ میں نے کہا ناں......اب صبر نہیں ہو رہا مجھ سے۔"

"صبر کرنے کو کون کہہ رہا ہے تجھے......انتظار کر......بہت تھوڑا انتظار......" استاد نے راز کا شانہ تھپکا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے کھینچ لیا۔

"امتیاز......"

"جی استاد......" امتیاز کتے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

"سنتری سے کہہ مجھے داروغہ جہنم سے ملنا ہے۔"

"جی استاد......" امتیاز اٹھ کھڑا ہوا اور بیرک کے سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"داروغہ جہنم؟" شیراز نے اچنبھے سے استاد کی طرف دیکھا۔

"سپرنٹنڈنٹ جیل......" استاد مونچھوں میں مسکرایا۔ ظہور زور سے ہنس پڑا۔ شیراز کی سمجھ آیا تو وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک آدھ منٹ بعد امتیاز ان کے قریب لوٹ آیا۔

"کہہ دیا استاد......اور یہ دے گیا ہے وہ......" امتیاز نے چپکے سے کوئی شے استاد کے میں دے دی۔

شیراز نے حیرت سے دیکھا۔ وہ موبائل فون تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ماسٹر......" استاد نے فون کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ صرف دو زبانیں سمجھتی ہے۔" اس نے ہاتھ کی دو انگلیاں کھڑی کیں۔ "ایک دولت کی زبان اور دوسری طاقت کی زبان...... جس کے پاس ان دونوں میں سے ایک ہو وہ بادشاہ وقت ہے اور جس کے پاس دونوں ہوں وہ سپہ سالار رہتا ہے۔"

"کیا مطلب استاد...... بادشاہ ایک طاقت والا اور سپہ سالار دو طاقتوں والا۔" شیراز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بادشاہ صرف حکم دیتا ہے۔ سپہ سالار اس پر عمل کرتا ہے اور عمل کراتا بھی ہے۔ بادشاہ وقت بھی سپہ سالار کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر سکتا ہے جبکہ سپہ سالار بادشاہ کے ہاتھوں کم ہی مرتے دیکھے ہیں۔ تو زیادہ طاقتور کون ہوا ماسٹر...... بادشاہ یا سپہ سالار؟"

"سپہ سالار......" بے اختیار شیراز کے ہونٹوں سے نکلا۔

"تو بس...... سمجھ لے...... میں اپنی بسائی ہوئی دنیا کا سپہ سالار ہوں۔ یہ داروغہ جہنم اور اس کی ساری نفری میری دولت اور طاقت کے اشاروں پر ناچتی ہے۔"

"استاد......" اسی وقت سنتری نے آ کر کہا۔ "سپرنٹنڈنٹ صاحب تمہارے منتظر ہیں۔"

"لو بھئی ماسٹر...... میں چلا۔ واپس آ کر بتاؤں گا کہ کب کیا کرنا ہے؟" استاد نے اٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

امتیاز اور ظہور بھی کھڑے ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی شیراز نے بھی کھڑا ہونا چاہا مگر استاد نے اسے روک دیا۔

"ماسٹر...... میں نے پہلے بھی تجھے کہا ہے تو میرا اس قدر احترام نہ کیا کر...... تو استاد ہے...... درس دینے والا۔ آدمی کو انسان بنانے والا۔ میں تو تیرا دکھ ہی اس لیے اپنے کندھوں پر اٹھا رہا ہوں کہ تو معلم ہے۔ مجھے شرمندہ مت کیا کر۔ بیٹھا رہ......اور اگر تو باز نہ آیا تو میں زبردستی تجھے بٹھا کر رہوں گا۔" استاد نے اس کے شانے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھ دیا۔

شیراز اس عجیب و غریب شخص کو دیکھتا رہ گیا۔ استاد نے مونچھوں میں پھر مسکراہٹ کی جھلک دی اور سنتری کی طرف بڑھ گیا جو دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ استاد چلا گیا۔

دروازہ بند ہو گیا۔

ظہور اور امتیاز اس کے دائیں بائیں آ بیٹھے۔

"بڑے نصیبوں والے ہو ماسٹر۔" امتیاز اسے رشک سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "استاد جیسے پہاڑ کو ہلا کر رکھ دیا تم نے۔"

"استاد کبھی ایک سے دوسری بات نہیں کرتا۔ تم سے تو اس نے پوری ہزار داستان پر بحث کر ڈالی۔" ظہور ہنسا۔

"کیا سوچ رہے ہو ماسٹر؟" امتیاز شیراز کی چپ برداشت نہ کر سکا۔

"استاد کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"زیادہ مت سوچو ماسٹر...... وہ کسی کی سمجھ میں آنے والی شے نہیں ہے۔" ظہور نے پھر ہنس کر کہا۔ "ہم تو پہلے دن سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ استاد یہاں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ یہ جو موبائل آیا ہے سنتری کے ہاتھ۔ یہ استاد نے سپرنٹنڈنٹ کو بھجوایا تھا بیٹری چارج کرنے کے لیے۔ سپرنٹنڈنٹ کو وہ کبھی سپرنٹنڈنٹ نہیں کہتا۔ داروغہ جی کہتا ہے اور ایک آدھ بار اسے داروغہ جہنم بھی کہہ دیا۔"

"تو سپرنٹنڈنٹ نے اس پر کچھ نہیں کہا استاد سے؟" شیراز نے پوچھا۔

"وہ تو غلام ہے استاد کا۔ آگے پیچھے پھرتا ہے۔ کبھی دیکھنا اسے استاد سے ملاقات کے وقت۔ یوں لگے گا جیل کا سپرنٹنڈنٹ استاد ہے اور وہ سسرا اردلی ہے استاد کا۔" شیراز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"استاد کا دھندا کیا ہے یار؟" آہستہ سے پوچھتے ہوئے اس نے امتیاز کی طرف دیکھا۔

"کوئی نہیں جانتا۔ ویسے ظاہر ہے کوئی اچھا دھندا تو ہو گا نہیں۔ نیک آدمیوں کو پولیس کب پکڑتی ہے مگر استاد ہے بڑے دل والا۔ ہم جیسوں کا غم خوار۔ تم جیسوں کا دوست۔ پولیس کو پتہ نہیں کتنا مال ملتا ہے استاد سے جو وہ اس طرح اس کی پاسبانی کرتی ہے۔ اس کا حکم مانتی ہے۔ آدھی رات کو استاد چاہے تو جیل سے نکل جائے اور چاہے تو چٹے روشن دن لوٹ آئے۔ کئی بار وہ چار چار یا پانچ دنوں کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔"

"استاد کس جرم میں ہے یہاں؟" اچانک شیراز نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں جانتا۔" اس بار ظہور بولا۔ "مگر یہ طے ہے کہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ دونوں کو اس نے رہا کرا دیا ہوتا۔ ہم ہی نہیں مانے۔"

"کیوں؟ کیا تم جیل میں زیادہ خوش ہو؟" شیراز حیرت سے بولا۔

"یہی سمجھ لو ماسٹر ......" ظہور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ "ہم دونوں بچپن کے یار ہیں بال بچہ، ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ استاد سے جس دن سے جڑے ہیں اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سے دور جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" وہ اداس سا ہو گیا۔ "سوچتے ہیں جب اپنی قید پوری ہو جائے گی اور استاد سے الگ ہو کر باہر جانا پڑے گا تو کیا ہوگا۔ ہم تو یتیم ہو جائیں گے ماسٹر۔"

"ارے ظہور ...... اداس کیوں ہوتا ہے۔ استاد سے کہیں گے، ہمیں باہر بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لے اور اگر اس سے پہلے باہر جانا پڑا تو نہیں جائیں گے یار ...... کسی سنتری کا سر منہ پھاڑ کر سزا بڑھوالیں گے۔" یہ امتیاز کی آواز تھی۔

شیراز اندر سے عجیب شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔ ظہور اور امتیاز کی باتیں اور استاد سے ان کی انسیت نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بُرے لوگ کس قدر صاف ستھرے تھے۔ اس کی اپنی دنیا میں تو ان جیسا ڈھونڈے بھی نہ ملتا اور اگر مل جاتا تو کسی نہ کسی عذاب میں گرفتار ملتا۔ بیرک کا ماحول اداس ہو گیا۔ شیراز نے سر جھکائے بیٹھے امتیاز اور ظہور کی طرف دیکھا اور خود بھی خاموشی کے سمندر میں اتر گیا۔





ساری رات گزر گئی۔

اگلا دن اور رات بھی تمام ہو گئی۔

استاد اس سے اگلے دن صبح واپس آیا ...... مگر نہیں۔ وہ خود کہاں آیا۔ سنتری نے سلاخوں سے اندر جھانکتے ہوئے شیراز سے کہا۔

"چل بھئی ...... سپرنٹنڈنٹ صاحب نے تجھے بلایا ہے۔"

"مجھے ......؟" شیراز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاں ہاں تجھے ...... جلدی کر ...... آ جا۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔

"گھبراؤ مت، ماسٹر ...... اطمینان سے جاؤ۔ استاد ہے ناں!" ظہور نے اسے تسلی دی اور وہ امتیاز اور ظہور کو دیکھتے ہوئے اٹھ گیا۔

سنتری کے پیچھے پیچھے وہ ننگے پاؤں طویل راہداری میں چلتا رہا جس کے دائیں بائیں بیرکوں میں قیدی بند تھے۔ ابھی صبح کے چھ بجے تھے۔ سات بجے ان سب کو جگا کر مشقت پر لگا دیا جاتا تھا۔ شیراز کو عدالت نے چونکہ بامشقت سزا نہ دی تھی اس لیے وہ کام کاج سے بری تھا۔

پچھلی دو راتیں اور ایک دن امتیاز اور ظہور کے ساتھ شیراز نے استاد کے بارے میں باتیں کرتے اور سوتے جاگتے گزارے تھے۔ استاد کی اتنی غیر حاضری اسے طویل لگ رہی تھی جبکہ بقول امتیاز اور ظہور کے وہ کئی کئی دن اور راتیں یونہی غائب ہو جایا کرتا تھا۔

سنتری کے ساتھ راہداری عبور کر کے وہ وسیع و عریض میدان میں داخل ہوا۔ میدان کے آخر میں سامنے جیل انتظامیہ کے کمرے تھے۔ دائیں ہاتھ ایک طرف چھوٹی سی مسجد تھی اور بائیں طرف کے حصہ کو گھاس اگا کر باغ کی شکل دی گئی تھی۔ بہت اونچی چار دیواری تھی، جس نے جیل کے کئی

فرلانگ ایریا کو گھیر رکھا تھا۔ چار دیواری کے اوپر لوہے کی خاردار تاروں کی باڑ تھی۔ انتظامیہ کے کمروں کے دائیں طرف واچ ٹاور موجود تھا' جس پر سرچ لائٹ بھی نصب تھی۔ ابھی چونکہ پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی اس لیے واچ ٹاور پر نصب سرچ لائٹ کا روشن دائرہ دھیرے دھیرے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔

میدان کی ٹھنڈی زمین پر چلتے ہوئے شیراز کے پیر سُن ہو گئے تاہم وہ رکے بغیر چلتا رہا۔ سنتری اس کے ساتھ ساتھ بندوق تھامے رواں تھا۔

میدان کے اختتام پر چند سیڑھیاں چڑھ کر وہ پھر کسی کاریڈور میں داخل ہوئے۔ اکثر کمروں کے دروازے بند تھے۔ چند ایک میں باوردی پولیس والے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھے۔

سنتری کاریڈور میں بائیں طرف مڑا اور پہلا کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے کے دروازے پر رک گیا۔

شیراز نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ میں اوپر کی طرف ''سپرنٹنڈنٹ جیل رانا سہیل'' کی نیم پلیٹ نصب تھی۔

سنتری نے دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔

''یس......'' اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''سر...... میں ہوں سپاہی منور علی۔'' سنتری نے جلدی سے کہا۔

''دروازہ کھلا ہے۔'' اندر سے جواب آیا۔

سنتری نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور شیراز کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ شیراز نے سردی کے باعث سُن اور وزنی پاؤں کو حرکت دی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ سنتری نے دروازہ بند کر دیا اور خود باہر رہ گیا۔

شیراز اندر داخل ہوا تو سپرنٹنڈنٹ کے سامنے کرسی پر استاد کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''آ جا ماسٹر...... رک کیوں گیا۔ آ جا بیٹھ۔'' استاد نے اسے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ دھیرے سے ''السلام علیکم'' کہہ کر آگے بڑھا اور بیٹھ گیا۔ رانا سہیل نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک مضبوط بدن آدمی تھا جس کے کرخت چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ وہ اس وقت بھی باوردی تھا۔ پی کیپ پاس پڑی تھی۔ استاد اور اس کے آگے میز پر ناشتے کا سامان چُنا ہوا تھا۔

''چائے بناؤ رانا۔'' استاد نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ رانا نے تیسرا کپ بنا کر شیراز کے آگے سرکایا اور استاد نے اسے ناشتہ کرنے کا اشارہ کیا۔

شیراز نے خاموشی سے ان دونوں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس دوران دو تین بار اس کی نظریں رانا سہیل سے دو چار ہوئیں جو اسے اپنی ہی طرف متوجہ ملا۔ ناشتہ ختم کر کے استاد نے برتن ایک طرف سرکا دیئے اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

''اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔'' استاد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

شیراز نے اس کی طرف اور رانا سہیل نے شیراز کی طرف دیکھا۔

''ماسٹر...... میں نے داروغہ جی سے تیرے لیے کچھ بات کی ہے۔ امید ہے تجھے پسند آئے گی۔''

جواب میں شیراز پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''استاد کی خواہش ہے کہ تمہیں مصروف رکھا جائے۔'' اب کی بار رانا سہیل نے زبان کھولی۔ اپنے جثے کی طرح اس کی آواز بھی خاصی مضبوط تھی۔ رنگ روپ کا سرخ و سفید رانا سہیل نجانے شیراز کو ایک اچھا آدمی کیوں لگا۔

''اس کے لیے میں نے سوچا ہے کہ تمہیں لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی جائے۔ جیل میں ایک چھوٹی سی لائبریری موجود ہے۔ وہاں کئی قسم کی کتابیں ہیں تم دیکھ لو۔ تم جیسے بے گناہ آدمی کی میں جو مدد کر سکا ضرور کروں گا۔ دن رات سوچوں میں ڈوبے رہنے کے بجائے اگر تم لکھنے پڑھنے میں وقت گزار سکو تو میرا خیال ہے یہ زیادہ بہتر ہے۔''

''جی......'' شیراز نے ممنونیت سے کہا اور استاد کی طرف دیکھا جس نے مونچھوں میں مسکراتے ہوئے بائیں آنکھ دبائی۔

وہ سمجھ گیا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہو گا۔ لائبریری کا صرف بہانہ ہے۔

''لائبریری صبح نو بجے سے سہ پہر تین بجے تک کھلی رہتی ہے۔ تم چاہو تو رات تک وہاں بیٹھ سکتے ہو تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' رانا سہیل نے اس کی طرف ایک چھوٹا سا کارڈ بڑھا دیا۔

شیراز نے دیکھا وہ ایک وزٹنگ کارڈ تھا' رانا سہیل کا۔ اس نے اس کی پشت پر اسے صبح نو بجے سے رات بارہ بجے تک لائبریری سے استفادے کی سہولت کی اجازت لکھ دی تھی۔

''شکریہ سر......'' اس نے کارڈ جیب میں ڈال لیا۔

''سردی ہے۔ یہ کچھ کپڑے اور ایک گرم چادر تمہارے وکیل نجم الدین نے دیئے ہیں۔ یہ

جاتے ہوئے ساتھ لے جانا۔"

"نجم......وہ کب آیا تھا سر؟" شیراز نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ نہیں آیا۔ استاد اس سے مل کر آیا ہے اور ...... یہ کارڈ ہے اس کا۔ اس پر اس کا نمبر بھی موجود ہے۔ تم جب چاہو اس سے فون پر بات کر سکتے ہو۔ استاد اسے اپنے موبائل کا نمبر دے آیا ہے۔ وہ جب چاہے گا تم سے رابطہ کر لے گا۔" رانا سہیل نے نجم الدین کا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا جسے لے کر شیراز نے خوب غور سے دیکھا اور اسے بھی قمیض کی اوپری جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے استاد کی طرف دیکھا جو سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔

"استاد نے بتایا ہے کہ کسی ضروری کام سے تم کبھی کبھی رات کو باہر جانا چاہو گے۔ جب استاد مجھے انفارم کرے گا میں اس کا بندوبست کروں گا۔" رانا سہیل کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے تو ایک دم شیراز کا سارا بدن تن گیا۔ اس کے سر میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ چونک کر اس نے استاد کی طرف دیکھا جو اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت پر وہ بالکل کوئی ردِعمل ظاہر نہ کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے نگاہیں استاد سے ہٹا کر رانا سہیل کی طرف دیکھا جو لاپرواہی کے ساتھ اپنے سامنے رکھے استاد کے لائٹر سے کھیل رہا تھا۔

"تھینک یو سر......" بڑی مشکل سے شیراز کے لبوں سے نکلا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور بدن میں برقی رو سی دوڑ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا اس کی کنپٹیاں جلنے لگی ہیں اور پیشانی تپنے لگی رہے۔

"اگر تم کوئی بات پوچھنا چاہو۔ کوئی ضرورت بتانا چاہو تو......"

"نہیں...... کچھ نہیں۔ آپ نے جو کہہ دیا‘ جو کر دیا اس کے بعد کچھ نہیں۔ اور کچھ نہیں۔" وہ رک رک کر کہہ سکا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اگر تم جانا چاہو تو......" رانا سہیل نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ پڑا ایک سفید بڑا سا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیراز اٹھ گیا۔ اس نے شاپر تھام لیا‘ سر کے اشارے سے رانا سہیل کو سلام کیا۔ پھر استاد کی طرف دیکھا۔

"تو چل ماسٹر...... میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔" استاد نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔

وہ خاموشی سے پلٹا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سنتری بندوق تھامے ایک طرف کھڑا تھا۔ اسے

باہر نکلتا دیکھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ شیراز نے دروازہ بند کیا اور واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ سنتری بندوق اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔



استاد تقریباً آدھ گھنٹے بعد لوٹا۔

شیراز نے یہ سارا عرصہ ٹہلتے ہوئے گزارا۔ اس نے امتیاز اور ظہور کو صرف یہ بتایا کہ ادھر سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں استاد بھی موجود تھا اور تھوڑی دیر میں آ رہا ہے۔ انہوں نے جلدی جلدی کونے میں رکھے کولر سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا۔ استاد کی چٹائی جھاڑ پونچھ کر صاف کی اور الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔

شیراز کو بے تابی سے ٹہلتے دیکھ کر وہ سوچتے تو رہے کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے مگر جب شیراز نے ان کے پوچھنے پر کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

استاد بیرک میں داخل ہوا تو بے چینی سے شیراز اس کی طرف بڑھا۔

"استاد......"

"دھیرج ماسٹر دھیرج۔" اس نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ "کیا ہوا؟ اتنی بے چینی کس لیے......" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"استاد......" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر خاموش ہو گیا۔

"ارے...... تیرا تو سر تپ رہا ہے۔" استاد نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ "کیا ہوا ماسٹر......ابھی تو تو ٹھیک تھا۔"

"میں اب بھی ٹھیک ہوں استاد۔" شیراز نے خود کو اس سے الگ کیا اور مسکرایا۔ "بس آگ ارازیادہ ہی دہک گئی۔"

"تو اس میں خود کو جلانے کو کس کم بخت نے کہا ہے تجھے۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ "ارے اس میں تو دوسروں کو جلانا ہے۔ خود کو سنبھال ماسٹر۔ جذباتی ہونے کے لیے یہ اور ایسے کئی لمحات اور آئیں گے۔ مگر تجھے کسی بات سے اس قدر زیادہ متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ اپنا خانہ خراب کر لے۔ آ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

استاد اسے لیے ہوئے اپنی چٹائی پر آ بیٹھا۔

"یہ تو نے اچھا کیا کہ سویٹر پہن لیا۔" استاد نے اس کے جسم پر نجم الدین کا بھیجا ہوا سویٹر دیکھ کر کہا۔ "نجم تجھے سلام کہہ رہا تھا۔ وہ کل ملنے آئے گا تجھ سے۔ اگر تو اس سے بات کرنا چاہے تو جب

جی چاہے اس پر کر لینا۔" استاد نے موبائل کی طرف اشارہ کیا جو اس کی سائڈ جیب میں موجود تھا۔

"استاد...... میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔" شیراز نے اسے نثار ہو جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ایسی باتوں کو میں گالیاں کہا کرتا ہوں اور تیرا میرا گالی کا مذاق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایسی گل پاش نظروں سے مت دیکھ مجھے۔ میں اٹھارہ سالہ دوشیزہ نہیں ہوں جس پر تو ٹھرک جھاڑ رہا ہے۔"

شیراز جھینپ گیا۔

"نہیں استاد...... میں تو اپنے مسیحا کو دیکھ رہا تھا۔"

"ایسے گاڑھے گاڑھے اور بڑے بڑے الفاظ میں مت تول مجھے ماسٹر۔ میں کیا ہوں تو کب جانتا ہے؟ بس تیرے کام آنے کی ایک خواہش پوری کر رہا ہوں اور براہ کرم آئندہ مجھے ایسے القاب و آداب سے معاف ہی رکھنا۔ زیادہ تکلف، تعلق کے لیے زہر بن جایا کرتا ہے۔"

"کوئی تکلف نہیں برتا میں نے، استاد......" شیراز نے صاف لہجے میں کہا۔ "میں تو دل کی بات زبان پر لایا ہوں۔"

"اچھا بس...... اب ذرا دو باتیں مطلب کی ہو جائیں۔" استاد نے کہا پھر ظہور اور امتیاز کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں نے کچھ کھایا پیا کہ مرن برت رکھے بیٹھے ہو۔"

"سنتری سے کہا ہے استاد۔ وہ چائے پانی لینے گیا ہے۔" امتیاز نے جلدی سے کہا۔

اسی وقت سنتری نے ظہور کو آواز دی۔ وہ اٹھ کر گیا اور سنتری سے ایک لفافہ لے کر لوٹ آیا۔

امتیاز نے اس کے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا تھرماس لے لیا۔ اس میں شاید چائے تھی۔ دو منٹ میں انہوں نے صاف پلیٹوں میں حلوہ پوری اور چنے چن دیے۔ استاد نے سامان کی طرف دیکھا۔

"بھئی میں ناشتہ کر آیا ہوں۔ ماسٹر نے بھی کچھ ہلکا پھلکا کھایا ہے۔ پھر بھی دو ایک لقمے لے لیتا ہوں۔"

استاد نے ایک پوری حلوے کے ساتھ کھائی۔ شیراز نے دو لقمے چنوں کے ساتھ لیے اور ہاتھ اٹھا لیا۔ ظہور اور امتیاز نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ پھر سب لوگ چائے کے کپ لے کر بیٹھ گئے۔

"ماسٹر...... یہ بتا گولی وولی چلا لیتا ہے؟" چسکی لے کر کپ زمین پر رکھتے ہوئے استاد نے

پوچھا۔

"ضرور چلا لیتا ہوں استاد۔" شیراز نے خالی کپ ایک طرف رکھا۔ "جس ریوالور سے نور ین کا قتل ہوا وہ میرا ہی تھا۔ یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"ہوں......" استاد نے سر ہلایا۔ "میں نے اس لیے پوچھا کہ محض شوشا کے لیے تو ریوالور ڈں رکھ چھوڑا تھا۔ چلا بھی لیتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

پھر اس نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیاں پھیرنا شروع کیں۔

"کل رات نو بجے جانا ہے تجھے۔"

"کہاں؟" بے اختیار شیراز نے پوچھا۔

"اپنے گاؤں؟" استاد نے آہستہ سے کہا۔

جواب میں شیراز ایک لمحے کے لیے حیرت اور سنسناہٹ کا شکار ہوا۔ پھر سنبھل گیا۔ قدم قدم ے اب یہ جھٹکے اپنی عادت بنا لینے چاہئیں تھے۔

اسے سنبھلتا دیکھ کر استاد مسکرایا۔

"اچھا ہے...... اچھا ہے کہ تو اب صورت حال کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اس سے ت بھی بچ جاتا ہے اور انرجی بھی ضائع نہیں ہوتی۔"

"میں کس طرح وہاں پہنچوں گا استاد؟" شیراز نے سوال کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔

"اس کا انتظام تیرا درد سر نہیں ہے۔ مگر میری ایک بات بڑے دھیان سے سن۔" استاد نے ل آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "میں چاہوں تو تیرے تمام دشمنوں کو ایک ہی ہلے میں، ایک ہی ت میں فنا کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔"

"نہیں استاد......" شیراز نے تڑپ کر کہا۔ "ایسا مت کرنا۔ ورنہ تو میں خواہش کی سولی پر ہی و جاؤں گا۔ میں اپنے ہاتھوں ان سب کو جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں استاد...... اگر تم نے ایسا کر ا تو میری آگ کیسے سرد ہو گی۔ میں کیسے سکون پا سکوں گا استاد؟"

"اسی ایک وجہ نے مجھے ہاتھ اٹھانے سے روک لیا ہے ماسٹر۔ ورنہ میں اب آیا تھا تو تیرے وں کی موت کی خبر بھی سنا سکتا تھا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تو خود یہ کام کرے۔ اپنے ہاتھوں ...... تاکہ جب تو موت کی آغوش میں سر رکھے تو تیرا جسم اس سکون سے غسل کر چکا ہو کہ تو نے شمن کو خود موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"میں تمہارا ممنون......"

"پھر وہی رسمی باتیں ماسٹر۔" استاد چڑ گیا۔ "تجھ پر میری بات کا اثر نہیں ہوتا۔"

"میں کیا کروں استاد۔" شیراز بے اختیار مسکرا دیا۔ "میں جب تمہاری مہربانیاں دیکھتا ہوں رہ نہیں پاتا اور......"

"ان مہربانیوں کا حساب دل میں رہنے دے ماسٹر۔ ان کی اصلی جگہ وہی ہے۔ زبان کو کسی او کام کے لیے رہنے دو۔ جو بات زبان پر آ جائے وہ راز داری کے زمرے سے نکل جاتی ہے اور حسا دوستاں دل میں راز بن کر رہے تو تبھی مزہ دیتا ہے۔"

"اچھا استاد۔ میں اب پوری کوشش کروں گا کہ بے مروت اور ناشکر گزار بن جاؤں۔" شیر نے دھڑلے سے کہا اور استاد کی ہنسی نکل گئی۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔ بس رسمیات میں نہ پڑا کر۔"

باتوں باتوں میں بارہ بج گئے۔

اچانک استاد کو کوئی خیال آیا۔

"ارے ماسٹر...... تو یہاں ہمارے پاس بیٹھا کیوں وقت ضائع کر رہا ہے۔"

"تو کیا کروں؟" شیراز چونکا۔

"او بابا۔ داروغہ جی سے تجھے کارڈ لے کر کاہے کو دیا ہے؟ جا لائبریری میں جا کر کتابیں چاٹ۔ وقت اچھا گزر جائے گا۔"

"بات تو تمہاری درست ہے استاد۔" شیراز تیار ہو گیا۔

"تو جا۔ سوچ کیا رہا ہے؟ جا جا......" استاد نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

شیراز نے دروازے کے قریب آ کر سنتری کو آواز دی۔

"کیا ہے؟" وہ قریب آ کر بولا۔

"مجھے لائبریری جانا ہے۔" شیراز نے رانا سہیل کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اسے پاس ہی رکھو۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا حکم مل چکا ہے۔" وہ لاپرواہی سے اور کارڈ اسے واپس کر کے دروازہ کھول دیا۔

"لائبریری کا پتہ ہے یا نہیں؟" اسے باہر نکال کر اس نے دوبارہ دروازہ لاک کرتے ہو پوچھا۔

"نہیں...... پہلی بار جا رہا ہوں۔"

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ ابھی تجھے دن کتنے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔" سنتری نے دور کھڑے ایک دوسرے سنتری کو آواز دی۔

"ارے او شہاب...... ادھر آ......"

سنتری دانتوں میں خلال کرتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔

"اسے لائبریری لے جا......"

"چل آ...... پڑھا کو خان۔" شہاب نے اسے تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہا اور اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔

استاد ظہور اور امتیاز خاموشی سے یہ ساری باتیں سنتے رہے۔

"اچھا ہے۔" استاد نے شیراز کو شہاب سنتری کے ساتھ جاتے دیکھ کر کہا۔ "اس کی خود اعتمادی بحال ہونی چاہیے۔" ظہور اور امتیاز دونوں سر ہلا کر رہ گئے۔

لائبریری ایک بڑے کمرے پر مشتمل تھی۔ جس کے دروازے کے پاس اندر کی طرف ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر "لائبریرین" کی تختی پڑی تھی۔ بوڑھے نے شلوار قمیض پر کوٹ اور سر پر گرم ٹوپی پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر نازک سا نظر کا چشمہ تھا۔ مونچھیں بڑی باریک سی لکیر کی صورت میں ہونٹوں کے اوپر دکھائی دے رہی تھیں۔ داڑھی کے نام پر اس کی ٹھوڑی پر تھوڑے سے بال تھے اور پچکی ہوئی ناک دیکھ کر بے اختیار شیراز کے دماغ میں جو پہلا لفظ ابھرا وہ "بوبکرا" تھا۔ یہ اصطلاح اس بوڑھے لائبریرین پر ایسی فٹ بیٹھی کہ اس کے لیے ہنسی برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ ضبط کرنے میں اس کا رنگ سرخ ہو گیا، تاہم مسکراہٹ کو وہ نہ روک سکا۔

"اب واپس خود ہی آ جانا۔ میں جا رہا ہوں۔" شہاب نے لاپرواہی سے کہا اور اسے لائبریرین کے حوالے کر کے دروازے پر دائیں بائیں کھڑے دو سپاہیوں سے گپ شپ کرنے لگا۔

"جی...... فرمائیے۔" بوڑھا اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"جی...... میرا نام چوہدری شیراز ہے۔" شیراز نے جیب سے رانا سہیل کا کارڈ نکال کر اس کے آگے ڈال دیا۔

"تو میں کیا کروں؟" بوڑھے نے کہا اور کارڈ پر نظر ڈالی۔ پھر ایک دم تن کر بیٹھ گیا۔ "اوہو تو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی آشیرواد حاصل ہے۔ آئیے صاحب آئیے۔ لائبریری ہی آپ کی ہے۔ جائیے جہاں جی چاہے بیٹھیے۔ جو جی چاہے پڑھیے۔"

"جی...... شکریہ!" شیراز نے کارڈ لے کر جیب میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر دو قدم ہی واپس لوٹ آیا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں بزرگوار؟"

"میرا نام بدر ہے جی۔" وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

شیراز سر ہلا کر آگے چل دیا۔

لائبریری کے درمیان میں ایک لمبی میز کے گرد کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ دیواروں کے بڑی بڑی الماریاں رکھی تھیں جن میں نیچے سے اوپر تک کتابیں لگی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ہال مغربی گوشے میں کیٹلاگ پڑی تھی۔ وہ اس طرف بڑھ گیا۔ پوری لائبریری میں اس کے اور بدر علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔

کیٹلاگ اڑتالیس چھوٹے درازوں پر مشتمل تھی جن میں حروف تہجی کے حساب سے کتابو کے کارڈ بنا کر رکھے گئے تھے۔ انگلش لٹریچر بہت کم تھا اور اس کے لیے محض ایک بڑے بک سٹینڈ کافی سمجھا گیا تھا۔

"شیراز نے کیٹلاگ کا ایک دراز کھولا اور اپنی پسند کی ایک کتاب منتخب کی۔ رائٹنگ پیڈ پاس پڑا قلم اٹھایا کتاب کا نام اور حوالہ لکھا اور بوڑھے بدر کے پاس لوٹ آیا۔

"یہ کیا تکلف کیا تم نے میاں!" بوڑھا چٹ دیکھ کر بھڑک گیا۔

"جی...... کیا مطلب؟" شیراز حیرت زدہ رہ گیا۔

"یہ الماریوں میں کتابیں لگی ہیں ناں۔ جو کتاب پڑھنا چاہو نکالو اور شروع ہو جاؤ۔ یہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ جتنی دیر میں کتاب ڈھونڈ کر لاؤں گا لائبریری کا وقت ختم ہو جائے گا"

"مگر میں تو وقت کا پابند ہی نہیں ہوں بدر صاحب۔" شیراز نے اسے چھیڑا۔ "آپ نے ش کارڈ کو پوری طرح دیکھا نہیں۔ اس پر لکھا ہے کہ......"

"پڑھا ہے میں نے...... تم رات کے بارہ بجے تک لائبریری میں رہ سکتے ہو۔" بدر نے کی بات کاٹ دی۔ "مگر مجھے تو تین بجے آف کر کے جانا ہے۔ اس کے بعد تم اکیلے یہاں م کرتے رہنا۔ بہتر یہی ہے کہ ان چٹوں کے چکر میں مت پڑو۔ سیدھے سیدھے کتاب نکالو اور و بیٹھ کر اس میں غرق ہو جاؤ۔"

شیراز سمجھ گیا کہ بوڑھا حرام کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ وہ پولیس کی وردی میں نہیں تھا مگر ان کے درمیان ہی تھا۔ اس پر کیسے اثر نہ ہوتا۔ اسے اٹھ کر کتاب تلاش کرنا اپنی موت نظر آ رہا تھا۔

ایک طویل سانس لے کر وہ منیر کے پاس سے ہٹ آیا۔ ایک الماری کے پاس آ کر ایک کتاب کا انتخاب کیا اور نکال کر ایک کرسی پر آ بیٹھا۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ناول بے حد دلچسپ تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب بدر میاں نے آ کر اس کا شانہ ہلایا۔

"میاں تین بج گئے۔ میری چھٹی کا وقت ہو گیا میں جا رہا ہوں۔ تم نے اگر مزید بیٹھنا ہے تو میں سنتریوں سے کہہ دوں اور اگر جانا ہے تو نکلو تاکہ میں لائبریری بند کر کے جاؤں۔"

شیراز نے ایک گہری نظر بدر کے بوڑھے جثے پر ڈالی۔

"بدر صاحب...... آپ اس قدر اکتائے ہوئے کیوں رہتے ہیں؟" اس نے اچانک پوچھ لیا۔

"کیا مطلب؟" بدر چونک کر بولا۔ "میں کیوں اکتایا ہوا رہوں گا۔"

"بیٹھیے...... چند منٹ کے لیے۔" شیراز نے اس کا بازو تھام کر پاس پڑی کرسی پر بٹھا لیا۔

"بولو...... کیا کہنا ہے؟" بدر کے لہجے میں تلخی کچھ کم ہوئی۔

"آپ روبوٹ کی طرح زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ ادھر تین بجے ادھر آپ چل دیئے۔ کیا یہ کتابیں آپ کو اپنی طرف نہیں کھینچتیں؟"

"نہیں......" بدر نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اپنی جوان بچیوں کے لیے جو دو ٹیوشنیں پڑھانی ہیں جا کر وہ مجھے آوازیں دیتی ہیں۔" اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔ "اتنی کم تنخواہ ہے شیراز میاں کہ اس میں تو کرایہ اور گھر کے بل پورے نہیں ہوتے۔ میں کیا ہنسوں؟ کیا مسکراؤں اور کیا ان کتابوں کے چہرے دیکھوں؟ مجھے تو ہر طرف غربت، مفلسی اور ضروریات کے دیو منہ کھولے ہڑپ کرنے کے لیے تیار کھڑے نظر آتے ہیں اور یہ کتابیں بھی کیا ہیں۔ پچھلے تین مہینوں میں تم پہلے آدمی ہو جو مطالعے کے لیے یہاں آئے ہو۔ میں صبح نو بجے سے تین بجے تک یہاں اکیلا بیٹھا یہی سوچتا رہتا ہوں کہ بڑی لڑکی شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ چھوٹی بھی ایک دو سال تک اس کے برابر لڑکی ہو گی۔ بیٹا بیمار ہے اس کا علاج کرانے کے لیے رقم درکار ہے۔ بیوی تپ دق کے ہسپتال میں پڑی ہے اس کی دواؤں کا کیا کروں...... اب جسے اتنے سارے امتحانی پرچے حل کرنے ہوں وہ ان کتابوں سے کیا یاری لگائے گا۔ مجھے جانے دو دیر ہو رہی ہے۔ ٹیوشن پڑھانے دیر سے پہنچا تو بڑی کڑوی باتیں سننا پڑیں گی۔"

بدر...... اسے حیران و ششدر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ وہ ناول سامنے رکھے دکھے دل کے

ساتھ سوچتا رہ گیا کہ اس نے بدر کے اندر جھانکے بغیر اسے پریشان کیوں کیا؟ اس کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ اب مزید وہاں بیٹھے۔ اس نے ناول کو واپس الماری میں رکھا اور باہر جانے کے لیے پلٹا۔ ایک دم اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

کھلے دروازے سے باہر وہ دیکھ رہا تھا کہ دور میدان کے ایک سرے پر شہاب ایک سپاہی کے ساتھ کھڑا تھا اور اس سپاہی کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ اس کا جی چاہا اڑ کر ان دونوں تک جا پہنچے اور سعید کا ٹینٹوا دبا دے جو شہاب سے باتیں کر رہا تھا۔ وہی سعید جس نے گاؤں کی حوالات میں انسپکٹر منیر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس پر تشدد کی انتہا کر دی تھی۔

اس نے ایک کرسی کی پشت کا سہارا لے لیا ورنہ شاید وہ خود پر قابو نہ رکھ پاتا اور سعید کی طرف دوڑ لگا دیتا۔

باتیں کرتے کرتے شہاب نے لائبریری کی طرف اشارہ کیا۔ سعید نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ شیراز نے ایک دم خود کو پیچھے کر لیا۔ اب وہ تقریباً اندھیرے میں کھڑا تھا۔ سعید نے شہاب سے کچھ کہا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر جیب سے ایک لفافہ نکالا اور شہاب کے ہاتھ میں دے دیا۔ شہاب نے بڑی احتیاط سے لفافہ پینٹ کی جیب میں ڈالا اور غیر محسوس انداز میں بائیں دیکھ کر آرام سے کھڑا ہو گیا۔

شیراز کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ سعید اور شہاب کے درمیان موضوعِ بحث اسی کی ذات تھی۔

تھوڑی دیر بعد سعید شہاب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ شیراز نے دیکھا کہ سعید کے جاتے ہی شہاب نے ایک بار اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا اور پھر بڑے لاپروایانہ انداز میں چل پڑا۔ پھر یہ جانتے ہی کہ شہاب کا رخ لائبریری ہی کی طرف ہے وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر آگے بڑھا اور ایک کرسی پر آ بیٹھا۔ یہ کرسی دروازے کے کافی قریب تھی۔ اس نے سامنے میز پر پڑا اخبار اٹھایا اور اسے کھول کر آگے رکھ لیا۔ خبروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے وہ پوری طرح چوکس تھا کہ کب شہاب لائبریری میں داخل ہوتا ہے۔

شہاب لائبریری کے دروازے پر آ کر رکا۔ وہاں موجود دونوں سپاہیوں سے ایک آدھ فقرے کا تبادلہ کیا اور اندر داخل ہوا۔

''کیوں بھئی پڑھاکو...... ابھی تک ڈٹے ہوئے ہو؟'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''جی......'' آہستہ سے شیراز نے کہا اور نظریں اٹھائیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' شہاب اس کی سرخی مائل آنکھیں دیکھ کر چونکا۔

''ہاں...... بالکل ٹھیک ہے۔'' شیراز نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تو ابھی بیٹھو گے یا واپس چلنا ہے۔'' شہاب نے اسے بغور دیکھا۔

''بس جا ہی رہا تھا۔'' اس نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف کر دیا۔

''تو آؤ...... اکٹھے ہی چلتے ہیں۔'' وہ بڑے دوستانہ لہجے میں بولا۔

اور شیراز اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

ان کے باہر نکلتے ہی ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس نے لائٹیں آف کیں اور باہر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

''اگر میں دوبارہ آنا چاہوں تو......''

''دروازہ کھلا ہے۔ جب جی چاہے آ جانا۔ ہم دونوں کی ڈیوٹی شام پانچ بجے تک ادھر ہی ہے اور اس کے بعد رات کی ڈیوٹی پر دوسرے دو سنتری ہوں گے۔ ویسے تو اس لائبریری میں دن کو کوئی نہیں آتا مگر کبھی کبھی بڑے صاحب کو دورہ پڑتا ہے اور وہ اِدھر آ بیٹھتے ہیں۔ اس لیے دن رات یہاں کوئی نہ کوئی موجود رہتا ہے۔ اس کے اندر کتابوں کے سوا ہے کیا جو کوئی لے جائے گا۔ اسلئے اسے صرف چھٹی کے دن لاک کیا جاتا ہے۔ آگے پیچھے صرف دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔'' ایک سپاہی نے اسے اس قدر تفصیل فراہم کر دی کہ وہ سر کے بالوں تک پُر ہو گیا۔

مزید کوئی سوال کیے بغیر وہ شہاب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

شہاب نے شاید جان بوجھ کر رفتار کم رکھی۔ شیراز کو یہی محسوس ہوا کہ وہ ٹہلنے کے انداز میں چل رہا ہے۔

''مجھے پتہ چلا ہے تم ڈکیتی اور قتل کے جرم میں اندر آئے ہو۔'' چلتے چلتے شہاب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

شیراز نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''ہاں...... مجھ پر یہی الزام ہے۔''

''یعنی دراصل تم مجرم نہیں ہو۔''

''ہاں...... مگر قانون اس بات کو نہیں مانتا۔''

''قانون تو ثبوت پر چلتا ہے بھائی۔'' شہاب نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور لگتا ہے ثبوت سارے ہی تمہارے خلاف ہوں گے۔''

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں یہاں کیوں کر آتا؟"

"میں بہت بڑی توپ شے نہیں ہوں لیکن اگر کوئی چھوٹا موٹا کام ہو تو مجھ سے کہنا میں کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"کس طرح کا کام؟"

"کوئی بھی کام......"

"مجھے یہاں سے فرار کا راستہ بتا سکتے ہو؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟" شہاب ایک دم گھبرا کر رک گیا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اردگرد اور آواز دبا کر بولا۔ "رانا سہیل کے ہوتے ہوئے ایسی بات سوچنا بھی حماقت ہے۔ تم تو مجھے دینے والی بات کر رہے ہو۔"

"تو اور کیا کام بتاؤں تمہیں؟"

"میرا مطلب تھا کوئی نشہ پانی......اور کبھی مہینے دو مہینے میں دل پشوری والا کام۔" اس دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے بائیں آنکھ دبائی۔

"اوہ......" شیراز نے اسے دیکھ کر ہونٹوں کو مسکرانے کے انداز میں پھیلایا۔ "تو یہ مطلب تمہارا؟"

"تو اور کیا...... تم نے تو ایک دم چھلانگ مار دی۔" شہاب نے سر جھٹک کر کہا۔

"یہ نشہ پانی تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہ دل پشوری والی بات حلق سے نہیں اترتی۔"

"یہاں سب کچھ ہوتا ہے بھائی۔ جیب میں مال ہونا چاہئے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ الو پٹھے بڑے بڑے سیاستدان اور عیاشی کے رسیا لوگ ہماری جیلوں میں عبادت کرنے کے سالہا سال تک پڑے رہتے ہیں۔ ان کی دولت جیلوں میں ان کے لیے ہر وہ سہولت فراہم کرتی جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شیراز نے اس کے ساتھ میدان عبور کر کے راہ داری کی سیڑھیوں پاؤں رکھا۔

"مگر ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟" شیراز نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم استاد رؤف کے ساتھ بیرک میں بند ہو۔ کیوں؟"

"کیا مطلب؟" شیراز نے حیرت سے کہا۔

"بھائی......وہ تو اپنی بیرک میں کسی چوتھے آدمی کا داخلہ پسند ہی نہیں کرتا۔ دوسرے ہی دن بھگا دیتا ہے۔ تم پہلے آدمی ہو جو اتنے دن سے اس کے ساتھ ہو۔"

"استاد کتنے عرصے سے یہاں ہے؟" شیراز نے اس کا سوال گول کر دیا۔

"دو سال سے......"

"کس جرم میں؟"

"سنا ہے اس نے ایک کونسلر اور اس کے چار آدمیوں کی گردنیں کاٹ ڈالی تھیں۔"

"کیا؟" ٹھٹک کر شیراز رک گیا۔

"چلتے رہو۔ کھڑے ہونے کی اجازت نہیں ہے تم کو۔" شہاب نے اس کا بازو تھام کر آگے کو دھکیلا۔

"مگر کیوں؟" شیراز نے حیرت کے سمندر سے سر ابھارا۔

"ہو گا کوئی چکر۔ یہ بات بھی میں نے ایک دن رانا صاحب کے منہ سے سن لی تھی ورنہ تو جیل کا کوئی شخص استاد رؤف کے جرم سے واقف ہی نہیں ہے۔"

"ہوں......" شیراز نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو استاد کے خلاف ثبوت اور گواہیاں تو بہت زوردار ہوئی ہوں گی۔"

"اللہ جانے بھائی......ویسے جس قسم کا استاد آدمی ہے اس کے خلاف کوئی گواہی دے کر موت ہی کو آواز دے گا۔"

وہ چلتے چلتے بیرک تک آ گئے۔

شہاب پیچھے رک گیا۔ اسے دیکھ کر سنتری نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

استاد دیوار سے ٹیک لگائے اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ظہور اور امتیاز ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ سیدھا جا کر استاد کے پاس چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"لے بات کر ماسٹر......ابھی نجم کا فون آیا تھا۔" استاد نے اسے موبائل تھما دیا۔

"نجم کا فون......؟" اس نے موبائل لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں......ابھی کوئی پندرہ منٹ پہلے......"

"کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے جیب سے نجم کا کارڈ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا تجھ سے بات کرنی ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے زیادہ

کریدا نہیں۔"

شیراز نے نجم سے رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو......" دوسری جانب سے نجم کی آواز ابھری۔

"ہیلو نجم...... میں ہوں شیراز۔"

"ارے شیراز...... میری جان۔ کہاں تھے تم......استاد بتا رہا تھا تم نے لائبریری جوائن کر لی ہے۔"

"ہاں یار......سب استاد کی مہربانی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتا تھا۔ اب وقت اچھا گزر جائے گا۔"

"ہاں......یہ تو ہے......اچھا سنو...... میں نے تمہیں ایک خاص وجہ سے فون کیا تھا۔"

"ہاں ہاں......بولو......" شیراز نے توجہ اس کی آواز پر مرکوز کر دی۔

"تمہارے گھر کے پتے پر ارجنٹ میل سے ایک خط آیا ہے۔"

"کہاں سے؟" شیراز چونکا۔

"مری سینی ٹوریم سے۔"

"مری سینی ٹوریم......" پہلے سے زیادہ بری طرح شیراز چونکا۔

"ہاں......" نجم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔" میں نے تمہاری اجازت کے بغیر خط کھول لیا۔"

"یہ بتاؤ اس میں لکھا کیا ہے؟" شیراز بے چین سا ہو گیا۔

"وہاں کوئی صاحب داخل ہیں محمود اصغر......"

"ہاں ہاں......آگے کہو۔"

"ان کے سالانہ واجبات کی ادائیگی کے لیے کہا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کی بگڑتی ہوئی حالت کا بتایا گیا ہے۔"

"یعنی......"

"کیس سنبھلتے سنبھلتے بگڑ گیا ہے۔ علاج کے لیے سپیشل بورڈ آف ڈاکٹرز کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے لیے اخراجات......"

"اخراجات کو گولی مارو نجم...... میرے یار...... فوری طور پر ایک کام کرو۔" شیراز کی آواز اضطراب کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔

"کہو کہو......" نجم نے اس کی بے تابی محسوس کر لی۔

"تم فوری طور پر میری خاطر سینی ٹوریم چلے جاؤ۔ مجھ سے چیک سائن کرایا ہوتا تو مزید وقت نہ ضائع ہوتا تمہارا۔ تم جتنی رقم وہاں درکار ہے جمع کرا کے خود محمود اصغر سے مل کر آؤ۔ میری ساری دولت بھی کام آ جائے تو پرواہ مت کرنا۔ محمود اصغر کو بچ جانا چاہئے ہر قیمت پر۔"

"میں تمہاری بے تابی سمجھ رہا ہوں مگر یہ صاحب تمہارے کیا لگتے ہیں؟ شیراز...... میں پوچھ سکتا ہوں۔"

"یہ سب بعد میں نجم۔ بس یہ سمجھ لو کہ محمود اصغر کے ساتھ میری زندگی کی ڈور بندھی ہے۔"

"او کے......چیک میں واپس آ کر سائن کراؤں گا۔ تم فکر مت کرو میں آج شام ہی روانہ ہو رہا ہوں مری۔ اور کچھ۔"

"بس......ہر قسم کی تسلی کے بعد وہاں سے واپس آنا نجم۔ اگر محمود اصغر کے سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی تو میں......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"حوصلہ رکھو یار۔ کیا ہوا۔ میں نے کہا ناں میں آج ہی جا رہا ہوں۔ اللہ کرم کرے گا۔ وہاں سے تمہیں فون پر صورت حال سے آگاہ کروں گا۔"

"ہاں......میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ کوتاہی نہ کرنا اور ہو سکے تو محمود اصغر کی مجھ سے بات ضرور کرانا۔"

"کوشش کروں گا۔ تم فکر مت کرو۔ او کے......اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" شیراز نے دوسری جانب سے رابطہ ختم ہونے پر خود بھی موبائل آف کر دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے بادل خاصے گہرے لگ رہے تھے۔

"کیا بات ہے ماسٹر...... کوئی بری خبر تھی کیا؟" استاد نے اس کو غور سے دیکھا۔

"آں......" چونک کر شیراز نے سر اٹھایا۔ استاد سے نظریں ملیں تو ایک گہری سانس لے کر اس نے موبائل استاد کو تھما دیا۔ "ہاں استاد......بُری خبر تھی۔"

"کس کے بارے میں؟" استاد اب بھی اسے گھور رہا تھا۔

"محمود اصغر کے بارے میں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے وہ؟"

"بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا۔" شیراز نے سر جھکا لیا اور ناخن سے زمین کھرچنے لگا۔ یوں جیسے ماضی کی راکھ کرید رہا ہو۔

"بیمار ہے کیا؟" استاد چھوٹے چھوٹے فقروں سے کہانی سمجھ رہا تھا۔

"بہت......"

"سینی ٹوریم میں ہے تو کیا......"

"ہاں استاد۔ وہ تپ دق کی آخری سٹیج پر ہے۔" شیراز کا لہجہ بے پناہ اداس ہو گیا۔

"تیرا کیا لگتا ہے؟"

"میرا......" شیراز کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "کچھ بھی نہیں اور...... سب کچھ......"

"مطلب؟" استاد کے لہجے میں گھمبیر پن نمایاں تھا۔

"استاد......" شیراز نے یاس آلود نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ظہور اور امتیاز خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ "محمود اصغر سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر...... اس نے مجھے انسانیت سے روشناس کرایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ میرا سارا علم' میری ساری زندگی کا تجربہ اس کے سامنے پانی بن کر بہہ گیا۔"

"کھل کر بات کر ماسٹر...... یہ داستان بھی سنا ڈال۔" استاد نے دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں پسار دیئے۔ "لگتا ہے تیرے پاس دلچسپ کہانیوں کا پٹارا ہے۔ اس پٹارے میں سے یہ افسانہ بھی نکال۔ سنا...... ایسی کہانیاں جگر چھیدتی' دل دکھاتی ہیں۔ ایسا درد دیتی ہیں جس کی لذت نہ رونے دیتی ہے نہ ہنسنے دیتی ہے۔ بول...... کھل کر بول...... رات اسی کہانی کے سرہانے کرنے دے۔"

شیراز نے غور سے استاد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کے رنگ چھوٹنے لگے۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر زنداں میں اس کی آواز یوں تیرنے لگی جیسے سرد علاقوں کے پرندے واپس اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے ہوں۔ استاد' ظہور اور امتیاز اپنی اپنی جگہ خاموش بت بنے ان پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں سن رہے تھے۔





"میں جس اکیڈمی میں کل تک انگلش کا پروفیسر تھا' اس میں ایک لڑکا محمود اصغر باغ کے مالی کے ہیلپر کے طور پر کام کرتا تھا۔ عمر اس کی گیارہ بارہ سال تھی۔ قانونی طور پر وہ نوکری نہیں کر سکتا تھا مگر ہمارے، خاص طور پر پرائیوٹ اداروں میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کم سے کم معاوضے پر زیادہ سے زیادہ کام کس طرح لیا جا سکتا ہے۔ آسامیوں پر بوڑھے یا کم سن افراد کو ان کی مجبوریوں کے مول تول کے بعد ملازم رکھا جاتا ہے اور ان سے وہ مشقت لی جاتی ہے جو نہ ان کے جسم ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں' نہ ان کی ذہنی سطح اس تک برابر ہوتی ہے۔ محمود اصغر کہنے کو مالی کا ہیلپر تھا اور اصولی طور پر اس کا کام صرف باغیچے سے متعلق کاموں تک محدود تھا مگر انتظامیہ اس سے کمروں کی صفائی' چائے سگریٹ منگوانے' گھروں کے چھوٹے موٹے کام کرانے تک سے گریز نہ کرتی تھی۔ اس معاملے میں ہم ساتھی اساتذہ اور دو ایک بار پرنسپل سے بھی میری بات ہوئی مگر کوئی بھی اس دبلے پتلے' خوبصورت نقوش کے مالک زردی مائل سفید رنگ والے محمود اصغر کو معاف کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ اس کے جثے کے مقابلے میں دس گنا زیادہ کام لیتے مگر وہ اف نہ کرتا۔ ہاں...... ایک بات پر وہ کبھی سمجھوتہ نہ کرتا۔ وہ تھی ظہر کی نماز۔ اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک تھی۔ وہ ساڑھے سات بجے اکیڈمی آ جاتا۔ ٹھیک ظہر کی اذان کے وقت وہ تمام کام چھوڑ کر نماز پڑھنے چلا جاتا۔ ایک گھنٹے بعد وہ لوٹ کر آتا اور دوبارہ کام میں جت جاتا۔ چار بجے اس کی چھٹی کا وقت تھا مگر بعض اوقات پانچ بجے تک اکیڈمی کے کاموں میں الجھا رہتا۔ یہ میرے ساتھی اساتذہ کی مہربانی تھی کہ وہ اسے نماز کے لیے جانے سے کبھی نہ روکتے۔ شاید ان کے دل میں ابھی خوف خدا کی کوئی [illegible] باقی تھی۔ بہر حال...... یہ طے تھا کہ ظہر کی اذان ہوتے ہی محمود اصغر تمام کام چھوڑ کر نماز کے لیے چلا جاتا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد لوٹ آتا۔

اس کا گھر اکیڈمی سے پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ایک کمرے، چھوٹے سے دالان دو چار پائیوں کے صحن پر مشتمل اس گھر میں اس کی ٹی بی زدہ ماں رہتی تھی اور وہ خود...... باپ کو مر۔ چھ سال ہو چکے تھے۔ یتیم ہونے کے بعد وہ محنت مشقت کر کے ماں کو یوں پال رہا تھا جیسے وہ خود ما ہو اور چھوٹی سی بیٹی کو پال رہا ہو۔ اکیڈمی کا مالی اس کا محلے دار تھا۔ اس نے پرنسپل کی منت سماجت کے اسے وہاں نوکر کرا دیا اور یوں وہ دو وقت کی روٹی کما رہا تھا۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ وہ ماں کی مہنگ دواؤں پر خرچ کر ڈالتا۔ میں نے بارہا اسے بھنے ہوئے چنے اور بھٹے کھا کر دوپہر کا کھانا گول کر۔ دیکھا۔ کبھی میں نے اس کی مدد بھی کرنا چاہی تو اس نے مسکرا کر انکار کر دیا اور استاد...... میں تمہیں کیاں بتاؤں۔ وہ جب مسکراتا تھا تو یوں لگتا تھا کائنات میں قوس قزح بکھر گئی ہو۔ اس کی معصو زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر پہلی بار تو میں متحیر اور مسحور رہ گیا کہ کتنی ہی دیر تک مجھے حسن ا خوبصورتی میں لپٹی معصومیت کی تفسیر دکھائی دیتی رہی۔

وہ بہت کم مسکراتا تھا استاد۔ مگر جب کبھی میں اسے مسکراتے دیکھتا تو سمجھ میں آتا کہ فرشت مسکراتے ہوں گے تو ایسے ہی دکھائی دیتے ہوں گے۔ میری مدد لینے سے اس نے یہ کہہ کر انکار کر د کہ وہ خیرات، صدقے اور زکوۃ کے پیسوں پر ماں کو نہیں پالتا۔ میں اس چھوٹی سی عمر میں اس کے سے ایسی بات سن کر خجل سا ہو گیا مگر اندر مجھے خوشی کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ مجھے اس کا جواب اچھا لگا۔ میں نے اس کی ماں کا علاج کسی اچھے ہسپتال میں کرانے کی بھی پیش کش کی مگر...... اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہاں کے اخراجات اس کی بساط سے باہر ہوں گے۔ میں نے اسے قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نرمی سے انکار کرتا رہا۔ ہاں...... میری روز روز کی بحث اور دلیلوں کے بعد اس نے اتنی ہامی ضرور بھر لی کہ اگر کبھی اسے ماں کے علاج کے سلسلے میں ایسی ضرورت آن پڑی جو اس کے لیے مشکل کا باعث بنی تو وہ صرف مجھے بتائے گا۔

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے لیے کسی اور سے مدد کیوں نہیں لیتا۔ اس کہا۔ ”سر...... میرے والد نے مرتے وقت مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنی ماں کو کبھی حرام کمائی لا کر نہیں دوں گا۔ کبھی اس کو کسی دوسرے کے ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھنے دوں گا اور کبھی اپنی زندگی میں اس پر کسی غیر کی کمائی خرچ نہیں ہونے دوں گا۔

یہی وجہ ہے سر...... میں دن رات کام کر کے اسے اپنی محدود آمدنی میں زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے سر...... اگر ماں کی جگہ میں خود بیمار ہوتا تو کبھی کسی سے مدد لینے کو عار نہ سمجھتا مگر اپنی ماں پر میں کسی دوسرے کا ایک پیسہ بھی خرچ ہونے دوں یہ میرے مسلک میں حرام تھ

چکا ہے۔“

استاد...... تم یقین کرو۔ یہ بات کہنے کے بعد جب اس نے اپنی من موہ لینے والی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا تو میرے چہرے پر حیرت، آنکھوں میں نمی اور دل میں اس کے لیے رشک کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! محمود اصغر سے میرا کوئی خون کا رشتہ ہوتا۔ تاہم اس دن کے بعد میں نے اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی اور بیٹے کی طرح عزیز ہوتا چلا گیا۔ میں اس کے لیے کچھ سوچنے لگا۔ جس قسم کی وہ کڑی نوکری کر رہا تھا۔ اس میں ترقی یا آسانی کی گنجائش نہ تھی۔ میں غور کرنے لگا کہ اسے کسی دوسری جگہ ملازمت دلوا دوں۔ جہاں اسے کم مشقت کرنی پڑے اور پیسے معقول مل جائیں۔

اس سلسلے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ بن گئی کہ محمود اصغر صرف پانچ جماعت تک پڑھا ہوا تھا۔ اس کی عمر کو تو میں کسی نہ کسی طرح سمیٹ لیتا مگر تعلیم کی اس کمی نے مجھے اپنی ممکنہ کوششوں میں سُست کر دیا۔ بہر حال میں اپنی سعی میں لگا رہا اور اسے بتائے بغیر اس کے لیے بہتر ملازمت تلاش کرتا رہا۔

انہی دنوں وہ ایک دم بیمار ہو گیا۔ بلغم زدہ کھانسی نے اسے چار دن میں آدھا کر دیا۔ پہلے ہی دھان پان تھا اب اور بھی کمزور ہو گیا۔ بخار اور کھانسی کے عالم میں بھی وہ اپنی ڈیوٹی پر آتا رہا اور...... ظہر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی نماز کو روانگی کا معمول اب بھی قائم تھا۔

میں اپنی برین واشنگ بھی کر دوں تو اس دن کو نہیں بھول سکتا استاد...... جب میں اپنا پیریڈ لینے اکیڈمی پہنچا اور مجھے پرنسپل کے کمرے میں محمود اصغر اور اکیڈمی کے دونوں چپراسی دکھائی دیئے۔ ایک دو پروفیسر بھی وہاں موجود تھے اور پرنسپل پریشان، گھبرائے ہوئے محمود اصغر پر کسی پاگل کتے کی طرح برس رہا تھا۔

”تو آج تک تم ہمیں بے وقوف بناتے رہے۔ الو کے پٹھے۔ جھوٹ بولتے رہے، ہم سب سے۔ تمہیں مذہب کے نام پر فریب کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ تمہارے دل میں خوفِ خدا نام کی کوئی شے نہیں ہے کیا؟“

میں رہ نہ سکا اور تیزی سے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”کیا ہوا شیخ صاحب؟“ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

مجھے دیکھتے ہی محمود اصغر کے اڑے ہوئے رنگ یکا یک لوٹ آئے۔ ایک تسلی، ایک دلاسہ، ایک اطمینان کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ کانپتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا اور میرے قریب آ کر رک گیا۔

"دیکھئے شیراز صاحب...... زمانہ کس قدر مکار اور عیار ہو گیا ہے۔ اس مینسے کی عمر دیکھئے اور اس کی حرکت دیکھئے۔ آپ سنیں گے تو اسے قتل ہی کر دیں گے۔"

"ہوا کیا سر......؟ کچھ پتہ تو چلے۔" میں نے محمود اصغر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا دھان پان جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"ہوا یہ ہے کہ یہ آج تک ایک سال سے ہم سب کو دھوکا دے رہا ہے اور ہم اس کے ہاتھوں الو بنے ہوئے ہیں۔" پرنسپل نے نفرت سے کہا۔

"یعنی......" میں نے باقی لوگوں کی طنزیہ نظروں کا جائزہ لیا۔

"یہ ہر روز ظہر کی اذان ہوتے ہی یہ کہہ کر ایک گھنٹے کے لیے غائب ہو جاتا ہے کہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔"

"جی ہاں...... ساری اکیڈمی اس بات سے باخبر ہے۔"

"مگر آج ہماری اکیڈمی کے ان دونوں چپراسیوں نے بتایا ہے کہ یہ ظہر کی نماز پڑھنے کے بہانے روزانہ اپنے گھر چلا جاتا ہے اور نواب زادہ ایک گھنٹے بعد ملاں بنا لوٹ آتا ہے کہ نماز پڑھ کر آیا ہے جبکہ اس نے کبھی مسجد کی شکل نہیں دیکھی۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے محمود اصغر کی طرف دیکھا جو لرزتے ن کے ساتھ سر جھکائے فرش کو گھور رہا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے محمود اصغر؟" میں نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑا۔

تب...... اس نے دھیرے سے سر اٹھایا استاد...... اس کی شفاف آنکھوں میں مجھے کہیں جھوٹ کی سیاہی نہ ملی۔ اس نے مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا اور پھر پرنسپل کی جانب......

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا سر...... کہ میں مسجد میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" اس کے لبوں سے بڑی اطمینان بھری آواز نکلی۔

میں نے محسوس کیا استاد...... اس کے چہرے سے گھبراہٹ ختم ہو گئی۔ اس کے لرزیدہ جسم میں ٹھہراؤ آ گیا اور وہ یوں بولا جیسے سقراط زہر کے پیالے کو سامنے دیکھ کر بے خوف ہو گیا ہو۔

"تم نے یہ بھی تو کبھی نہیں کہا کہ تم اپنے گھر جا رہے ہو۔" پرنسپل چیخ پڑا۔

"میں نے نماز کے لیے جانے کا کہا اور ہمیشہ نماز پڑھ کر واپس آیا ہوں سر......" وہ اسی بے خوفی سے بولا۔

اس کی بات میں وزن تھا۔ دلیل بے بنیاد نہیں تھی مگر پرنسپل نے چغل خور چپراسیوں کی شکایت

اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔

"بکواس مت کرو۔ تم نے مسلسل ایک سال تک ہم پڑھے لکھے لوگوں کو جاہل اور بے وقوف بنا رکھا۔"

"محمود اصغر......" میں نے گھما کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ "میری طرف دیکھو۔ تم روزانہ ،ہم کو اپنے گھر کیوں جاتے رہے یہ کہہ کر کہ تم نماز کے لیے جا رہے ہو۔"

"میری ماں بیمار ہے سر......" محمود اصغر نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی معصومیت کا رنگ اور نکھر گیا۔ "دوپہر کو میں اسے دوا پلانے اور کھانا کھلانے نہ جاؤں تو وہ مر جائے ا۔ بھوک اور دوا کا ناغہ مل کر اس کے سانس روک دیں گے سر......"

"مگر یہ بات تم بتا بھی تو سکتے تھے۔ چھپانے کا کیا مطلب؟"

"برا نہ مانئے گا سر...... اس جگہ مجھے سات کے بجائے نو نو گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ آرام کا لمحہ میسر نہیں۔ میرا کام صرف مالی کے ہیلپر کا ہے مگر میں اس اکیڈمی میں چپراسی سے لے کر قاصد کے سارے کام کرتا ہوں۔ اگر میں ایک گھنٹے کی چھٹی مانگ کر روزانہ گھر جانا چاہتا تو کون جانے ا۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

میں اس کی بات پر لاجواب ہو گیا۔ نگاہیں چرا لیں میں نے۔

"اور پھر...... ایک اور بات بھی تھی سر...... جسے سوچ کر میں نے کبھی خود کو مجرم خیال نہیں یا؟"

"وہ بھی فرما ڈالئے مولانا!" پرنسپل نے دخل دیتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میں نے سوچا سر...... ماں کی خدمت سے بڑھ کر کون سی نماز ہوگی جو اللہ کے حضور قبول ہو ا۔ اس نے ایک بیٹے کو اس لیے زندگی دی ہمت دی کہ وہ اپنی ماں کی بیماری میں اس کی خدمت کے۔ اگر کبھی میں نماز چھوڑ دوں۔ نماز مجھ سے چھوٹ جائے اور میں ماں کو دوا پلاؤں۔ اسے کھانا لاؤں تو اللہ مجھ سے ناراض نہیں ہوگا لیکن اگر میں نماز پڑھتا رہوں اور میری ماں بھوک کے تڑپتی رہے دوا کے بغیر اذیت اٹھاتی رہے تو وہ مجھے ضرور اپنی ناراضگی کے حوالے کر دے گا۔ لماز میری ماں کی خدمت تے ہے سر...... میری نماز سے میری ماں کی خدمت زیادہ مقبول فعل لماز میں وضو ناقص رہ گیا تو نماز گئی لیکن ماں کی خدمت میں میرا خلوصِ نیت شامل ہو تو اس کے نے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بڑی بڑی باتیں مت کرو۔" پرنسپل نے اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے بولنا چاہا مگر میں نے

ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"شیخ صاحب...... پلیز...... کچھ مت کہیے۔ ایسا نہ ہو آپ کا کوئی لفظ' کوئی فقرہ گرفت میں آ جائے۔ اس نے جو کچھ کیا' جس نیت سے کیا اسے دیکھیے۔ ان بدتمیزوں کی شکایت کو نہ دیکھیے شکوے کو دیکھیے جو اللہ کی رحمت کو آپ سے ہو رہا ہے۔ نمازیوں سے مسجدیں بھری پڑی صاحب۔ مگر کتنے بیٹے ہیں جو اپنی ماؤں کو موت کے منہ سے چھین لانے کے لیے خدمت کر ر محنت کر رہے ہیں۔ آپ اور مجھ جیسے نا سمجھوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بن رہے ہیں۔ پلیز...... اس بچے کو بے شک ملازمت سے نکال دیجیے مگر اسے کچھ مت کہیے۔ یہی ہم سب کے حق میں ہو گا۔ یہاں بھی اور وہاں بھی......" میں نے جو اشارہ کیا۔ پرنسپل کی سمجھ میں آ گیا۔ اللہ تے عقل اسے لوٹا دی۔ وہ خجل ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اشارے سے دونوں چپراسیوں کو جانے کو کہا کے ساتھ ہی اساتذہ بھی باہر نکل گئے۔

"بہر حال...... اسے ہم سے غلط بیانی نہیں کرنی چاہیے تھی شیراز صاحب۔" پرنسپل شرمندگی مٹانے کے لیے بولا۔

"کوئی غلط بیانی نہیں کی اس نے پرنسپل صاحب۔" میں نے محمود اصغر کے کندھے پر ہاتھ کہا۔ "آپ تک بات غلط انداز میں پہنچی ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بات ختم کیجیے۔ آئندہ اسے محتاط کہیے۔"

"کس بات سے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "پرنسپل صاحب۔ اب تو بات آپ کے علم آ چکی۔ اب تو یہ زیادہ یقین کے ساتھ ظہر کی نماز کے لیے جا سکے گا۔ کیا اس کی نیکی میں آپ حصے نہیں بننا چاہتے۔ اسے آزادی سے گھر جانے اور لوٹ آنے کی اجازت دے کر۔"

"ضرور......" پرنسپل نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں کسی شکوے شکایت کے اسے روزانہ گھر جانے کی اجازت دیتا ہوں۔"

"شکریہ سر......" محمود اصغر نے آہستہ سے کہا اور پھر میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔

استاد...... اس کے لبوں پر وہی خوبصورت' فرشتوں جیسی زندہ مسکراہٹ تھی جس نے مجھے گرویدہ بنا دیا تھا۔

"آؤ چلیں۔" میں نے اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "شکریہ شیخ صاحب۔" میں سر ذرا سا خم کر کے پرنسپل کی جانب دیکھا اور اسے ساتھ لیے ہوئے باہر نکل آیا۔

دور کسی مسجد سے ظہر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔

"سر......" محمود اصغر نے کاریڈور میں قدم روک لیے۔

میں نے اللہ کی طرف سے اس ازلی و ابدی شہادت پر عجیب سا سکون محسوس کیا۔

"تم جاؤ...... تمہاری نماز کا وقت ہو گیا۔" میں نے باہر جانے والے راستے کی طرف اشارہ تے ہوئے کہا۔

"شکریہ سر......" اس نے بے اختیار میرا ہاتھ چوم لیا۔ پھر دوڑتا ہوا کاریڈور سے نکل گیا۔

میری آنکھوں میں نمی تھی اور اس دن...... میں اپنے اندر کی آواز سے اس قدر بے خود ہو گیا تھا...... میں نے بھی ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کا رخ کر لیا۔

دوسرا دن محمود اصغر کے لیے قیامت لے کر طلوع ہوا۔

اس کی ماں مر گئی۔

اس کے گھر سب سے پہلے میں پہنچا۔

استاد...... میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ محمود اصغر وہاں کس قدر خستہ حالت میں تھا۔ اس کی شفاف والی آنکھیں آبشار بن گئی تھیں۔ دبلے پتلے نستعلیق چہرے پر بے رونقی نے ڈیرے ڈال رکھے وہ ایک ہی رات میں برسوں کا مریض نظر آنے لگا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ بلکتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چمٹ کر یوں رویا کہ کیا کوئی ساون بھادوں برسا میں ایک انسان تھا۔ محمود اصغر کا ہمزاد تھا۔ کیسے خاموش رہتا۔ اسے دلاسہ دیتے دیتے خود بھی رو

پھر اکیڈمی کا پرنسپل چند اساتذہ کے ساتھ آیا۔ اسے اللہ نے کیسی عقل دی تھی استاد کہ اس نے ے منع کرنے کے باوجود محمود اصغر کی ماں کی تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات خود کرنا چاہے مگر محمود نے اس حال میں بھی کسی کو خرچ نہ کرنے دیا۔ اس نے ایک پوٹلی مجھے تھما دی جس میں اتنے پے تھے جو اس کی ماں کی تجہیز و تکفین کے لیے کافی تھے۔ محمود اصغر تو اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ وہ پائی پر کفن زدہ ماں کو دیکھتا اور سر پیٹ لیتا۔ بار بار ہوش اس کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ میں اور کچھ کر ن کا صرف اسی کو سنبھالتا رہا۔ محلے والے بہت اچھے تھے۔ انہوں نے ہر قسم کا تعاون کیا اور شام ے بعد محمود اصغر کی ماں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

قبرستان سے واپسی پر محمود اصغر لپک لپک کر ماں کی قبر کی طرف جاتا رہا اور میں اسے بانہوں ں لیے گھر کی جانب کھینچتا رہا۔

گھر میں داخل ہوئے تو وہ ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ ماں کی خالی چارپائی سے جا لپٹا کی آہ وزاری نے پتھروں کو بھی موم کر دیا ہو گا استاد ...... اس لیے کہ میں نے اپنی آنکھو پرنسپل اور ساتھی اساتذہ کو بھی آبدیدہ دیکھا۔

"شیراز صاحب ...... آپ محمود کو سنبھالیے۔ مجھ سے اب اس کی حالت دیکھی نہیں مجھے اجازت دیجیے۔" پرنسپل نے کانپتے لبوں سے کہا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے اندر اب بھی اس کے سخت الفاظ کا نوحہ گونج رہا ہے جو گزشتہ د نے محمود اصغر کے لیے استعمال کیے تھے۔ اسے دنیا کے ساتھ آخرت کا ادراک بھی ہو رہا تھا۔

اساتذہ اور زیادہ تر محلے دار بھی رخصت ہو گئے۔ دو تین بڑی بوڑھیوں نے محمود اصغر کو اپنے ہاں جانا چاہا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی ماں کے خالی بستر پر ہاتھ پھیرتا اور روتا رہا۔ ماں کو رہا اور مجھے رلاتا رہا۔

رات کے دس بج گئے۔

گھر میں اب صرف میں اور محمود اصغر موجود تھے' سب لوگ جا چکے تھے۔ محلے والے کھا خوان رکھ گئے تھے جسے ابھی تک ہم دونوں میں سے کسی نے رومال ہٹا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ محمود آنکھیں موندے فرش پر یوں بیٹھا تھا کہ اس کا سر ماں کی چارپائی کی پٹی پر ٹکا تھا اور دونوں بازو نے بستر پر پھیلا رکھے تھے۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھانستا اور کراہ کر خاموش ہو جاتا۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ مزید کچھ دیر اسی حالت میں رہا تو کوئی بڑا نقصان نہ ہ کرسی سے اٹھ کر میں اس کے قریب آیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"محمود اصغر ......" الفاظ میرے منہ ہی میں رہ گئے۔ اس کا ماتھا آگ کی طرح جل رہا

"محمود اصغر ......" میں نے گھبرا کر اسے دوبارہ پکارا جواب میں وہ ایک بار اور کھانسا پھر کراہ کر رہ گیا۔

"محمود اصغر ......" میں نے تیزی سے اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ وہ بے سدھ پڑا رہا۔ مجھے ہوا کہ وہ تو نجانے کب کا حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ کھانسی کی شدت اسے آواز نکالنے پر مجبور کر تھی' ورنہ تو وہ غشی کے عالم میں تھا۔

میں نے بستر پر پڑی چادر میں اس کا کانپتا ہوا بدن لپیٹا۔ اسے بانہوں میں اٹھایا اور گھر نکل آیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں اس کے گھر اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ اسے گاڑی میں ڈال کر میں ہو

بھاگ ہاسپٹل کی ایمرجنسی میں پہنچا اور اسے ڈاکٹروں کے سپرد کر کے بے تابی سے ٹہلنے لگا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ بلوایا۔ میں اس کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔

محمود اصغر اسٹریچر پر پڑا تھا جسے دو نرسیں لے کر کمرے سے نکل رہی تھیں۔ میں نے ان کو راستہ دیا اور بے ہوش یا نیند میں گم محمود اصغر کے زرد چہرے کو دیکھ کر میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"آئیے جناب ......" ڈاکٹر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ اسٹریچر کمرے سے باہر جا چکا تھا اور مجھے ساتھ لے کر آنے والی نرس میرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ ایک مضطرب سانس لے کر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بچہ کب سے بیمار ہے؟" ڈاکٹر نے سامنے پڑے ایکسرے کو ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک آدھ دن پہلے اسے کھانسی ہوئی ڈاکٹر صاحب۔ آج صبح اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بس اسی صدمے کے اثر سے اس کی یہ حالت ہو گئی۔" میں نے وہ بتایا جس کا مجھے علم تھا۔"

"غلط ......" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا اور ایکسرے میز پر ڈال دیا۔

"جی ......" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ایکسرے رپورٹ اور دیگر ٹیسٹ یہ بتاتے ہیں کہ بچہ ٹی بی کی آخری سٹیج پر ہے۔"

"کیا؟" حیرت کے ساتھ ساتھ خوف سے آلودہ آواز نے مجھے خود ڈرا دیا۔

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ "اس کے دونوں پھیپھڑے آدھے سے زیادہ ختم ہو چکے ہیں۔ یہ اب تک چل پھر کیسے رہا ہے ہم لوگ حیران ہیں' زندہ کیسے ہے ہمیں اس پر حیرت ہے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب ......" میں نے کہنا چاہا۔

"لاپرواہی کی حد ہوتی ہے صاحب۔ آپ کو اپنی اولاد کے بارے میں اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کیوں اور کس حد تک کس بیماری کا شکار ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

وہ محمود اصغر کو میرا بیٹا سمجھ رہا تھا۔ میں نے لبوں کو حرکت دینا چاہی کہ اس کی یہ غلط فہمی دور کر دوں مگر بے اختیار رک گیا۔ میرا جی نہ چاہا کہ محمود اصغر سے جڑے ہوئے رشتے کو نفی کا زہر پلا دوں۔

"کیا خاندان میں کسی اور کو بھی یہ مرض رہا ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "اس کی والدہ کا انتقال ٹی بی ہی

سے ہوا ہے۔"

"تو آپ کو احتیاط کرنی چاہئے تھی۔ آپ نے بچے اور ماں کو الگ الگ کیوں نہیں رکھا۔ لگ
ہے بچہ مسلسل اپنی ماں کے قریب رہا ہے اور اسی لیے مرض نے اس کے نازک اور کم تر قوتِ مدافعت
کے حامل جسم کو ہڑپ کرلیا۔"

"جی......" میں نے ندامت سے سر جھکا کر رہ گیا جیسے یہ میرا ہی قصور ہو۔

اب میں اسے کیا بتاتا کہ محمود اصغر اپنی ماں کے سانس کے ساتھ سانس لیتا تھا۔ اسے اس
کوئی غرض نہیں تھی کہ ماں کی بیماری کے جان لیوا جراثیم اس پر کس بُری طرح حاوی ہو رہے ہیں۔
ہر روز تازہ وضو سے نماز ادا کرتا تھا۔ اپنی ماں کی خدمت کی نماز۔ اس کی تیمارداری کی نماز۔ اس کو زندہ
رکھنے کی کوشش کی نماز۔ محنت کا وضو اور خدمت کی نماز...... اس کے ایمان کا بنیادی جزو بن چکے تھے۔

"اب اگر آپ میری بات مانیں تو فوری طور پر بچے کو مری سینی ٹوریم لے جائیں۔ پانچ
پرسنٹ سے بھی کم چانسز ہیں کہ یہ بچ جائے' مگر اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہم ڈاکٹروں کا شیوہ نہیں
ہوتا۔ وہاں جتنا عرصہ بھی یہ زندہ رہے گا مرض کی اذیت سے بچا رہے گا۔ دو تین چار سال میں صحت
یاب ہو گیا تو سمجھئے گا کہ اس کی زندگی باقی تھی اور اگر نہ بچ سکا تو کم از کم ہر وقت کے درد اور تکلیف سے
محفوظ رہے گا۔"

"جی......" میں اب بھی اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ بچے کی فائل ہے۔ اسی میں میرا ریفرنس لیٹر ہے جو آپ سینی ٹوریم کے ایم ایس کو دیں
گے تو بچے کو فوری طور پر ایڈمٹ کرلیا جائے گا۔" ڈاکٹر نے ایکسرے اور کاغذات سے پُر ایک فائل
ایک بڑے لفافے میں ڈال کر میری طرف بڑھا دی۔

"میرے لہجے کا بُرا نہ مانئے گا مسٹر شیراز......" ڈاکٹر نے پہلی بار ذرا نرم لہجے میں بات
کی۔ "میں نے بچے کی زندگی اور موت کے بارے میں جو صاف صاف گفتگو کی اور جن الفاظ میں کی
اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کو کیس کی نوعیت' اس کے نازک پن اور بچے کی مخدوش حالت کا
احساس ہو سکے اور دوسرے یہ کہ بچے کی اس قدر بُری حالت دیکھ کر مجھے غصہ بھی آ گیا تھا۔ آپ لوگ
آخری سٹیج کے مریض کو ہمارے حوالے کر کے یہ چاہتے ہیں کہ ہم مردے میں جان ڈال دیں جبکہ یہ
صرف قادرِ مطلق کا کام ہے۔ پھر آپ کی لاپرواہی اور غلطیوں کا خمیازہ ہمیں اس وقت آپ کی گالیوں
اور بددعاؤں کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے جب آپ کا مریض ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ آپ تب بھی
اپنی کوتاہی کو الزام نہیں دیتے ہمیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں' ڈاکٹر صاحب۔" میں نے ایک سرد آہ بھی کر کہا۔ "مجھے اپنی کوتاہی کا
احساس ہو رہا ہے۔"

"بہر حال......اب مزید دیر نہ کریں۔ صبح سات بجے کے راؤنڈ کے بعد آپ بچے کو ڈسچارج
مری لے جائیے۔ وِش یو گڈ لک۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ

"نرس۔ ان کو بچے کے پاس لے جاؤ۔" ڈاکٹر نے نرس کو حکم دیا اور وہ مجھے ساتھ لے کر وارڈ
طرف چل دی۔

محمود اصغر بستر پر چت کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں ایک دم ہی ابھر آئی
ں۔ اس کے سرہانے کھڑی نرس اس کے ہونٹوں سے رس آنے والے خون کو صاف کر کے رُوئی
ے باسکٹ میں پھینک رہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچ کر رک گیا اور درد بھری نظروں سے
تکنے لگا۔

استاد...... اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے محمود اصغر واقعی میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ میرا بیٹا
ی اولاد ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ اسے ڈرپ لگا دی گئی تھی اور اسی میں اس
طاقت کے انجکشن دے کر غذا کی کمی پوری کی جا رہی تھی۔

"اگر بچے کو ہوش آ جائے تو مجھے بلوا لیجئے گا۔" نرس نے رُوئی کا ایک چھوٹا پیکٹ مجھے تھما کر
میں وہاں ٹیبل پر موجود ہوں اور اس رُوئی سے بچے کے ہونٹوں سے رسنے والا خون صاف
تے رہیے۔"

"نرس۔" میں نے اسے جاتا دیکھ کر روکا۔

"یس......" وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"یہ خون......" میں نے پوچھنا چاہا۔

"بچہ ٹی بی کی آخری سٹیج پر ہے جی۔ پھیپھڑے کٹ کٹ کر یونہی خون اگلتے ہیں۔" وہ جیسے
ی کوئی بات کہہ کر چل دی۔ میں نے ایک بار پھر خوفزدہ نظروں سے محمود اصغر کو دیکھا۔ پھر تیزی
آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے بہہ آنے والا خون صاف کرنے لگا۔

رات کے دو بجے تھے جب محمود اصغر کی حالت ذرا سنبھلی۔ خون رسنا بند ہو گیا اور اس نے نیم
ی کے عالم میں آنکھیں کھولیں۔

"محمود اصغر......" میں نے بنچ پر بیٹھے بیٹھے آگے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"سر......" وہ خمار آلود لہجے میں بڑی کمزور آواز میں بولا۔ "میں کیا ہاسپٹل میں
اس نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔

ہاں......" نے پیار سے اس کے زرد گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا ہوا مجھے؟"

"تیز بخار......" میں نے جلدی سے کہا۔ "تمہاری حالت زیادہ ہی خراب ہوگئی تھی
میں تمہیں ہاسپٹل لے آیا۔"

"اور ماں......؟" وہ درد بھرے انداز میں بولا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں کے گوشوا
آنسو ڈھلک پڑے۔

"دیکھو محمود اصغر......" میں نے اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے پیار سے کہا۔ "خود کو
یار...... تم جانتے ہو تمہاری والدہ اب نہیں رہیں۔ تم اتنے سمجھدار ہو کہ تمہیں دلاسہ دینا بیکار ہے
لیے میری درخواست ہے کہ تم اپنے آپ کو خود تسلی دو۔ اپنے دل کو سمجھاؤ۔"

"کیا سمجھاؤں سر......" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "یہ کہ اب میں کبھی ظہر کی نماز
سکوں گا۔ اب کبھی میں راتوں کو جاگ کر اپنی ماں کی خدمت نہ کر سکوں گا۔ یہ کہ اب بھی میں
کو پھولے سانس کے ساتھ گھر میں داخل ہو کر اپنی معذور ماں کا پیشاب اور پاخانہ صاف نہ کر
گا۔ یہ کہ اب میں کبھی اپنی بیمار ماں کی دواؤں کے لیے دن رات محنت نہ کر سکوں گا۔"

"محمود اصغر......" حیرت سے میں نے کہا۔ "کیا تمہاری والدہ معذور تھیں؟"

"ہاں سر...... ان کو بلڈ شوگر تھی۔ ایک بار فالج کا اٹیک ہوا تو پھر بستر سے نہ اٹھیں۔
نے آلیا تو خون تھوکنے لگیں۔"

"اور تم اتنی سی عمر میں اپنی والدہ کے لیے یہ سب کچھ کرتے رہے۔" حیرت کے ساتھ
لہجے میں رشک بھی ابھر آیا۔

"کیا کرتا رہا سر......" وہ اب خاصی حد تک ہوش میں آ چکا تھا۔ "کیا میری جگہ آپ
یا کوئی بھی اور ہوتا تو اپنی بیمار ماں کی ایسی ہی خدمت نہ کرتا۔ میں نے کون سا کوئی الگ کام کر
دکھ صرف یہ ہے کہ اللہ نے مجھے بہت کم وقت دیا کہ میں اپنی جنت کی آبیاری کر پاتا۔"

"نہیں محمود اصغر۔" میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ چوم لیے۔ "تم نے تو جنت کی
ہے۔ آبیاری تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ مگر اب میری ایک بات سُن لو۔" میں نے اس کی آنکھو

آنکھیں ڈال دیں۔

"جی سر......" وہ ان شفاف آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا جن کے گرد چند ہی گھنٹوں میں حلقے نمودار ہو گئے تھے۔

"تم نے اپنا فرض ادا کر لیا۔ اب میری باری ہے۔ میں تمہاری طرح جنت تو خرید نہیں سکتا۔ کوشش کر سکتا ہوں اور مجھ سے وعدہ کرو تم مجھے اس کوشش سے باز نہیں رکھو گے۔"

"میں سمجھا نہیں سر......"

"تمہیں علاج کے لیے ڈاکٹر نے مری سینی ٹوریم میں ایڈمٹ ہونے کو کہا ہے۔"

"مری سینی ٹوریم......" وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

"ہاں......" میں اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ "میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا محمود اصغر۔ کیونکہ چھپایا کمزور لوگوں سے جاتا ہے۔ تم تو لوہے کا جگر اور فولادی یقین رکھتے ہو۔ تم ٹی بی کی آخری سٹیج پر ہو اور تمہارا علاج وہیں ممکن ہے۔"

"الحمد للہ......" بے اختیار محمود اصغر کے لبوں سے نکلا اور...... استاد...... اس کے لبوں پر وہی زندہ، جاندار، فرشتوں والی معصومیت سے بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"محمود اصغر......" میں حیرت زدہ رہ گیا۔ "تم اس قدر مہلک بیماری پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہو۔"

"کیوں نہ کروں سر......" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ "میری ماں کی ایک نشانی میرے پاس ہے ۔ میرا اس سے رشتہ قائم ہے۔ کیا اس احسان پر میں اپنے اللہ کا شکر ادا نہ کروں سر؟"

"محمود اصغر......" خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اس کے ہاتھ جکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کیا سر؟"

"تم پوری ذمے داری اور احتیاط کے ساتھ اپنا علاج کراؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں سر...... میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ مگر یہ یقین میرے اندر جاگزیں ہے سر کہ میں اپنی ماں کی اس نشانی سے کبھی جدا نہیں ہوں گا۔ یہ مرض مرتے دم تک میرے ساتھ رہے گا۔"

"یہ سب میں نہیں جانتا مگر تم کبھی بھی دوا اور علاج سے منہ نہیں موڑو گے۔"

"میں نے وعدہ کر لیا ہے سر...... اور آپ سے کیا ہوا وعدہ تو میں توڑ ہی نہیں سکتا۔"

"شکریہ محمود اصغر ...... شکریہ ......" میں نے اس کے ہاتھ تھپ تھپائے۔ "کچھ بھوک محسوس کر رہے ہوں؟"

"نہیں سر...... بالکل نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم اجازت دو تو میں ایک کپ چائے پی آؤں۔"

"آپ اجازت کیوں مانگ رہے ہیں سر......" وہ شکوے بھرے انداز میں بولا۔

"تم میرے مرشد ہو محمود اصغر ...... تم میرے امام ہو۔ میں تمہارا مرید ہوں۔ تمہارا مقتدی ہوں۔ میں تمہاری جیسی ظہر کی نماز تو نہیں پڑھ سکا۔ چاہتا ہوں' قضا ہی سہی۔ مگر ظہر کی نماز پڑھوں ضرور۔"

میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں پلٹ کر وارڈ کے خارجی دروازے کی طرف چل پڑا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اشکوں پر انگور آ گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا ضبط کے اس کھرنڈ کو کرچ کر پھینک دوں جو میرے اندر کے نمکین لاوے کو ابل پڑنے سے روک رہا تھا۔ پھر ......وارڈ سے باہر آتے ہی کاریڈور میں دیوار سے لگ کر رومال سے منہ چھپائے میں بچوں کی طرح بلک پڑا۔

یہ کون سی محرومی تھی جو مجھے لہو رلا رہی تھی۔ میں اب سمجھ رہا تھا ایک امیر کبیر باپ کا بیٹا جو کبھی بھی جذبات کی گہرائیوں سے ماں کی خدمت اور محبت کے لیے ماں کے قریب نہ ہوا تھا۔ جسے باپ نے رشتوں کا مفہوم اور تقدس اس انداز میں سمجھایا ہی نہ تھا جس انداز میں محمود اصغر کے لیے وہ محترم تھے۔ آج درِدل کے اس الوہی جذبے سے آشنا ہوا تھا جس کی بنیاد فطرت کے عظیم ترین رشتے پر استوار کی گئی تھی۔ ماں اور اولاد کا رشتہ۔ یہ رشتہ اپنے ادراک کے لمحات کو ان اشکوں سے وضو کرا رہا تھا۔ جن میں صرف اور صرف رشک' اعتراف اور ناز چھلکتا تھا۔

واش بیسن پر منہ ہاتھ دھو کر میں ہاسپٹل کی کینٹین پر چلا آیا۔ چائے کے یکے بعد دیگرے دو کپ میرے لیے سکون اور طمانیت کا پیغام لے کر آئے۔

کینٹین سے چلنے لگا تو رسٹ واچ پر وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں نے کینٹین کے ساتھ موجود پی۔سی۔او سے پرنسپل کے گھر فون کیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ وقت بے حد نامناسب ہے مگر میں اب ان رسمیات سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔

"سر...... میں شیراز بول رہا ہوں۔" دوسری جانب سے پرنسپل کی آواز ابھری تو میں نے بتایا۔

"ہاں شیراز صاحب...... بولیے۔ خیریت ہے ناں؟ محمود اصغر کیسا ہے؟"

"ایک بُری خبر ہے سر......" میں نے حتی الامکان آواز کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" پرنسپل نے تیزی سے پوچھا۔

"اسے ٹی بی ہے سر......"

"اوہ گاڈ......" وہ جیسے اچھل پڑا۔ "کہاں ہے اس وقت وہ؟"

جواب میں، میں نے اسے اب تک کی ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

"اور اب مجھے آپ سے چند دن کی رخصت چاہیے سر......" میں نے آخر میں کہا۔

"ضرور ضرور...... آپ صبح ہوتے ہی مری سینی ٹوریم کے لیے روانہ ہو جائیے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی تعاون درکار ہو تو......"

"نہیں سر......" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس آپ دعا کیجئے کہ محمود اصغر بچ جائے۔"

"اللہ اسے صحت دے گا شیراز صاحب...... یہ میری دعا ہی نہیں یقین بھی ہے۔ آپ اطمینان سے جتنے دن وہاں رکنا چاہیں رک سکتے ہیں۔ یہاں کی فکر مت کیجئے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"شکریہ سر......" میں نے ممنونیت سے کہا۔

"شرمندہ مت کیجئے۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" کہہ کر میں نے فون بند کر دیا ور کال کے پیسے ادا کر کے وارڈ کی جانب چل دیا۔

صبح سوا سات بجے میں نے محمود اصغر کو ڈسچارج کرایا۔ گاڑی میں اسے پچھلی سیٹ پر کمبل میں لپیٹ کر لٹایا اور سو جانے کے لیے کہا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ میں نے راستے کے لیے ضروری سامان خریدا۔ ایک جگہ رک کر اسے دودھ اور انڈے کا ناشتہ کرایا۔ ٹینکی فل کرائی اور مری کے لیے روانہ ہو گیا۔ دن کے تین بجے تھے' جب میں نے گاڑی مری سینی ٹوریم کے پارکنگ لاٹ میں روکی۔ وہاں کے ایم۔ ایس نے فائل کے ساتھ جب متعلقہ ڈاکٹر کا ریفرنس لیٹر دیکھا تو ساری ہچر مچر ختم ہو گئی۔ محمود اصغر کو فوراً ایڈمٹ کر لیا گیا۔ اس کے ٹیسٹ شروع ہو گئے اور مجھے اگلے دن آنے کے لیے کہا گیا۔ اس سے پہلے ششماہی واجبات کے لیے نوے ہزار روپے کی ادائیگی کے لیے میں نے ان کے طلب کرنے پر چیک کاٹ دیا۔ وہاں غریب مریضوں کے لیے بے شمار سہولتیں اور واجبات میں معافی کی گنجائش تھی' مگر میں نے محمود اصغر کو اپنا چھوٹا بھائی بتا کر اسے ایک لینڈ لارڈ خاندان کے فرد کی حیثیت سے ایڈمٹ کرایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جو ساری زندگی اپنی ماں کو حلال کی کمائی پر پالتا رہا۔ کسی سے ایک پائی کی امداد کا روادار نہ ہوا۔ اس کا علاج لوگوں کی دی

ہوئی زکوۃ' صدقے اور خیرات پر ہو۔ اس کا علاج میں اپنے گھربار کو بیچ کر بھی اپنے پیسوں سے کرانا چاہتا تھا۔

دوسرے دن جب میں ہوٹل سے سینی ٹوریم پہنچا تو ایم۔ ایس نے مجھے بتایا کہ محمود اصغر کا ٹریٹ منٹ شروع کر دیا گیا ہے۔ ریکوری کے چانسز کم ہیں تاہم بہتر علاج اور دعا سے کوئی بھی معجزہ رونما ہو سکتا ہے۔

"آپ کو ہر چھ ماہ بعد نوے ہزار کی پے منٹ کرنا ہوگی مسٹر شیراز۔" ایم۔ ایس نے واجبات کے سلسلے میں مجھے بتایا۔

"یہ دو چیک اگلی دو ششماہیوں کے لیے ہیں سر......" میں نے ایڈوانس ڈیٹ کے دو چیک کاٹ کر اس کے حوالے کر دیئے جن کی رسید مجھے جاری کر دی گئی۔

"آپ جب چاہیں اپنے بھائی سے ملنے آ سکتے ہیں۔ ہاں' اسے یہاں سے باہر لے جانے کی ہم اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں' ڈاکٹر صاحب۔" میں نے ایم۔ ایس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے لیے آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔"

"شکریہ......" ایم۔ ایس نے مسکرا کر کہا۔ "ہم دوا کریں گے۔ آپ دعا کیجئے۔ اللہ کرم کرے گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ اس کی حفاظت کرے گا ڈاکٹر صاحب۔ وہ جانتا ہے محمود اصغر میرے لیے کس قدر قیمتی ہے۔" میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور اس سے رخصت ہو کر محمود کے کمرے میں آ گیا۔ پرائیوٹ روم میں ہر وہ سہولت موجود تھی جو اسے کسی اعلیٰ رہائش گاہ میں میسر ہو سکتی تھی۔

مریضوں کے سفید لباس میں وہ زعفران کے پھول جیسا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نکھرا ہوا۔ مگر میں جانتا تھا اس کے اس نحیف جسم کے اندر تیزی سے پھیلتی ہوئی موت کا کھیل کس قدر عروج پر ہے۔

میں بہت دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ بار بار اپنی ماں کا ذکر کرنے لگتا۔ ہر بات میں اپنی ماں کی بات نکال لیتا۔ دوپہر کے بعد میں نے اس سے رخصت ہونے کی بات چھیڑی۔

"اب کب آئیں گے سر؟" اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"جب تم کہو۔" میں نے مسکرانا چاہا۔

"جب آپ کو فرصت ہو' سہولت ہو ضرور آئیے گا۔" اس نے گیند میری کورٹ میں ڈال دیا۔ "میں تو ہر روز آپ کا انتظار کروں گا۔"

"میں تمہاری بات یاد رکھوں گا محمود اصغر...... تم بے فکر رہو اور ہاں...... اپنا وعدہ یاد ہے"

"یاد ہے سر......وقت پر دوا اور پوری احتیاط۔"

"بالکل......" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے خط لکھنا۔ فون کرنا۔" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔ پھر پرس سے کچھ بڑے نوٹ کھینچ کر اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

"ان کی کیا ضرورت ہے سر......" وہ بولا۔ "مجھے کون سا لالی پاپ اور آئس کریم کھانی ہے۔"

"وہ دن بھی آئے گا محمود اصغر...... ضرور آئے گا۔ جب تم یہ سب کچھ کھا سکو گے۔ رہی ان پیسوں کی بات تو یہ تمہارے پاس ہونے چاہئیں۔ کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس نے مجھ سے بحث نہیں کی۔

"اچھا...... میں اب چلوں گا۔" میں نے کرسی چھوڑ دی۔

وہ بستر سے اتر کر دروازے تک میرے ساتھ آیا۔

"میں تمہارے لیے ہر وقت دعا کروں گا محمود اصغر...... تم بس علاج میں کوتاہی نہ کرنا۔" میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی محبت کا لفظوں میں جواب نہیں دے سکتا سر...... مگر یقین کیجئے۔ زندگی میں اگر کبھی وقت آیا تو آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ میں یہاں رہوں گا مگر میری روح میری دعائیں آپ سے کبھی دور نہیں رہیں گی۔"

میں اس کی بات پر محض مسکرا کر رہ گیا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اس کا ماتھا چوما اور اس سے ہاتھ ملا کر کمرے سے نکل آیا۔ وہ جب تک مجھے دکھائی دیا ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں دل گرفتہ سا کاریڈور کا موڑ مڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھا تو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا مجھے الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے بمشکل مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو گیٹ سے نکال لے گیا۔

واپس آ کر میں اپنے روزمرہ کے معمولات میں گم ہو گیا' مگر میں نے ایک بات کو اپنے معمولات میں شامل کر لیا۔ میں ہر اتوار کے دن محمود اصغر کو خط لکھا کرتا۔ وہ جواب میں مجھے ہر ماہ صرف ایک خط لکھتا جس میں میرے خطوں کی وصولی کی اطلاع کے ساتھ وہ اپنی خیریت' صحت یابی کی طرف سفر کا

حال اور آخر میں دو فقرے ضرور لکھتا۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے میں اور میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

اگلے ایک سال میں تین مرتبہ میں اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس کی رپورٹیں نیگیٹو تھیں۔ دوا اور احتیاط میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہا تھا مگر اس کا مرض ایسی خطرناک سٹیج پر تھا کہ اسے مزید سے روکنے اور ریکوری کے لیے بہت لمبا عرصہ درکار تھا۔ تیسری مرتبہ میں اس سے مل کر لوٹا تو بھائیوں کی کرم نوازی کا شکار ہو گیا۔ حوالات سے جیل تک آتے آتے دس ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ دوران اس کے کئی خط آئے مگر میں نے کیس میں پھنستے ہی ایک خط اسے لکھ دیا کہ میرے اگلے لکھنے تک وہ مجھے کوئی خط نہ لکھے کیونکہ میں ایک مقدمے میں پھنس گیا ہوں۔ مقدمے کی نوعیت نے اسے نہ لکھی۔ اب یہاں آئے ابھی چند ہی دن ہوئے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی نہ رہا کہ تفصیلی خط لکھ کر خبردار کر سکتا۔ یہ تو نجم کو سینی ٹوریم والوں کا خط ملا تو مجھے خیال آیا کہ اس کا آئندہ کے اخراجات ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

استاد رؤف نے دیوار سے ٹیک لگاتے لگاتے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ خون جیسی لیے ہوئے موٹی موٹی آنکھیں...... جن میں نمی چمک رہی تھی۔

"ماسٹر......" کتنی ہی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی گہرے کنویں میں پتھر گرا ہو۔

شیراز نے اس کی طرف دیکھا۔

"تو تو سرسبز ہے ماسٹر۔ اندر سے سرسبز ہے باہر سے بنجر ضرور ہے۔ اندر سے کھلا ہوا ہے گل گلزار ہے۔"

"نہیں استاد......" شیراز پھیکے سے لہجے میں مسکرا کر بولا۔ "اتنی بڑی بات نہ کہو میرے بارے میں۔ کیا اندر سے ہرے بھرے میرے جیسے ہوتے ہیں؟"

"ہاں ماسٹر......" استاد آگے جھک آیا۔ "تجھ جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھ...... نقب زن وہاں نقب لگاتا ہے جہاں مال ہوتا ہے۔ تیرے رشتے داروں نے تجھ میں نقب لگائی۔ تیرا اعتماد، تیرا بھروسہ، تیرا یقین چرایا۔ دولت تو آنی جانی شے ہے۔ میں جانتا ہوں تجھے دولت جانے کا دکھ نہیں ہے۔ تو بھروسے کا ڈسا ہوا ہے۔ وہ تجھ سے پیار سے سب کچھ چھین لیتے تو تو اف نہ کرتا مگر دھوکے سے انہوں نے تجھے اندر سے لوٹا۔ تیرے اندر کی ہریالی پر بچھو چھوڑ دیئے۔ یہ دکھ تجھے تڑپا رہا ہے۔ ہے ناں؟"

شیراز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ماضی کی یادوں سے ایک دم اس کا چہرہ کملا کر رہ گیا۔

"اندر کی ہریالی کو پانی دینا آتا ہے تجھے ماسٹر...... تو نے محمود اصغر کی شکل میں پانی کے ایک ایسے چشمے کو اپنے گلستان کا راستہ دکھا دیا ہے جو کبھی خشک نہیں ہو پائے گا۔ خشک ہو ہی نہیں سکتا۔ جیتا رہ ماسٹر۔ جیتا رہ...... اب تو تیرے لیے وقت کو مزید سمیٹ لینا لازم ہو گیا ہے مجھ پر۔"

"میں سمجھا نہیں استاد۔" شیراز نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ضرورت بھی نہیں ہے سمجھنے کی۔ بس اب تو کچھ کھا پی لے اور سو جا۔ تجھے آج رات ہی جانا ہے۔"

"مگر پروگرام تو......"

"آج رات دو بجے جانا ہے تجھے......" استاد رؤف نے ہاتھ اٹھا کر جیسے حکم دیا۔ اس کی آواز کی گھن گرج نے شیراز کے سارے بدن میں سنسناہٹ بھر دی۔

"ظہور...... ماسٹر کو کھانا کھلا اور سُلا دے۔"

شیراز نے استاد کے سپاٹ چہرے پر نظریں دوڑائیں۔ استاد نے پلکیں موند کر پھر دیوار سے ٹیک لگا لی تھی۔

"بس ایک بات یاد رکھنا ماسٹر......" استاد نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "کم سے کم وقت میں کام نمٹا کر لوٹ آنا۔"

شیراز نے بحث کا ارادہ ترک کر دیا۔ ظہور نے اشارے سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے رکابیوں میں کھانا نکالا۔ پانی کا گلاس بھر کر ساتھ رکھ دیا۔ شیراز نے جگہ چھوڑ دی اور ظہور کی طرف بڑھ گیا۔

امتیاز اپنی جگہ سے آگے سرکا اور استاد کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو دبانے کی اپنی سی کوشش کرنے لگا۔

بیرک میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ کسی آنے والے طوفان کی خبر دیتی ہوئی کڑوی اور ناقابلِ برداشت خاموشی!





گیارہ بجے تھے۔ جب استاد کے کہنے پر امتیاز نے شیراز کو جگا دیا۔ وہ گہری نیند سویا ہی کب تھا۔ فوراً اٹھ بیٹھا۔

"نجم کا فون ہے۔" استاد نے موبائل اسے تھما دیا۔

"ہیلو نجم......" بے تابی سے شیراز نے موبائل کان کے ساتھ لگا لیا۔

"ہیلو شیراز......" نجم کی مدھم سی آواز آئی۔ "میں بول رہا ہوں نجم......"

"ہاں ہاں۔ کہاں ہو اس وقت؟"

"میں سینی ٹوریم میں موجود ہوں۔"

"کیا......اتنی جلدی تم کیسے پہنچ گئے؟"

"راولپنڈی تک جہاز میں اور آگے میں نے ٹیکسی ہائر کر لی تھی۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا' نجم۔ ہاں بولو...... محمود اصغر کیسا ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔" ایک پل رک کر نجم نے جواب دیا۔ اس کی آواز کچھ اور مدھم ہو گئی۔

"کیا بات ہے نجم؟ آواز اس قدر کم کیوں آ رہی ہے۔" شیراز نے موبائل دوسرے کان سے لگا لیا۔

"سگنل بہت کمزور ہیں اور کوئی بات نہیں۔" نجم نے جواب دیا۔ "میں نے واجبات کی ادائیگی بذریعہ چیک کر دی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں' مگر شیراز میرے یار ایک گڑبڑ ہو گئی۔"

"کیا؟ خیریت ہے ناں!" وہ گھبرا کر بولا۔

"خیریت ہی ہے......بس...... محمود اصغر کی ضد کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں نے اسے تمہارے اب تک کے حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"اوہ......" شیراز کے چہرے پر شکستہ دلی کے آثار پھیل گئے۔ "یہ نہیں کرنا چاہیے تھا تمہیں۔ ...حال......اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔"

"ہاں...... جو ہو گیا اس پر کیا کیا جا سکتا ہے سوائے افسوس کے۔" نجم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "...ں مجبور ہو گیا تھا شیراز۔ وہ تم سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ تم خود ہوتے تو اس کے کہے بنا سب ...ر اگل دیتے۔"

"میں جانتا ہوں۔ بہر حال...... چھوڑو۔ یہ بتاؤ اس کی صحت اب کیسی ہے؟" شیراز نے ...دلی۔

"پہلے سے بہتر ہے۔ میں شاید دو تین دن بعد لوٹوں۔ اس سے پہلے ممکن نہیں۔" نجم نے ...یا۔

"کیوں...... کوئی کام نکل آیا کیا؟"

"نہیں یار......" نجم اداس سا ہو گیا۔ "محمود اصغر کو باہر لے جانا ہے۔ اسے باہر کی سیر کرانا ...وہ یہاں کے ایک خاص پارک میں جانا چاہتا ہے۔ میرا کچھ وقت لگ جائے گا مگر اس کی خواہش ...ا ہو جائے گی۔"

"یہ تمہارا مجھ پر احسان ہو گا نجم۔" شیراز نے ممنونیت سے کہا۔ "لیکن اس کے باہر جانے پر ...ٹوریم والوں کو تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"بالکل نہیں۔" نجم نے دھیرے سے کہا۔ "وہ خود اجازت دے رہے ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" شیراز خوش ہو گیا۔ "اسے جی بھر کر وہاں کی سیر کرانا۔ اسے خوش رکھنا اور ...... تم نے اس کی مسکراہٹ دیکھی؟" شیراز نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"اس مسکراہٹ نے تو مجھے رلا دیا ہے شیراز۔" نجم کی آواز بھرا گئی۔ "اتنا پیارا بچہ۔ ایسی معصوم ...ہٹ اور ایسی جان لیوا بیماری۔"

"ہاں نجم......" شیراز بھی اداس ہو گیا۔ "قدرت بھی نجانے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ اس وقت و... ہے؟ میں اس سے بات کر سکتا ہوں کیا؟"

"نہیں شیراز۔ ایم۔ ایس کا کہنا ہے کہ اس نے تمہارے واقعہ کا اچھا اثر نہیں لیا۔ تم سے بات ...گا تو زیادہ ٹینس ہو جائے گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے نجم جو اس کی صحت کے لیے خرابی کا باعث ہو۔ وہ جب صحت ...جائے گا تو تم اسے جا کر لے آنا اور مجھ سے ملا دینا۔ میں تو ابھی کئی سالوں کے لیے زندا

میں رہوں گا یار۔"

"فکر مت کرو یار...... چودہ سال کے سات سال رہ جاتے ہیں عمر قید میں اور تمہارا اچھا چلن ان میں بھی دو ایک سال کی کمی کرا سکتا ہے۔ تم خود آ کر اس سے مل لینا۔ کچھ عرصے بعد پیرو تمہاری رہائی کا چکر چلائیں گے۔"

"تسلیاں تم بھی خوب دے لیتے ہو نجم۔" شیراز مسکرا دیا۔

"وکیل ہوں۔ دلاسوں کی کھٹی کھاتا ہوں۔" نجم نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔ اس کے ا اس کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"کیا بات ہے نجم...... تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے؟" شیراز نے مشکوک انداز پوچھا۔

"نہیں یار۔ بس...... محمود اصغر سے مل کر اداس ہو گیا ہوں۔"

"میری طرف سے محمود اصغر کو ڈھیروں پیار دینا اور اسے اگر کچھ پیسوں کی ضرورت تو......"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھ لوں گا۔ ویسے اس کے پاس تمہارے دیئے ہوئے پہلے بھی تقریباً سارے ہی بچے پڑے ہیں۔ اس کا ذاتی خرچہ تو ہے کوئی نہیں۔"

"پھر بھی دیکھ لینا۔ اچھا...... اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ......" نجم نے کنکشن آف کر دیا۔

شیراز نے موبائل آف کر کے استاد کی طرف بڑھا دیا۔

"اسے اپنے پاس ہی رکھ ماسٹر...... تجھے باہر جانا ہے شاید اس کی ضرورت پڑے۔" نے جیب سے دوسرا سیٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس جو سیٹ ہے اس کا نمبر فیڈ کر لے میں۔"

شیراز نے خاموشی سے استاد کا بتایا ہوا نمبر اپنے والے موبائل میں فیڈ کیا اور سیٹ جیب ل لیا۔

"ماسٹر...... یہ جو بچہ ہے محمود اصغر...... تو اس کے سلسلے میں بہت جذباتی نہیں ہے کیا؟"

"ہاں استاد......" شیراز نے استاد کے پاس چٹائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے جواب میں ہا تھا ناں...... اس بچے نے مجھے ایک ایسے راستے پر ڈالا جس پر چل کر میرے دماغ ی دنیا روشن ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے جس انداز سے اپنی ماں کی خدمت کی، کوئی

تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر ایک بیٹا ہو کر اس نے اپنی بیمار ماں کے پیشاب پاخانے سے لے کر تک کے فرائض یوں نبھائے جیسے وہ دنیا میں پیدا ہی اس فرض کی تکمیل کے لیے ہوا تھا۔ کوئی اہٹ، کوئی اکتاہٹ، کوئی بیزاری اس کے قریب نہیں بھٹکی۔ اس نے عیادت نہیں عبادت کی ہے ا اور ایسے نصیب والے بچے کی خدمت کر کے میں اس کے ساتھ ایک ایسی نسبت قائم کر لینا چاہتا ں جس کے سبب شاید میرا خالق، میرا مالک مجھے بخش دے۔ مجھے اس کے قدموں میں جگہ دیدے۔

نے اسے اپنا مرشد یونہی نہیں کہہ دیا تھا استاد۔ میں جی جان سے اسے یہ درجہ دیتا ہوں۔"

"تو پڑھا لکھا ہے ناں ماسٹر...... عجیب عجیب گرہ کشائیاں کرتا ہے۔ تیری باتیں میری سمجھ نہ بھی آئیں تب بھی میں ان کا مطلب جان لیتا ہوں۔ بس وہ مفہوم، وہ مطلب کسی اور کو سمجھا ں سکتا۔ عجیب مزہ، لطف اور سکون سا ملتا ہے اس وقت مجھے جب میں ایسی کسی بات کی تہہ میں اتر اہوں، مگر کسی اور کو ساتھ نہیں لے جا پاتا۔"

"اب تم خود ایسی الجھی ہوئی، تصوف اور رمز کی باتیں کر رہے ہو استاد جن کو سمجھنے کے لیے ا کو کشتی پر آمادہ کرنا پڑے گا۔"

"تو دماغ کو نہ تھکا میں تجھے ابھی تازہ دم کرتا ہوں۔" استاد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر وہ ظہور کی متوجہ ہوا۔ "ظہورے...... جا سنتری سے کہہ کر گرم گرم چائے منگوائے۔"

"جی استاد۔"

ظہورا اٹھا اور لپک کر سلاخوں کے قریب چلا گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد تھرماس میں چائے آ گئی۔ سب نے مل کر چائے پی۔ اسی وقت سنتری لاخوں سے اندر جھانکا۔

"استاد...... سپرنٹنڈنٹ صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

"ابھی......؟" استاد نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔"

"انہوں نے کہا ہے شیراز کو بھی ساتھ لے آؤ۔" سنتری نے مزید کہا۔

"اچھا۔ چلو......" استاد اٹھ گیا۔ "چل بھئی ماسٹر۔ آ جا......"

شیراز دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھا۔ ظہورا اور امتیاز کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

نتری نے دروازہ کھول دیا۔

استاد اور شیراز آگے پیچھے باہر نکلے۔ بیرکوں میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ کاریڈور میں نائٹ بلب

جل رہے تھے۔

سنتری کے پیچھے پیچھے دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش چلے جا رہے تھے اور وارڈن ان کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ سپرنٹنڈنٹ رانا سہیل کے کمرے میں داخل ہوئے جو ادھ تھا۔

’’آؤ آؤ استاد۔‘‘ اس نے سنتری کو دروازہ بند کر دینے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا بات ہے رانا...... خیریت......؟‘‘

’’ہاں استاد۔ خیریت ہی ہے۔ جوان...... تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔‘‘ رانا نے صو پڑے پینٹ جرسی اور جوگرز کی طرف اشارہ کیا۔

شیراز نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ وہ کپڑے لے کر کمرے ایک کونے میں چلا جلدی سے لباس بدل لیا۔

’’اپنے کپڑے اِدھر الماری میں ڈال دو۔ واپسی پر یہیں بدل لینا۔‘‘ رانا نے دیوار گیر کے ایک خانے کی طرف اشارہ کیا۔

شیراز نے خانہ کھول کر کپڑے اس میں رکھے اور ان دونوں کے پاس چلا آیا۔

’’اکرم اور آصف آج ہیرا منڈی آئے ہوئے ہیں۔ رات وہ شمشاد بائی کے ہاں گز گے۔‘‘

’’اوہ......‘‘ استاد کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ ’’چلو...... یہ اچھا ہوا سے بات کر کے اسے آج رات گاؤں بھیجنے والا تھا مگر...... خبر تو پکی ہے ناں؟‘‘

’’سو فیصد...... مخبر ان کو شمشاد بائی کے ہاں دیکھ کر آیا ہے۔‘‘

’’تو بس...... کام ہو گیا۔‘‘ استاد نے چٹکی بجائی۔

’’یہ رکھو اپنے پاس......‘‘ رانا نے میز کی دراز سے ریوالور نکال کر شیراز کی طرف جسے اس نے لے کر جرسی کے نیچے پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیا۔

’’احتیاطاً یہ بھی لو۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔‘‘ استاد نے چم چم کرتا تین انچ پھل کا ایک کی طرف بڑھایا۔

شیراز نے ایک پل کو سوچا۔ پھر خنجر لے کر جراب میں چھپا لیا۔

اسی وقت رانا نے اپنی میز کے پاس جا کر کوئی بٹن دبایا۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ ا

میز کی عقبی دیوار نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہاں ایک دروازہ نمودار ہوا جو ایک لمبے کاریڈور میں کھل رہا تھا۔

’’آؤ......‘‘ رانا نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور کاریڈور میں قدم رکھ دیا۔ استاد نے شیراز کا ہاتھ پکڑا اور رانا کے عقب میں چل دیا۔ ان دونوں کے اندر آتے ہی رانا نے دیوار پر موجود ایک سرخ بٹن کو دبایا۔ دروازہ غائب اور دیوار برابر ہو گئی۔

’’موبائل لے لیا تھا ناں؟‘‘ آگے بڑھتے ہوئے استاد نے شیراز سے پوچھا۔

’’ہاں...... میرے پاس ہے!‘‘ شیراز نے پینٹ کی جیب تھپتھپائی۔

’’اسے آن ہی رکھنا۔‘‘

شیراز نے جواب میں محض سر ہلا دیا۔ پھر وہ دونوں نیم روشن کاریڈور میں رانا سہیل کے پیچھے پیچھے موڑ مڑ گئے۔

تقریباً تین منٹ بعد وہ دو تین موڑ مڑ کر ایک جگہ پہنچے جہاں چند سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔ رانا نے پہلی سیڑھی کے بائیں کونے پر پاؤں کا دباؤ ڈالا اور سیڑھیوں کے اختتام پر موجود دروازہ کھل گیا۔

وہ تینوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازے سے باہر آئے تو وہ ایک تنگ سی گلی میں کھڑے تھے۔ جونہی رانا نے دروازے سے گلی میں قدم رکھا آٹومیٹک میکنزم کے تحت دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اب وہاں سپاٹ دیوار موجود تھی۔

’’شیراز......‘‘ رانا نے اسے مخاطب کیا۔ ’’جب تم واپس آؤ تو اس جگہ پر تین بار زور سے دباؤ ڈالنا دیوار میں دروازہ نمودار ہو جائے گا۔ کاریڈور کے خاتمے پر سرخ بٹن موجود ہے اس کو دباؤ گے تو مجھے خبر ہو جائے گی کہ تم لوٹ آئے ہو۔ اگر کچھ دیر لگے تو سمجھ لینا میرے پاس کچھ ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن کی موجودگی میں ’میں‘ تمہیں اندر نہیں بلوا سکتا۔ ذرا انتظار کر لینا۔ دونوں صورتوں میں ’میں‘ تمہیں اپنے کمرے میں بلوا لوں گا اور تم کپڑے بدل کر اپنی بیرک میں چلے جاؤ گے۔ اچھی طرح سمجھ گئے ناں؟‘‘

’’یس سر......‘‘ سنسناتے دماغ کے ساتھ شیراز نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’گھبرانا مت...... تم جس گاڑی میں جاؤ گے اس میں ہمارے اپنے دو آدمی موجود ہیں جو تمہاری وقت پڑنے پر ممکنہ مدد بھی کریں گے لیکن کوشش کرنا کہ تم سارا معاملہ خود ہی نمٹاؤ۔‘‘

اس مرتبہ بھی شیراز محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

راناان دونوں کو لے کر اس تنگ گلی سے باہر آیا۔ اب وہ جیل سے تقریباً آدھ فرلانگ دور مین روڈ پر ایک سیاہ کار کے پاس کھڑے تھے۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر ایک نوجوان موجود تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔

''اس کا نام شوکت ہے۔'' رانا نے ڈرائیور سے شیراز کا تعارف کرایا۔ ''اور یہ نعیم ہے۔'' اس نے دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

تینوں نے آپس میں گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

''اکثر مہم میں یہ دونوں ہی تمہارے ساتھی ہوں گے شیراز۔ اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔ آؤ استاد...... ہم چلیں۔''

''سر......'' شیراز نے بے اختیار رانا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں آپ کے اس اندھے اعتماد کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''اعتماد میں نے تم پر نہیں' استاد پر کیا ہے شیراز۔'' رانا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''استاد کا اور میرا جو تعلق ہے وہ اس سے بھی بڑے رسک کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم استاد کے بھروسے پر کس طرح اور کس قدر پورا اترتے ہو۔''

''فکر کرنے کی ضرورت نہیں رانا۔'' استاد نے مسکرا کر کہا۔ ''میری آنکھ دھوکہ کھاتی ہے نہ دل۔'' پھر استاد نے شیراز کی طرف دیکھا۔ ''ہر قسم کا فکر یہیں چھوڑ جانا ماسٹر...... لوٹو تو خوشخبری چہرے پر لکھی ہونی چاہیے۔ اور ہاں۔ اگر اپنے دشمنوں کو معاف کرنا چاہو تو ان کے سامنے مت جانا۔ سامنے چلے جاؤ تو معاف مت کرنا۔ اللہ کے حوالے۔''

استاد نے شیراز کا شانہ تھپتھپایا اور رانا کے ساتھ گلی میں غائب ہو گیا۔

شوکت نے کار کا اگلا دروازہ کھولا اور شیراز کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ نعیم پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ سیاہ کار شیراز کو لے کر بازارِ حسن کی طرف اڑی جا رہی تھی' جسے اب بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ زنداں کی سنگلاخ دیواروں سے باہر آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔



رات کے ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔

بازارِ حسن جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ دکانیں گاہکوں سے اور کوٹھے تماش بینوں سے لبالب تھے۔ بازار میں ونڈو شاپنگ کرنے والے یوں اکڑے پھر رہے تھے' جیسے اس بازار کی ساری رونق انہی سے قائم ہو۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ فیشن اور پھٹ پڑنے والی جوانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کم تر کپڑوں میں

ے مارے اکڑ رہے ہوں۔ تاہم یہ بات کسی حد تک سچ تھی کہ بازار کی اصل رونق وہی تھے۔ ...اش بین تو مجرے سننے اور دادِ عیش دینے میں مصروف تھے۔ کھانے پینے کے شوقین ہوٹلوں اور ...ں میں گھسے ہوئے تھے۔ اب بازار میں تو وہی دل والے گھوم پھر رہے تھے' جو صرف اسی کام کے ...تے تھے۔ کسی پان والے کی دکان پر لگے جمگھٹے میں' کسی چائے کی دکان کے باہر ٹولیوں میں اور ...ے ادھر گھومتے پھرتے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے یہ شوقین اوپر کوٹھوں کی بالکونیوں میں ...ی طوائفوں سے فضول اشارے بازی میں مصروف رہتے۔ وہ بھی ان کی دل لگی کی حوصلہ افزائی ...ی رہتیں کہ اس سے خالی وقت اچھا گزر جاتا ہے۔

شمشاد بائی کا کوٹھا بازار میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ ان لوگوں کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت ...تھی کیونکہ شوکت کوٹھے اور کوٹھے والی دونوں سے واقف تھا۔ اس نے گاڑی ایک مناسب جگہ ...ے لی۔

''شیراز...... تم میرے ساتھ آؤ گے۔'' اس نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے شلوار میں ...ازار...ستے ہوئے کہا۔ پھر ذرا سی گردن ترچھی کر کے اس نے نعیم کی طرف دیکھا جو پچھلی سیٹ پر ...ے میں گم بیٹھا تھا۔ ''اور نعیم...... تم دو منٹ بعد آؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' نعیم نے آہستہ سے جواب دیا۔

''گاڑی کو لاک کر کے آنا۔'' شوکت نے کی چین اس کی طرف پھینکا' جسے اس نے لپک لیا۔

شیراز' شوکت کے ساتھ ہی گاڑی سے باہر آیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

جہاں گاڑی پارک کی گئی تھی وہاں پہلے سے ایک سوزوکی ویگن اور ایک سرخ کار کھڑی تھی۔ یہ ...لکڑی کے ٹال کے ساتھ خالی جگہ تھی۔ جو شاید پارکنگ ہی کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ چند گز کے ...م اندھیرا بتدریج اجالے میں بدلتا چلا گیا تھا۔ آگے پان سگریٹ کی ایک روشن دکان تھی' جہاں ...ارہ آدمی کھڑے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک آدمی موتیے کے ہار لیے کھڑا ہر آنے جانے والے ...طرف لپکتا' موتیے کے ہار پیش کرتا۔ کوئی خرید لیتا اور کوئی نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا۔ پان ...یٹ والے کے بعد ایک تکہ کڑاہی کا ہوٹل تھا' جہاں سے خوشبودار مصالحوں کی لہریں چکراتی ہوئی ...میں پھیل رہی تھیں۔

اس کے بعد مزید کئی دکانیں تھیں' جن پر مختلف کاروبار ہو رہے تھے۔ سامنے کا حصہ ایک بڑی ...ت کی عقبی دیوار پر مشتمل تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دو گھوڑے بندھے اور ایک تانگہ ...ا تھا۔

دکانوں کے درمیان اوپر جانے کے لیے تین چار عمارتوں کے زینے تھے۔ جن کے شروع سڑک پر ایک ایک دو دو آدمی کھڑے آنے جانے والے شکار تاڑ رہے تھے۔ شیراز نے ان کو دیکھ اس کے دماغ نے گواہی دی کہ وہ دلال تھے جو اپنی مالکنوں کے لیے گاہک تلاش کر رہے تھے۔ حلیہ کسی طرح بھی خاص نہ تھا' مگر ان کے سگریٹ پینے کا انداز وہ اشتہار تھا' جسے گاہک دور سے لیتے ہیں۔ ان کی نظروں کا گھماؤ پھراؤ وہ سگنل تھا' جو کوٹھے پر مال تک جانے کے لیے گاہک سے سبز بتی اور مخدوش حالات میں سرخ بتی دکھاتا تھا۔

''تیار......'' شوکت نے شیراز کو مخاطب کیا۔

شیراز نے بازار سے نظریں لوٹائیں اور شوکت کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے اثبات میں ہلا دیا۔

''تو آؤ......'' شوکت نے کار کی چھت کو ہولے سے تھپ تھپا کر نعیم کو اپنی روانگی کی دی اور قدم اٹھا دیا۔

شیراز بھی حرکت میں آیا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو ذہنی طور پر آنے والے لمحات کے لیے کیا اور شوکت کے عقب میں آگے بڑھ گیا۔

ان کو آتا دیکھ کر ہاروالا تیزی سے لپکا اور ان کو آ لیا۔

''ہار بابو جی ہار......'' اس نے لکڑی کی چھڑی پر موتیے اور گلاب کے ہار ان کی آنکھوں سامنے اس طرح نچاتے ہوئے کہا۔ جیسے ان کی نزدیک کی نظر کمزور ہو۔ ''بائی جی کے لیے لے جا بابو جی۔''

''ہٹو آگے سے۔'' شوکت نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

''دھکے تو نہ دو بادشاہو۔'' بیچارگی سے اس نے کہا اور چھڑی پر ہاروں کی گتھم گتھا ہو جانے ترتیب درست کرنے لگا۔

شوکت نے اس کی بات کا جواب دیا نہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ لاپرواہی سے اپنی جیکٹ کی جیبو میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ شیراز اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔

پہلی دو عمارتوں کے زینے چھوڑ کر شوکت تیسری عمارت کے باہر کھڑے بوسکی کے سوٹ ریشمی چادر میں ملبوس اس آدمی کے پاس جا کھڑا ہوا' جو چوتھے گیئر میں سگریٹ پی رہا تھا۔

''شمشاد بائی موجود ہے؟'' شوکت نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... آپ کون اور کہاں سے......''

''اوپر ہے یا نیچے؟'' شوکت نے اس کی بات گول کر دی اور سپاٹ لہجے میں دوسرا سوال داغ دیا۔

''نیچے......'' اس آدمی نے بڑی گہری نظروں سے شوکت اور اس کے ساتھ کھڑے شیراز کی طرف دیکھا۔

''ہٹو......'' شوکت نے اسے بازو سے تھام کر ایک طرف کر دیا اور عمارت کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

اس کے جارحانہ رویئے نے اس آدمی کی زبان بند کر دی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ان کو اندر جاتے دیکھتا رہا۔ پھر شانے اچکا کر بازار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے خیال میں اندر جانے والے شمشاد بائی کے پرانے جاننے والے ہوں گے' جن کو یہ بھی معلوم ہے کہ بائی اوپر ہے یا تہ خانے میں محفل جمائے ہوئے ہے۔

بازارِ حسن میں ایک عرصے سے یہ رواج چل نکلا تھا کہ بیشتر عمارتوں کے نیچے تہ خانے بنا لیے گئے تھے۔ جہاں خاص مہمانوں کے لیے خاص اوقات میں بزمِ رقص و طرب سجائی جاتی۔ اوپر کوٹھوں پر بھی ناچ گانا ہوتا تھا مگر تہ خانوں کا یہ فائدہ تھا کہ وہاں سے سازوں کی آوازیں کم کم باہر آتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کبھی کبھی صرف عیش کی محفلیں سجائی جاتیں اور اوپر ناچ گانا ہوتا رہتا۔

ایک ستم یہ ہوا کہ اب استاد لوگوں کی وہاں کھپت بہت کم رہ گئی تھی۔ جب سے آڈیو اور ویڈیو نے اودھم مچایا تھا' بائیاں ڈیک پر ریکارڈنگ کرتیں اور انڈین اور پاکستانی گانوں پر رقص کے توڑے دکھاتیں۔ استادوں کو بخرا دینے سے جان چھوٹی اور آمدنی خالصتاً اپنی جیب میں جاتی۔ تیسرا فائدہ یہ تھا کہ اگر دورانِ مجرا کوئی تماش بین آپے سے باہر ہو جاتا تو استادوں کو اٹھانے' بھگانے یا کمرے سے نکالنے کی تکلیف بھی نہ کرنا پڑتی۔ بس رقص بند ہو جاتا۔ ریکارڈنگ جاری رہتی اور اس کی لے پر عملی یوگا شروع ہو جاتی۔

شوکت نے تہ خانے کے بند دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے فوراً ہی ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''راجہ گل زیب۔'' شوکت نے لہجہ گراں کرتے ہوئے جواب دیا۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ شوکت' شیراز کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ چار چھ فٹ کی ڈیوڑھی تھی' جس کے بعد سیڑھیاں نیچے کو جا رہی تھیں۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ان کے سامنے ایک بوڑھا مگر مضبوط جثے کا آدمی کھڑا تھا جو شوکت کو دیکھ کر نہال ہو گیا۔

"ارے راجہ جی آپ...... آیئے آیئے۔" اس نے دروازہ لاک کرتے ہوئے کہا۔

نیچے تہ خانے میں ڈیک پر انڈین کیسٹ چل رہی تھی جس کے گانوں پر دو نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں نیم برہنہ لباس میں رقص کے نام کو بٹہ لگا رہی تھیں۔ جذبات کو بھڑکا دینے والی سوقیانہ حرکات کو رقص کا نام دے کر صوفوں پر براجمان شراب نوشی میں مصروف تین چار تماش بینوں کی چھیڑ چھاڑ کو نوٹوں کی شکل میں کیش کرتی دونوں لڑکیاں شوکت اور شیراز کو سیڑھیاں اترتا دیکھ کر رک گئیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر ڈیک آف کر دیا۔

"ارے راجہ صاحب...... آپ۔" ایک لڑکی آگے بڑھ کر شوکت سے لپٹ گئی۔ دوسری بھی قریب چلی آئی‘ مگر آرام سے کھڑی رہی۔

شیراز گہری نظروں سے ان لڑکیوں کے بعد اب تماش بینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر اس کا اندازہ یہ تھا کہ صوفوں پر اکرم اور آصف موجود ہوں گے تو غلط تھا۔ وہ کوئی اور لوگ تھے‘ جو ان کی آمد پر تھم جانے والے طوفانِ بدتمیزی پر ناگواری کا مظہر دکھائی دے رہے تھے۔

"کیسی ہو جانِ من؟" شوکت نے اس کے گال پر بوسہ دیا۔

"آپ کو کیا؟ اتنے دن بعد آئے ہیں!" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"ناراض مت ہو۔ کام میں الجھا ہوا تھا۔ بائی کدھر ہے؟"

"اندر......" لڑکی نے سامنے دیوار میں موجود بند دروازے کی طرف اشارہ کیا‘ جو شاید کمرۂ خاص میں کھلتا تھا۔

"اور کون ہے؟" شوکت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"دو آدمی ہیں۔" لڑکی کی آواز ہلکی ہو گئی۔ وہ اب بھی شوکت کی بانہوں میں پھنسی اس کے کالر سے کھیل رہی تھی۔

"ہوں......" شوکت نے شیراز کی طرف دیکھا۔ اس کی معنی خیز نظروں نے شیراز کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

"تو ایسا ہے نازو......" شوکت نے اسے ہلکا سا جھٹکا دیا تو لڑکی مچل کر رہ گئی۔

"بائی کو خبر کرو کہ میں آیا ہوں۔"

"چھوڑیں گے تو خبر کروں گی نا۔" نازو نے ادا سے کہا۔ شوکت نے ہنس کر اسے آزاد کر دیا۔

وہ ایک طرف پڑی تپائی کی طرف بڑھ گئی‘ جس پر فون اور انٹرکام سیٹ پڑا تھا۔ دوسری لڑکی زیرلب مسکراتی ہوئی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس نے نازو جیسی بے تکلفی کا قطعاً مظاہرہ نہ کیا تھا۔

"سناؤ سالی جی...... کیسی ہو؟" شوکت نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ٹھیک ہوں جیجا جی۔" وہ ہنسی تو شیراز کو اچھی لگی۔ پھر اس نے شوکت کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ شوکت نے اسے کھینچ کر قریب کر لیا۔

"آدھے گھر والی ہو۔ کبھی حق استعمال بھی کیا کرو۔" شوکت نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بس بس...... نازو بُرا مان جائے گی اور آگے نہ بڑھیئے۔" لڑکی نے شوکت کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم تو بُرا نہیں مانو گی ناں۔" شوکت نے دھڑلے سے کہا۔

"نِنی...... میں سب دیکھ رہی ہوں۔" انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے نازو نے دور سے ہانک لگائی۔

"ارے باپ رے۔" شوکت نے فوراً نِنی کو پرے دھکیل دیا۔

"بس...... ڈر گئے۔" نِنی زور سے ہنسی۔

"ڈرنا پڑتا ہے‘ بابا...... تمہاری بہن جتنی نشیلی ہے‘ اتنی زہریلی بھی ہے۔" شوکت نے سر ہلا کر کہا اور نِنی مسکراتی ہوئی اپنے تماش بینوں کی طرف بڑھ گئی جو اب باقاعدہ بور ہو رہے تھے۔

"آؤ بھئی خواجہ......" شوکت نے شیراز کا نقلی نام بھی ایجاد کیا۔ دونوں ساتھ ساتھ نازو کے پاس پہنچے جو ریسیور شوکت کو تھما کر خود اٹھ گئی۔ شیراز‘ شوکت کے ساتھ ہی صوفے پر ٹک گیا۔

"ہیلو......!" شوکت نے ریسیور میں کہا۔

"ہیلو راجہ...... کیسے ہو؟" دوسری طرف سے بڑی ہلکی مگر بے حد شیریں آواز ابھری۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ استاد نے بھیجا ہے۔"

"اوہ......" شوکت کے الفاظ سنتے ہی شمشاد بائی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"خیریت؟"

"ہاں...... ایک ضروری کام ہے۔"

"ابھی؟"

"ہاں...... ابھی!"

"کہاں؟"

"یہیں...... تمہارے پاس!"

"میرے پاس؟" شمشاد چونکی۔

"ہاں..... مال کی دو پیٹیاں تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ ڈلیوری ابھی چاہئے۔"

"کیا؟" شمشاد باقاعدہ ٹپٹا گئی۔

"ڈر گئیں کیا؟" شوکت نے آواز دبا کر کہا۔

"پاگل ہوئے ہو۔" ایک دم وہ تن تا گئی۔ "شمشاد کیا کسی ہیجڑے کا نام ہے؟"

"تو پھر....."

"ڈلیوری کون لے گا"

"خواجہ..... میرے ساتھ آیا ہے!"

"پانچ منٹ بعد میں باہر آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

شوکت نے ریسیور ڈال دیا۔ پھر گردن گھما کر شیراز کی طرف دیکھا جو اس کی اب تک شمشاد بائی سے گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکا تھا۔

"تیار ہو جاؤ خواجہ!" بے حد ہلکی مگر دبنگ آواز میں شوکت نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔" شیراز نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ رہا تھا۔

"اپنا پسینہ خشک کرو۔ ٹریگر پر انگلی تھرک جائے گی۔" شوکت نے کہہ کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔

فوراً ہی شیراز نے اپنے لرزتے ہوئے دل کو تھپکی دی۔ رانوں پر ہاتھوں کو رگڑ کر خشک کیا اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ آنے والے لمحات میں خود کو کسی بھی تناؤ کا شکار نہ رکھنا چاہتا تھا۔

نازو اور نغی تماش بینوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ شوکت دلچسپی بھری نظروں سے ان کی بے قاعدہ چھیڑ چھاڑ دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر گزری کہ ان کے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔

"پلٹ کر مت دیکھنا خواجہ..... آرام سے بیٹھے رہو۔" شوکت نے اندازِ نشست میں تبدیلی پیدا کیے بغیر آہستہ سے کہا اور شیراز نے وہیں خود کو روک لیا۔

قالین پر کسی کے بے آواز قدم جب ان کے سامنے آ کر رکے تو شیراز کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

اس کے سامنے چوبیس پچیس سال کی ایک دودھیا عورت کھڑی تھی، جس کا چہرہ چاندنی میں نہایا ہوا اور بدن سنگِ مرمر میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کا سراپا اگر عورت کا تھا تو پھر وہ اس وقت کی حسین ترین عورت تھی۔ بے حد ہلکے سرخ رنگ کی لپ سٹک نے شیراز کو سمجھایا کہ رس بھرے ہونٹ کیا ہوتے ہیں۔ تپتے ہوئے رخساروں نے سمجھایا کہ عارض گلگوں کسے کہتے ہیں۔ شفاف اور سپید گردن نے صراحی دار ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ گردن سے نیچے وہ چھتیس چوبیس چھتیس کا شاہکار تھی۔ نارنجی ساڑھی میں وہ ایک ایسا شعلہ دکھائی دے رہی تھی جو صرف چنار کے درختوں کی یاد دلاتا تھا۔

یہ شمشاد بائی تھی۔

"ہیلو خواجہ....." شمشاد بائی نے مسکراتی ہوئی نظروں سے شیراز کی جانب دیکھا۔

"ہیلو....." وہ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر رہ گیا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"اندر کیا راز و نیاز ہو رہے تھے بائی جی؟" شوکت نے اسے طنزیہ اور شریر نگاہوں سے دیکھا۔

"تم جانتے ہو راجہ..... میں دھندا نہیں کرتی۔ باتوں سے ان کا دل بہلا رہی تھی۔ انہوں نے مہاراج کی دونوں بیٹیوں کی فرمائش کی ہے۔ وہ دو بجے مجرے کے بعد آنے والی ہیں۔ ان کے انتظار میں وقت کاٹ رہے تھے میرے ساتھ....."

"ہوں..... تو سب سے پہلے ان کو چلتا کرو۔" شوکت نے آنکھ کے اشارے سے تماش بینوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں..... ضرور....." شمشاد بائی تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف چلی۔

"غلام....." اس نے اوپر دروازے کے پاس کھڑے ادھیڑ عمر آدمی کو آواز دی۔

"جی بائی جی۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر آیا۔

"اوپر کے تیسرے کمرے میں ان معزز مہمانوں کا انتظام کرو دو منٹ کے اندر۔"

"جی بائی جی۔" غلام نے واپس دوڑ لگا دی۔

"نازو..... نغی....." شمشاد نے دونوں لڑکیوں کو پکارا۔ "اپنے مہمانوں کے ساتھ اوپر چلی جاؤ۔ آپ لوگ میری بات پر برا نہ مانئے گا۔ یہاں آپ کی آزادی میں خلل واقع ہوگا۔ ہم لوگ ذرا بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔" شمشاد نے آخر میں ان چاروں تماش بینوں سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ چاروں خوش ہو گئے ورنہ تو اب وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ نئے آنے والوں نے ان کا مزہ خراب کر دیا۔ مگر اب الگ کمرے میں جانے کا سن کر ان کے خراب

ہوتے موڈ بحال ہو گئے۔

اسی وقت غلام لوٹ آیا۔ اس نے ڈیوڑھی ہی سے نازو اور نبنی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے مہمانو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ غلام نے ان کے چلے جانے کے بعد پھر تہ خانے کا درواز کیا اور کسی جن کی طرح پاؤں پھیلا کر اگلے حکم کے انتظار میں وہیں جم گیا۔ اسی وقت شوکت شمشاد کو نعیم کے آنے کے بارے میں بتایا۔

''غلام......'' شمشاد نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

''جی بائی جی۔'' وہ مشینی انداز میں بولا۔

''کان بند کر لو۔ صرف آنکھیں کھلی رکھنا۔ صرف ایک آدمی کا شربٹ آئے گا اور بس!''

''جی بائی جی۔'' وہ کسی روبوٹ کی طرح مستعد ہو گیا۔

''ڈلیوری لی جا سکتی ہے راجہ...... اب کوئی دیر نہیں۔'' شمشاد بائی نے شوکت کی طرف دیکھا

''او کے خواجہ...... وش یو گڈ لک۔'' شوکت نے شیراز کی طرف دیکھا اور بازو کمرے دروازے کی طرف دراز کر دیا۔

شیراز نے ایک نظر شوکت کو دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہلا رہا تھا۔ پھر اس نے شمشاد کے صبیح چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ وہ اسے بڑی گہری اور سنجیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تب وہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہولے سے پلٹا اور کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے قدموں میں کوئی لرزانہ تھا۔
اس کے جسم میں کوئی تناؤ نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ ماضی کے لمحات، سلگتی یادوں اور دہکتے وقت کی آندھی...... جو اسے بگولے کی طرح اڑائے لیے جا رہی تھی۔
وقت غلام نے کسی کی دستک پر دروازہ کھولا۔ آنے والا نعیم یا کا شربٹ تھا جو تیزی سے سیڑھیاں اتر تھا۔



''تم......'' اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو اکرم اور آصف بھڑک کر بیڈ سے کھڑے گئے۔ ان کی حیرت زدہ نظریں شیراز پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بند دروازے سے پشت لگائے کھڑا ان کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''تم یہاں کیسے؟'' اکرم نے ناقابل یقین انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تو جیل میں تھے؟'' یہ آصف کی شک سے بھرپور آواز تھی۔

اسی وقت کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو کا جھونکا سا لہرایا شیراز نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو

اسی کے گرد ناچ رہی تھی۔ اسے عجیب سی طمانیت محسوس ہونے لگی۔

ان دونوں کو یقین نہ آ رہا تھا کہ زنداں سے نکل کر رات کے اس پہر شیراز زندہ و سلامت ان کے سامنے کھڑا ہے۔

''کچھ اور بھی پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔'' شیراز نے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ ''کیونکہ یہ تمہاری زندگی کے آخری سوال جواب ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ دونوں بری طرح چونکے۔ پھر انہوں نے بستر پر پڑی کارتوس کی پیٹیوں پر ہاتھ ڈالا...... اور...... ان کے رنگ اڑ گئے۔ پیٹیاں موجود تھیں مگر ان کے ہولسٹر خالی تھے۔ دونوں کے ریوالور غائب تھے۔ غائب نہیں، ریوالور بستر کے نیچے پڑے تھے۔ اب وہ وہاں کیسے پہنچے؟ اس کا انہیں کچھ علم نہ تھا۔

''ریوالور تلاش کر رہے ہو؟'' شیراز نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس ہے۔'' اس نے دائیں ہاتھ سے بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا۔

''مگر ہمارے ریوالور......'' اکرم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اپنے ہتھیار کی گمشدگی کے تم خود ذمے دار ہو۔ اس سے میرا کام اور آسان ہو گیا۔'' شیراز نے زہر خند سے کہا۔

''کیسا کام؟'' آصف نے بگڑ کر کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو۔ اس پستول سے ہم دونوں کو مار ڈالو گے اور بچ کر نکل جاؤ گے۔''

''ہاں...... میرا یہی خیال ہے۔'' شیراز نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میری یہ پستول تم دونوں کے لیے موت اگلنے والی ہے۔''

''دیکھو چچا......'' اکرم نے ہاتھ اٹھا کر کہنا چاہا۔

''بکو مت......'' شیراز دھاڑا۔ اس کی آنکھیں ایک دم خون اگلنے لگی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں۔

اکرم اور آصف کے دل دہل کر رہ گئے۔

''نہ میں تمہارا چچا ہوں نہ تم میرے کچھ لگتے ہو۔ یہ رشتے تو تم خود ختم کر چکے ہو۔''

اکرم اور آصف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ ہوا اور ایک دم دونوں نے شیراز پر چھلانگ لگا دی۔

شیراز نے اگلے ہی پل اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اکرم اور آصف اپنی جھونک میں آگے نکل گئے۔

اب شیراز ان کے پیچھے آ گیا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ بلند کیا۔ اوپر تلے نو دھماکے ہوئے اکرم اور آصف کی پشت پر۔ اور جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلٹے تو دونوں کے سینے چھلنی ہو گئے۔

دونوں نے تیسری گولی پر ہی دم توڑ دیا مگر شیراز نے ریوالور خالی کر کے ہاتھ روکا۔

آڑے ترچھے مردہ حالت میں لہولہان اکرم اور آصف اس کے بھتیجے' قالین پر پڑے شیراز کو اب بھی حیران حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تحیّر ان کی آنکھوں میں بے یقینی کی دھند بن کر جم گیا تھا۔ اب یہ کون جانے کہ یہ حیرت کس بات پر تھی؟ اپنے جرم کی سزا اتنی جلدی مل جانے پر...... یا بے مروتی کا جواب بے مروتی کی انتہا کے ساتھ ملنے پر......

شیراز نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا۔ ریوالور جیب میں ڈالا۔ سانس برابر کیا اور نفرت سے اپنے مردہ رشتوں کو دیکھتا ہوا ان کے اوپر سے پھلانگ گیا۔

خوشبو کا مست جھونکا اب بھی اس کے ہمراہ تھا۔

دروازہ کھول کر جب اس نے باہر قدم رکھا تو سامنے شوکت کھڑا تھا۔ شمشاد بائی اس کے ساتھ ایک ہاتھ کولہے پر رکھے کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''او کے......'' شوکت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''او کے......'' شیراز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پلٹ کر دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے کے اندر قالین پر اکرم اور آصف لہولہان پڑے نظر آ رہے تھے۔

ایک دم شمشاد بائی کا تناؤ کا شکار چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے چہرے پر تازگی سی دوڑ گئی۔

''بیٹھیے خواجہ جی۔'' اس نے عجیب سی نظروں سے شیراز کی جانب دیکھا۔

''آؤ...... بیٹھو......'' شوکت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ساتھ لیے ہوئے صوفے پر آ بیٹھا۔ ریوالور اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔

شمشاد بائی ایک سائڈ پر بنی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں شراب کی بوتل اور تین نازک نازک گلاس دبے ہوئے تھے۔

شوکت نے تپائی آگے کر لی۔ شمشاد نے گلاس اور شراب کی بوتل تپائی پر رکھی اور ان کے ساتھ سائڈ پر سنگل صوفے پر ٹک گئی۔

شوکت نے بوتل کھولی۔

''میں شراب نہیں پیتا۔'' شیراز نے اسے تیسرے گلاس میں شراب ڈالنے سے روک دیا۔

''ہمارے ساتھ بھی نہیں پئیں گے خواجہ جی؟'' شمشاد نے اسے اپنی جادو بھری آنکھوں سے

دیکھا۔

''میں معذرت چاہوں گا۔'' شیراز نے بڑی متانت سے کہا۔

''میرے کہنے پر بھی نہیں پئیں گے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''میں معافی چاہوں گا۔'' شیراز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''سوچ لیجیے۔'' وہ اٹھلائی۔

''ارے پی لے ظالم۔'' شوکت نے شیراز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ تو زہر پلا دے تو وہ بھی ...ت بن جاتا ہے۔''

''سوری راجہ......'' شیراز نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس پینے کے لیے زندگی کا زہر ہے۔ اسے گھونٹ گھونٹ پیتا رہتا ہوں۔''

''واہ......'' شمشاد پھڑک اٹھی۔ ''مجھے راجہ نے آپ کے بارے میں بتایا ہے خواجہ جی۔ جتنا وقت آپ نے بھگتا ہے اس کے بعد تو ایسی چیزیں ضروری ہو جاتی ہیں۔''

''سب کے لیے نہیں......'' شیراز مسکرایا۔ ''اور میں سب میں شامل ہونا بھی نہیں چاہتا۔''

''اچھا لگا خواجہ......'' شمشاد بے تکلفی پر اتر آئی۔ ''تمہارا ہر جواب اچھا لگا۔ اگر میں اس ... تمہارے سامنے کروڑ پتی کروڑ پتی کھیل رہی ہوتی' تو یقیناً سب سے بڑا چیک سائن کر کے ...اری جیب میں ڈال دیتی۔''

بے اختیار شیراز کے ساتھ شوکت بھی ہنس پڑا۔

''لو بھئی راجہ...... خواجہ کے آنے اور اس کے پرت کھلنے کی خوشی میں آج میں بھی نہیں ... شمشاد نے اپنا گلاس آگے سرکا دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شوکت بگڑ گیا۔ ''میں کیا اکیلا جھک ماروں۔''

''جھک ہمیشہ اکیلے ہی ماری جاتی ہے راجہ۔'' شمشاد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ اور شوکت ...کر رہ گیا۔ پھر اس نے اوپر تلے اپنا اور شمشاد کا گلاس خالی کر دیا۔

''ان کو ٹھکانے لگانے میں کوئی دقت تو نہیں ہو گی؟'' ہونٹ صاف کرتے ہوئے شوکت نے

''نہیں...... غلام ہے ناں...... سب ہو جائے گا۔'' شمشاد نے یوں جواب دیا جیسے کوڑے کو ...ان میں ڈالنے کی بات ہو رہی ہو۔

''استاد کا کہنا ہے کہ ان کی لاشیں ان کے گاؤں میں ڈلیور ہونی چاہئیں۔''

"ہو جائیں گی۔" شمشاد نے اطمینان سے کہا۔ "استاد سے میرا سلام کہنا اور کہنا...... کا ایس۔ ایچ۔ او بڑی گرم نظروں سے دیکھتا ہے مجھے۔ ایک آدھ بار فون بھی کیا ہے ا ......اب تیسری بار خود آ دھمکے گا یا مجھے بلا بھیجے گا۔"

"اب اس کا فون آئے گا نہ پیغام۔ خود آنے سے اسے استاد پرہیز بتا دے کچھ......؟"

"بس......باقی سب خیریت ہے!"

"او کے......تو ہم چلتے ہیں۔" شوکت نے نشست چھوڑ دی۔ شیراز بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر کبھی بھی خواجہ کو ساتھ لے کر آنا راجہ......" شمشاد نے شیراز کو سمجھ میں نہ آ. نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی باتوں میں گیان جھلکتا ہے۔ صرف دھیان سے ضرورت ہے۔"

"زندگی نے کبھی نرمی برتی تو میں خود آؤں گا شمشاد جی۔ مجھے بھی آپ میں ایک الگ نظر آئی ہے۔"

"عورت......؟" حیرت سے شمشاد نے شیراز کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... کیا عجیب بات کہہ دی میں نے......" شیراز اسے چونکتے دیکھ کر اچنبھ پوچھا۔

"ہاں خواجہ......استاد کے بعد تم دوسرے آدمی ہو جس نے شمشاد بائی کو عورت کہا ہے تو سب اسے طوائف ہی گردانتے ہیں۔"

"طوائف عورت نہیں ہوتی کیا شمشاد جی؟" شیراز ہنس پڑا۔

"نہیں خواجہ......طوائف صرف طوائف ہوتی ہے۔ عورت تو ماں ہوتی ہے۔ بہن ہوتی بیٹی ہوتی ہے۔ بیوی ہوتی ہے اور...... محبوبہ ہوتی ہے۔ جبکہ طوائف بستر کی وہ چادر ہوتی ہے! شکن پیدا کی جاتی ہے اور بدل دی جاتی ہے۔"

"گیان تو آپ میں ہے شمشاد جی۔" شیراز نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے بڑے تھم میں کہا۔ "دھیان سے سننے والی باتیں تو آپ کرتی ہیں۔ میں ایک بار ضرور آؤں گا آپ کے ......زندگی سے مہلت مانگ کر یا چھین کر بھی لینی پڑی تو آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے' آپ سے روز آپ کو سنوں گا جی بھر کے۔" شیراز نے بے اختیار کہا اور ہاتھ بڑھا دیا۔

شمشاد نے غیر اضطراری طور پر اس کے ہاتھ میں اپنا گداز' گرمی سے بھرپور ہاتھ

ے ایک بار اس کی آنکھوں میں دیکھا' سر جھکایا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے ٹھوں سے لگایا اور چھوڑ دیا۔ پھر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

شوکت خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بھی شمشاد کی جانب دیکھ کر چپ چاپ ھیوں کی طرف قدم بڑھا دیا۔

اور شمشاد......

وہ پتھر کا بت بنی اپنے ہاتھ کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اس جگہ جمی ہوئی تھیں' جہاں ے اپنے تپتے لبوں سے بوسہ دیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اچانک کمرے میں ایک بے پناہ خوش ہک نے جنم لے لیا ہے۔ وہ مہک' وہ خوشبو اس کے گرد رقص کے انداز میں چکراتی رہی۔ پھر قصاں رقصاں وہ خوشبو جیسے سیڑھیوں کی طرف لپکتی چلی گئی۔ شیراز کے پیچھے۔ خواجہ کے تعاقب



نعیم کار کے پاس کھڑا بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"کام ہو گیا......" شوکت نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......" نعیم نے مختصر جواب دیا۔

"مال کتنا ہے؟"

"تین کلو......"

"کافی ہے۔ رانا صاحب کے پندرہ دن نکل جائیں گے۔" شوکت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

شیراز نے ساری بات کو سنا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر اس نے دماغ پر زور ڈالنا یا ے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ غیر متعلقہ باتوں کی پوچھ تاچھ اس کا مسئلہ نہ تھا۔

ین روڈ پر آتے ہی شوکت نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ نسان اور راستہ ویران تھا۔ صرف روڈ لائٹس اونگھ رہی تھیں۔

"کوئی دقت تو نہیں ہوئی شیراز؟" شوکت نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں......" شیراز نے چند لمحے قبل کا منظر یاد کیا تو اسے یقین نہ آیا کہ وہ دو آدمیوں کا ن چکا ہے۔

"شمشاد کیسی عورت لگی؟"

"زبردست!" بے اختیار شیراز کے لبوں سے نکلا۔ "اگر ایک بات پوچھوں تو بُرا تو نہ مانو گے

شوکت!"

"پوچھو بھئی پوچھو۔ بُرا ماننے کا میں عادی ہی نہیں ہوں۔" شوکت نے جواب دیا اور سیٹ سے نعیم کی دبی دبی ہنسی ابھری۔

"یہ نازو سے تمہارا کیا چکر ہے؟ تم نینی کو آدھے گھر والی کہہ رہے تھے اور......"

"ارے وہ......" شوکت نے قہقہہ لگایا۔ "بھولے بادشاہ یہ طوائفوں کی باتیں بازارِ حسن کی زبان ہے۔ میں جب کبھی اسے رات آدھی رات کے لیے خریدتا ہوں' تو چند گھنٹوں لیے وہ میری بیوی ہوتی ہے۔ نینی اس کی بہن ہے۔ اسے سالی کہہ دیتا ہوں اور اس کے ساتھ میرا مستقل یا پائیدار تعلق کوئی نہیں ہے۔"

"ہوں......" شیراز نے سر ہلایا۔ "یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ سالی اور بیوی دونوں بہنوں کا دل بہلا رہی ہیں اور شوکت صاحب مزہ لے رہے ہیں۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"ہت۔" شوکت جھینپ گیا۔ نعیم کا بڑا جاندار قہقہہ تھا جو کار میں گونجا۔

"اب شوکت خان۔ اب بولو...... میں نہ کہتا تھا کہ ہر وقت بیوی اور سالی کے چکر میں رہا کرو۔ کسی دن کوئی سوا سیر ٹکر گیا تو ساری ہیرا پھیری کھول کر رکھ دے گا۔"

"بس یار...... آئندہ احتیاط کروں گا۔" شوکت نے بائیں ہاتھ سے کان کی لو کو کی۔

اسی وقت کار نے ٹرن لیا اور جیل کی عقبی سڑک کی اس پتلی سی گلی کی طرف بھاگتی چلی۔ شیراز کو ایک بار پھر زنداں کی دیواروں میں لے جانے والی تھی۔ مگر اب وہ زنداں...... وہ جیل کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھی۔ جہاں استاد اور رانا سہیل جیسے سائبان اس کے لیے بانہیں کھولے د تھے۔





"اپنے کیے پر کوئی ندامت تو نہیں ہے ماسٹر؟" استاد نے شیراز کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں استاد......" بلا جھجک شیراز کے لبوں سے نکلا...... "ندامت نہیں۔ بس ایک موہوم سا خیال آتا ہے کہ کیا میرا انتہائی اقدام مناسب تھا؟"

"جب مقابلہ برابر کی سطح پر ہو تو نتیجہ کسی ایک کے حق میں اچھا اور دوسرے کے حق میں بُرا نکلنا لازم ہوتا ہے ماسٹر...... تمہارے دشمن تمہاری جان کے درپے ہیں......"

"اب بھی......؟" حیرت کے مارے شیراز کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں...... آج لائبریری ضرور جانا۔ ثبوت شاید آج ہی مل جائے۔ تب تجھے اپنے احساسِ جرم کا یہ لطیف سا کانٹا بھی دل سے نکلتا ہوا محسوس ہوگا۔"

"بات کیا ہے استاد......؟" شیراز نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ "کھل کر نہیں بتاؤ گے"

"نہیں......" استاد نے واضح لہجے میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں تو اپنی آنکھوں سے دیکھے تاکہ بار بار تیرا دل کسی امتحان میں نہ پڑے۔"

"پھر بھی......"

"کہا ناں...... آج لائبریری ضرور جانا۔ بس ایک احتیاط کرنا کہ کوئی بھی کھانے پینے کی چیز حلق سے اتارنے سے پہلے میری بات کو یاد کر لینا۔"

"استاد......" بے ساختہ شیراز مسکرا پڑا۔ "میں کیا مون مارکیٹ جا رہا ہوں گولیاں ٹافیاں خریدنے...... وہ جیل کی لائبریری ہے' الفلاح کی کینٹین نہیں۔"

"جرح مت کر ماسٹر......" استاد نے نرمی سے کہا اور بات ختم کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا

دیا۔ ''تو کیوں میری انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی ہو جانا چاہتا ہے۔ کہا ناں......لائبریری جائے گا تو خود دیکھ لے گا کہ تیرے دشمن تیری جان لینا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

شیراز نے نہ چاہتے ہوئے بھی زبان روک لی۔ وہ سمجھ گیا کہ استاد سے اس معاملے میں اب کچھ اگلوالینا مشکل ہے۔

''شمشاد نے ایک پیغام دیا تھا استاد!'' شیراز نے بات بدلی۔

''مل گیا......اس کا پیغام بھی مل گیا اور بندوبست بھی ہو گیا۔''

جواب میں شیراز صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ویسے استاد......یہ شمشاد شے کیا ہے؟''

''شے......'' استاد نے کہا اور زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''بڑا اچھا لفظ استعمال کیا تو نے اس کے لیے ماسٹر......واقعی......وہ شے ہے۔ بڑی نادر اور انمول شے......''

''تمہاری بڑی عزت کرتی ہے استاد......''

''اس کی مہربانی ہے۔'' اس نے رواروی میں کہا۔ ''ورنہ وہ عزت نہ بھی کرے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لے گا۔''

''نہیں استاد......بات کو اڑاؤ مت......وہ عام عورت نہیں ہے۔''

''ہاں......یہ میں بھی جانتا ہوں۔ ارے وہ تو خود کو عورت ہی نہیں مانتی......عام اور خاص کی بحث تو الگ ہے۔''

''استاد......اس نے ایک عجیب بات کہی......''

''کیا؟'' استاد کے لہجے میں دلچسپی عود آئی۔ ''ویسے تو اس کی ہر بات عجیب ہوتی ہے ماسٹر......تجھے کون سی ایک بات عجیب لگی؟''

''اس نے کہا استاد...... کہ استاد کے بعد میں دوسرا آدمی ہوں جس نے اسے عورت سمجھا۔''

ایک دم استاد کو چپ لگ گئی۔

اس کے کچھ کہنے کے لیے کھلتے ہونٹ آہستہ سے ایک دوسرے پر جم گئے۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور زنداں کی سنگلاخ چھت کو گھورنے لگا۔

کتنے ہی لمحے چپ کے زہر میں بجھتے ہوئے گزر گئے۔

ظہور اور امتیاز دونوں چادریں اوڑھے سو رہے تھے۔ شیراز نے ایک نظر ان کا جائزہ لیا پھر دوبارہ استاد کی طرف متوجہ ہو گیا جواب بھی کسی بت کی طرح بے زبانی کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

''تم نے کچھ کہا نہیں استاد؟'' شیراز نے دھیرے سے کہا۔

''کیا کہوں ماسٹر......'' دو تین لمحوں کے بعد استاد نے نظروں میں شیراز کو تولتے ہوئے پاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس نے ایک بات کہی۔ اس کا مزہ لے اور بھول جا۔''

''ہر بات بھول جانے کے لیے نہیں ہوتی استاد......'' شیراز نے ضد کا دامن تھام لیا۔ ''یہ بات اپنے اندر بہت بڑا مفہوم چھپائے ہوئے ہے۔ مجھے اس سے آشنا کر دے استاد۔ شمشاد کو میں نے عورت' صرف جسمانی طور پر عورت ہونے کے ناطے سمجھا اور کہا مگر جو بات اس نے تمہارے بارے میں کہہ کر ساتھ مجھے لپیٹ لیا وہ اندر کی بات ہے۔ استاد تم نہیں بتاؤ گے تو میں دماغ تھکاتا رہوں گا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں پھر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ اسی سے پوچھ لیتا۔''

''آج رات پھر بھجوا دوں اس کے پاس تجھے......'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسی سے پوچھ لینا۔''

''نہیں استاد......'' شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے سارے زخم تمہارے سامنے کھلے پڑے ہیں۔ پھر تم اپنا سینہ کیوں ڈھانپے ہوئے ہو۔ کیوں اس پر راز داری کی چادر ڈالے ہوئے ہو۔''

''کوئی راز داری نہیں ماسٹر......'' استاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''بس وہ کوئی ایسی خاص بات ہے نہیں جس کا شمشاد نے بتنگڑ بنا دیا۔''

''میں نے عام خاص نہیں ایک بات پوچھی ہے استاد......اور تمہیں بتانا ہو گی۔ بس!'' شیراز باقاعدہ مچل گیا۔

''بچہ ہے تو ماسٹر......'' استاد نے ہنستے ہوئے اسے پیار سے دیکھا۔ ''یوں ضد کر رہا ہے جیسے کھلونا دیکھ لیا ہو۔''

''تم جو بھی سمجھو......جو بھی کہو استاد...... مگر اب چپ نہ رہو۔ بول دو۔ کہہ دو' جو تم کسی اور سے نہیں کہتے۔''

''ہاں...... تم سے کہہ سکتا ہوں ماسٹر......'' استاد نے سر جھکا لیا۔ ''اس لیے کہ تم اندر سے بھرے ہو......بات کو سمجھ سکتے ہو۔ اپنوں کے ڈسے ہوئے ہو۔ بات کا مول جانتے ہو۔ انتقام اور انا کے تحت الثریٰ میں اترتے جا رہے ہو۔ بات کی تہہ میں بچھے سیپ چن سکتے ہو۔''

شیراز خاموش رہا۔ وہ ایک لفظ بھی بول کر استاد کو پٹڑی سے اتارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''سنو ماسٹر......'' استاد نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرا رہی تھی۔ ''دو سال پہلے کی بات ہے۔ میں بازارِ حسن سے اپنی گاڑی میں گزر رہا تھا۔ اکثر گزرتا تھا۔ مجھے پھجے کے سری پائے بہت پسند تھے۔ اس کی دکان پر جا کر کھانے کا الگ ہی مزہ ہے۔ میرے ساتھ رانا ،ور

شوکت بھی تھے۔گھاٹی سے گاڑی شوکت نے اندر کی طرف موڑی تو کسی عورت کی چیخ سن کر میں چونک پڑا۔وہ گالیاں بک رہی تھی اور جھگڑ رہی تھی۔شاید کوئی اس سے زبردستی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوکت...... گاڑی روکو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا ہوا استاد؟" پچھلی سیٹ سے رانا سہیل نے پوچھا۔

اسی وقت وہ چیخ ایک بار پھر گونجی۔

"یہ چیخ سنی تم نے رانا۔" میں نے رکتی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھول کر قدم باہر رکھ دیا۔

"استاد...... کس چکر میں پڑ رہے ہو۔یہ یہاں کا روز کا پھڈا ہے۔ہوتا ہی رہتا ہے۔" رانا سہیل نے مجھے روکا۔

اسی وقت بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔فائرنگ کی تڑتڑ نے لوگوں کو چیخنے چلانے اور جدھر منہ اٹھا ادھر دوڑ لگا دینے پر مجبور کر دیا۔

میرے باہر آتے ہی شوکت اور رانا سہیل بھی گاڑی سے نکل آئے'رات کا وقت تھا۔روشنیاں اور گھنگھرؤوں کی چھنکار مل کر راگ رنگ کی محفلیں گرم کیے ہوئے تھیں۔مگر اس ہنگامے نے وقتی طور پر لوگوں کے حواس گم کر دیئے اور وہ رقص و سرور کو بھول کر جائے پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

میں نے سمت کا اندازہ لگایا۔

آوازیں ایک عمارت کی سیڑھیوں سے آرہی تھیں۔پھر اچانک ان سیڑھیوں سے چار پانچ آدمی ایک عورت کو کھینچتے ہوئے باہر بازار میں آگئے۔عورت کے کپڑے جگہ جگہ سے مسلے اور دو تین جگہ سے پھٹ بھی چکے تھے۔اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔وہ حسن کی مورت تھی جو اس وقت ان پانچ آدمیوں سے اکیلی بھڑی ہوئی تھی اور ان کے قابو نہ آرہی تھی۔وہ کسی کا چہرہ نوچ لیتی۔کسی کو تھپڑ مار دیتی۔کسی کے دانت گاڑ دیتی اور کسی کو لات کا نشانہ بنا دیتی۔اس کے ساتھ اس کی گالیاں اگلتی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

اور......

کوئی بھی آگے بڑھ کر اسے چھڑانے کو تیار نہ تھا۔

کیونکہ ان پانچ میں سے تین کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ان میں سب سے آگے شاید ان کا سرغنہ تھا۔کیونکہ وہ سوائے وقفے وقفے سے کلاشنکوف کا ہوائی برسٹ مارنے کے اور کچھ نہ کر رہا تھا اور اس عورت کی گالیوں کا اول و آخر نشانہ بھی وہی تھا۔

"ارے......یہ تو یہاں کا کونسلر ریاض حامد ہے۔" رانا سہیل نے چونک کر اس سرخیل کو

دیکھا۔

"اور یہ عورت......"

"اسے میں نہیں جانتا۔یہ یہاں کی کوئی طوائف ہوگی۔"

"یہ شمشاد بائی ہے سر......" شوکت نے زبان کھولی۔"بڑی جی دار اور با اصول طوائف ہے۔خود دھندا نہیں کرتی اور لگتا ہے کونسلر کا اس پر دل آ گیا ہے'جو اسے اٹھائے لیے جا رہا ہے۔"

"جب وہ دھندا نہیں کرتی تو یہ کون ہوتا ہے اسے زبردستی لے جانے والا۔" میں نے قدم آگے بڑھایا۔

"استاد...... سنبھل کے......وہ مسلح ہیں۔" رانا سہیل نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

"تم کیا میرے پیچھے نوحے پڑھنے آئے ہو'کور کرو مجھے۔" میں نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

فوراً ہی رانا اور شوکت نے نشست لے لی۔وہ گاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔پھر ایک ساتھ چھ گولیاں یکے بعد دیگرے فائر ہوئیں۔ریاض حامد اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھوں سے کلاشنکوفیں نکل کر دور جا گریں۔وہ کراہ کر چیختے ہوئے اپنے زخمی ہاتھوں کو رانوں میں دبائے دائیں بائیں لڑھکے تو میں لپک کر ان کے سر پر جا پہنچا۔اگلے ہی لمحے رانا اور شوکت بھی میرے پاس کھڑے تھے۔

میں نے جاتے ہی شمشاد کو دھکا دے کر ایک طرف کیا اور اس کو دونوں چمچوں کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

اسی وقت ریاض حامد نے زخمی ہونے کے باوجود مجھ پر چاقو سے وار کیا اور میں کراہ کر رہ گیا۔میرا بایاں شانہ اس کے لگائے ہوئے زخم کے نتیجے میں لہولہان ہو گیا۔ایک دم میں پاگل سا ہو گیا۔رانا اور شوکت نے ریاض حامد پر گولی چلانا چاہی'مگر ان سے پہلے میں نے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین کر اس کی گردن کاٹ ڈالی۔پھر اس کے قریب موجود دو ساتھیوں کی شہ رگ کٹی۔آخر میں رانا اور شوکت کے روکتے رہنے کے باوجود میں نے ریاض حامد کے بھاگتے ہوئے دونوں زخمی ساتھیوں کی گردنیں بھی یوں کاٹ ڈالیں'جیسے وہ انسان نہ تھے بکرے تھے۔

بازار میں سناٹا چھا گیا۔

طوائفیں اپنی بالکونیوں اور کھڑکیوں سے چھپ چھپ کر جھانک رہی تھیں۔دلال اور بھڑوے کونوں کھدروں میں جا چھپے۔دکانداروں نے شٹر گرا دیئے۔روشنیاں' بازارِ حسن کی روشنیاں ہم

چاروں کو حیرت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہی تھیں۔

اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے میں نے لہولہان چاقو ریاض حامد کے قدموں میں پڑے مردہ جسم پر پھینکا اور پلٹا۔

گم صم کھڑی شمشاد مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اسے اغوا کرنے کے لیے آنے والے پانچوں آدمیوں کو میں نے زخمی ہونے کے باوجود جہنم واصل کر دیا ہے۔

میری نظر اس کے نیم عریاں مرمریں بدن پر پڑی۔ رانا سہیل اور شوکت نے ریوالور جیب میں ڈال لیے اور آگے بڑھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان کو روک دیا۔ پھر شوکت کے کندھوں پر پڑی چادر کھینچ لی۔

شمشاد نے مجھے حیرت کے مارے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جب میں نے وہ چادر کھول کر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

"جاؤ...... اپنے گھر کے اندر چلی جاؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے چادر سے اس کا بدن پوری طرح ڈھانپ دیا۔

"تم ...... تم......" وہ مجھے قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "کون ہو تم......؟"

"کوئی نہیں ...... بس اب جاؤ۔" میں نے رخ پھیر لیا۔

"یہ......یہ......پانچ آدمی تم نے میرے لیے مار ڈالے۔" وہ دیوانوں کے سے انداز میں بولی۔

"تمہارے لیے نہیں۔ ایک عورت کے لیے...... تمہاری جگہ کوئی بھی اور عورت ہوتی تب بھی میں یہی کرتا۔"

"عورت......" وہ بُری طرح چونکی۔ "تم نے مجھے عورت کہا؟"

"تو اور کیا کہوں...... تم عورت نہیں ہو کیا؟" میں تلخی سے بولا۔

"نہیں...... میں تو طوائف ہوں۔ عورتیں اس طرح بازاروں میں برہنہ تو نہیں کی جاتیں۔ انہیں ان کی مرضی کے خلاف دھندا کرنے کے لیے اغوا تو نہیں کیا جاتا۔"

"کیا جاتا ہے۔ عورت کے ساتھ ایسا کہیں بھی اور کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اکثر عورتیں تمہاری طرح احتجاج نہیں کرتیں۔ چپ چاپ بے آبروئی کی سولی پر چڑھ جاتی ہیں۔ اگر تم خاموشی سے یا اپنی مرضی سے ان درندوں کے ساتھ جا رہی ہوتیں، تو میں بھی اس وقت بیٹھے سری پائے کھا رہا ہوتا۔ تمہارے احتجاج، تمہاری مدافعت نے مجھے آواز دی، تو مجھے پلٹنا پڑا۔ میں اپنے

کان اور آنکھیں بند نہیں رکھ سکا۔"

"میں نے پوچھا تھا کون ہو تم......؟ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ نثار ہو جانے کے انداز میں بولی۔

"رؤف...... استاد رؤف کہتے ہیں مجھے...... بس اب جاؤ۔" میں نے رانا سہیل کی طرف دیکھا جو مضطرب ہو رہا تھا۔

"استاد...... پولیس......" اس نے دور سے پولیس سائرن کی آواز کی طرف میرا دھیان دلایا۔

"استاد...... نکل چلو۔ یہاں ہمیں دھر لیا گیا تو مشکل ہو جائے گی۔" شوکت نے بھی بے چینی کا اظہار کیا۔

میں نے ایک نظر شمشاد کی طرف دیکھا، جو بڑے عجیب انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس نے جسم پر لپٹی ہوئی چادر کھول کر شوکت کی طرف اچھال دی۔

"استاد...... مجھے ڈھانپنا ہے تو اپنے کپڑے سے ڈھانپو...... ورنہ میں یونہی عریاں اپنے کوٹھے تک چلی جاؤں گی۔" بڑے سرد لہجے میں اس نے کہا۔

"اس کا مطلب سمجھتی ہو۔" میں نے اس سے زیادہ سرد لہجے میں کہا۔

"سمجھتی ہوں تبھی تو کہہ رہی ہوں۔" وہ تڑ سے بولی۔

میں نے گلے سے مفلر نکالا اور اس کے سینے پر ڈال دیا۔

"اب چلی جاؤ...... میری عزت کو تماشہ نہ بناؤ۔"

"جب لے جانا چاہو...... آ جانا استاد...... آج سے شمشاد تمہارے نام لگ گئی۔ تمہارے نام پر بک گئی۔" شمشاد نے کہا اور پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

"نکلو استاد......" شوکت نے میرا ہاتھ تھام کر کھینچا اور ہم تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔

پولیس کے آنے سے پہلے ہماری گاڑی واپس گھاٹی پار کر گئی۔

دوسرے دن پولیس میرے گھر آ دھمکی۔ بازارِ حسن کے کسی ٹاؤٹ نے میری مخبری کر دی تھی۔ میں نے خاموشی سے گرفتاری دے دی۔ میرا دل ہی نہ چاہا کہ اپنے جرم سے انکار کر دوں۔ اگر میں گرفتار ہونا نہ چاہتا یا جرم سے انکار کر دیتا تو نہ مقدمہ چلتا، نہ سزا ہوتی۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ سب کچھ میری مرضی سے ہوتا، مگر...... نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ ایک عورت کی خاطر کیا ہوا یہ جرم ہنس کر طوق کی طرح اپنے گلے میں ڈال لوں۔ عدالت میں پہلی سے دوسری پیشی نہ پڑی۔ میں

نے جج سے کہا کہ پوری بات سن کر جو فیصلہ دینا ہے آج ہی دے دینا۔ رانا سہیل اور شوکت کی گواہی میرے حق میں تھی، پھر بھی پانچ خون کیے تھے میں نے۔ بے شک عورت کی حفاظت کی خاطر مگر تھے قتل۔ جج نے مجھے کم از کم سزا دی پانچ سال قید۔ وہ بھی اس لیے کہ قتل ہونے والے جرائم پیشہ اور کیسوں میں مطلوب تھے۔ میں نے عدالت میں کھڑی شمشاد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھی نہ اداسی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی۔ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی وہ مرمر کی مورت بڑے ٹھہرے ہوئے قدموں کے ساتھ میرے قریب آئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔

''دنیا میں عورت کے لیے ہمیشہ سے قتل ہوتے آئے ہیں استاد...... مگر وہ عورتیں یا تو کسی ضد تھیں یا محبوبائیں...... میں کہہ سکتی ہوں کہ میرے لیے بھی پانچ قتل ہوئے۔ اس وقت جب میں طوائف سے عورت بنی۔ صرف عورت...... میرے لیے ایک آدمی نے پانچ قتل اس وقت کیے میں اس کے لیے کچھ بھی نہ تھی...... ایک طوائف بھی نہیں...... مگر جب اس نے میری خاطر درندے مار ڈالے تو وہ میرے لیے سب کچھ ہو گیا۔ میں اس کے لیے طوائف سے عورت بن گئی زندگی میں کبھی کیا میں ہر روز جب یہ سوچوں گی کہ تم نے میرے لیے پانچ آدمی مار ڈالے تھے، تو تمہا جیل میں گزرا ہوا ایک اور دن کم ہو جائے گا اور میرے دل کا موسم، بہار سے ایک قدم اور قریب جائے گا۔ یہ پانچ سال پانچ صدیاں بھی بن گئے استاد...... تب بھی شمشاد کو چشم براہ پاؤ گے، ضروری نہیں تم مجھے اپنی بیوی بنانے کے لیے ہی لینے آؤ...... نہ استاد نہ...... اپنے بچوں کی آیا، بیوی کی نوکرانی بنا کر یا اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے بھی لے جاؤ گے تو میرے انتظار کا بھی عا رہے گا۔ یہ پہلی نظر کی مستی ہے استاد...... مر کر بھی نہیں اترنے والی۔ جاؤ...... تمہیں اس اللہ کے حوالے کیا استاد...... جس نے تمہیں میری حفاظت کے لیے بھیجا تھا۔''

وہ بے اختیار میرے قدموں میں جھک گئی۔ میرے پیروں کی خاک مانگ میں سجائی میرے ہاتھوں کو بوسہ دے کر ایک طرف ہو گئی۔

میں عدالت سے نکلا تو وہ اپنی جگہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ نظریں اٹھائیں نہ قدم...... میں نے چاہا اسے پلٹ کر دیکھوں...... پھر ضبط کر لیا۔ اگر پلٹ کر دیکھ لیتا تو آسانی سے جا نہ سکتا۔ اس کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو میرے راستے میں کھائیاں پیدا کر دیتے ماسٹر...... میں پولیس وین میں بیٹھ اور جیل چلا آیا۔ دو سال ہو گئے۔ نہ اسے دیکھا۔ نہ وہ ملاقات کو آئی نہ فون پر بات کی۔ کبھی شوکت رانا کے ہاتھ اس کا کوئی سندیسہ مل جاتا ہے۔ کبھی مجھے اس سے کام پڑ جائے تو کہلا بھیجتا ہوں۔ دونوں طرف ضبط اور انتظار کا دور چل رہا ہے...... جذبوں کے جام بھرے ہوئے ہیں۔ چھلکنے سے بچا رہے

ہیں۔ ایک دن آئے گا جب یہ جام ہونٹوں تک پہنچیں گے۔ تب...... شہنائی بجے گی۔ سہاگ گایا جائے گا۔ آنکھیں وصل سے تازہ ہوں گی۔ پیاس نکھرے گی اور سکون لہو میں رچ بس جائے گا۔ وہ دن جب چاہوں قریب آ سکتا ہے ماسٹر...... مگر میں چاہتا ہوں، وہ اپنی چال چل کر آئے۔ مستانہ مستانہ...... رقصاں رقصاں، مدہوش مدہوش...... سیراب سیراب......''

استاد کی آواز تھم گئی۔

اس کا سر سینے پر اور جھک گیا۔

اسی وقت شیراز نے محسوس کیا، جیسے بیرک میں وہی مسحور کن خوشبو جھونکے کی طرح در آئی ہو، جو پہلی بار اسے کل رات شمشاد کے تہ خانے میں محسوس ہوئی تھی۔

خوشبو بگولے کی طرح اس کے گرد طواف کر رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید اگربتی یا پرفیوم کی خوشبو ہے۔ مگر نہیں وہ تو بڑی انوکھی، ملائم اور تھپکیاں دیتی ہوئی خوشبو تھی اور پھر یہاں زنداں میں پرفیوم یا اگربتی کہاں سے آئے۔

اسی وقت استاد نے بھی سر اٹھایا۔ وہ خوشبو اسے بھی محسوس ہوئی۔

''استاد...... یہ خوشبو......؟'' شیراز نے کہا۔

''ہاں...... میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔'' استاد نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ شیراز جانتا تھا استاد اپنی آنکھوں کی نمی خشک کر رہا ہے، مگر وہ اسے جتانا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ کیسی انوکھی خوشبو ہے استاد...... سکون اور طمانیت دیتی ہوئی مہک......'' شیراز نے کہا۔

''کیا اس سے پہلے بھی کبھی محسوس کیا ہے اسے؟''

''کل رات شمشاد کے تہ خانے میں پہلی بار احساس ہوا تھا۔ وہاں سے یہ گاڑی تک جیسے میرے ساتھ آئی...... اب دوسری بار محسوس کر رہا ہوں۔'' شیراز نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''کسی اپنے کی خوشبو ہے ماسٹر...... کوئی بہت اپنا ہے۔ ماں جیسا پیار کرنے والا۔ باپ جیسی حفاظت کرنے والا۔ تجھے خطرے میں پا کر تڑپ کر پروں میں چھپا لینے والا۔''

''ایسا اپنا کون ہو سکتا ہے استاد؟'' شیراز نے سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''ایسا اپنا تو میں خود نہیں ہوں اپنے لیے۔''

''کوئی تو ہے ماسٹر......'' استاد نے اسے بڑی گہری اور عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''جو تجھے اداس اور پریشان نہیں دیکھ سکتا اور دلاسہ دینے چلا آتا ہے۔ یاد کر ماسٹر...... کل رات تو کس قدر خطرے میں تھا۔ اگر وہ دونوں تجھ پر فائرنگ شروع کر دیتے تو......''

''ہاں استاد...... ایک عجیب بات پر تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ اب یاد آ رہی ہے۔ میں

اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر چکا تھا۔

استاد...... جب انہوں نے مجھ پر تاننے کے لیے ریوالور نکالنا چاہے تو ان کی گولیوں کی بیلٹیں تو موجود تھیں مگر ہولسٹر خالی تھے۔ ریوالور کہاں گئے؟ وہ خود حیران تھے۔ پھر میں نے ان کو مہلت ہی نہیں دی اور وہ میری گولیوں کا لقمہ بن گئے۔ مگر استاد اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر ان کے ریوالور گئے کہاں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں ماسٹر...... مگر مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہے...... کوئی نادیدہ وجود جو تیری پریشانی میں تیرا محافظ اور غم گسار ہے۔ یہ خوشبو اسی کی ہے۔ مان لے ماسٹر...... میں نے روحانیات کو زیادہ نہیں پڑھا نہ اس کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں' مگر میں نے سنا ہے کہ نیک' معصوم اور بے پیار کرنے والوں کی روحیں خوشبو اور مہک دیتی ہوئی انسان تک چلی آتی ہیں۔''

''روحیں......؟'' شیراز چونکا۔

''ہاں ماسٹر...... میرا دادا کہا کرتا تھا کہ عشق کی حد تک چاہنے والے لوگوں کی روحیں اپنے پیاروں کو کبھی مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑتیں اور ان کی آمد ہمیشہ خوشبو' پھول اور روشنی کی شکل میں ہوتی ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے' استاد...... جو مجھے اس طرح چاہتا ہے؟'' شیراز پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''اب یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں ماسٹر...... تیرے سب پیاروں کو تو میں نہیں جانتا۔'' استاد نے شانے اچکائے۔

''استاد...... خوشبو مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی ذرا دیکھو۔'' اسی وقت شیراز نے اِدھر اُدھر سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ایسا ہی ہے۔'' استاد نے تائید کی۔ ''ارے...... گیارہ بج گئے۔ یہ مردے ابھی تک نہیں جاگے۔'' اچانک اس نے رسٹ واچ اور پھر ظہور اور امتیاز پر نظر ڈالی۔

''جگا دوں انہیں......؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہم جاگ رہے ہیں استاد......'' اچانک ان دونوں نے چادریں ہٹا دیں۔ استاد کی ہنسی نکل گئی۔

''الو کے پٹھو...... کیا چوری چوری ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

''ہاں استاد......'' وہ دونوں اٹھے اور بچوں کی طرح آ کر اس سے لپٹ گئے۔ ''ہمیں تو آج پتہ چلا ہماری استانی بھی موجود ہے۔''

''بکومت۔ چورو...... سب سن لیا تم نے؟'' استاد ہنسے جا رہا تھا۔

''سب سن لیا استاد...... سب سن لیا۔ آج لگا، ہمارے باپ کے ساتھ ساتھ ہماری ماں بھی ہے اس دنیا میں۔'' وہ آبدیدہ سے ہو گئے۔

استاد پیار سے ان کے شانے تھپکتا رہا۔ شیراز کو ہنستا مسکراتا استاد اتنا اچھا لگا کہ وہ کتنی ہی دیر اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

''ناشتہ کر لو۔ میں اور ماسٹر تو کر چکے۔ تمہارا حصہ پڑا ہے۔ جاؤ۔'' استاد نے ان کو پیار سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اٹھے اور کونے میں رکھے کولر کی طرف بڑھ گئے۔ جو ان کے لیے واش بیسن کا کام بھی دیتا تھا۔

''ماسٹر...... تو لائبریری چلا جا اور محتاط رہنا۔'' استاد نے شیراز کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے استاد......'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''سنتری بادشاہ۔'' استاد نے سلاخوں کے پار کھڑے سپاہی کو آواز دی۔

''جی استاد......'' اس نے اندر جھانکا۔

''ماسٹر کو لائبریری جانا ہے۔''

''جی استاد......'' اس نے اسی انداز میں کہا اور دروازے کے قریب آتے شیراز کے لیے دروازہ کھول دیا۔



شیراز لائبریری میں دو گھنٹے گزار چکا تھا۔

وہ ایک دو اپنی پسند کی کتابیں نکال کر میز پر آ بیٹھا اور ان کو کھنگالنے لگا مگر اس کا جی نہ لگ رہا تھا مطالعے میں...... بار بار اسے استاد کی بات یاد آ جاتی۔

کیا ہونے والا ہے اس کے ساتھ؟

کیسے ہو گا؟

کب ہو گا؟

اس کا ذہن مختلف سمتوں میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ بدر علی آج چھٹی پر تھا۔ شہاب سنتری نے اس کے لیے لائبریری کا دروازہ کھولا اور اب باہر دوسرے سپاہیوں کے ساتھ بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔

''میاؤں......'' اچانک وہ بلی کی آواز سن کر چونک پڑا۔ جھک کر دیکھا۔ اس کے پاؤں کے قریب ایک چتکبری بلی بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"ارے...... یہ کہاں سے آ گئی؟" اس نے سوچا۔ پھر اسے پچکارا تو وہ اچھل کر اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی۔

وہ پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ بلی نے میاؤں میاؤں کی آوازیں نکالیں اور آنکھیں موند کر چہرہ اگلے پنجوں پر رکھ لیا۔ اس کرسی پر دروازے سے آنے والی دھوپ پڑ رہی تھی۔ نرم نرم اور ہلکی ہلکی آنچ دیتی دھوپ میں بلی یوں آرام کر رہی تھی' جیسے گرم گرم بستر میں کوئی بچہ نیند کے ہلکورے لے رہا ہو۔

اسی وقت کمرے سے باہر برتن کھنکھنانے کی آواز ابھری۔ شاید سپاہیوں نے چائے منگوائی تھی۔ شیراز کا جی چاہا گرم گرم چائے کے کپ کے لیے...... مگر وہ ان سے کہنا نہ چاہتا تھا۔ پیسے اس کی جیب میں موجود تھے' تاہم وہ خاموش بیٹھا بلی کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

تھوڑی دیر گزر گئی۔ پھر باہر سے سپاہیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں اس کے کان میں پڑیں۔

"ویسے یار شہاب...... آج کیا خاص بات ہو گئی کہ تو سب کو چائے پلا رہا ہے۔ کنجوس مکھی چوس۔ تجھ سے تو عید شبرات پر پانچ روپے نکلوانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ آج کس خوشی میں سخاوت ہو رہی ہے؟"

"ارے بس یار...... ایسے ہی جی چاہا۔" شہاب کی شرمندہ شرمندہ آواز ابھری۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"تو کہتا ہے تو مان لیتا ہوں۔" اسی سپاہی نے پھر کہا۔ "ویسے بات ماننے والی ہے نہیں۔"

"خاموشی سے چائے پی۔ بک بک مت کر۔" شہاب نے اسے ڈانٹا۔ "ایک تو پلّے سے چائے پلاؤ اوپر سے باتیں بھی سنو۔"

"اچھا بھئی اچھا...... ناراض مت ہو۔ میں چپ ہوا جاتا ہوں۔" سپاہی نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ایک دو لمحوں بعد اس کی آواز پھر ابھری۔

"یار شہاب...... یہ جو اندر قیدی موجود ہے۔ لگتا تو پڑھا لکھا ہے۔"

"ہاں یار...... کسی جگہ پڑھاتا تھا۔ پروفیسر ہے۔" شہاب نے جواب دیا۔

"اچھا...... پھر بھی جرم کر ڈالا۔"

"جرم کیا ہے یا نہیں' یہ تو پتہ نہیں۔ جیل ضرور کاٹ رہا ہے۔"

"مطلب؟"

"یار...... مجھے لگتا ہے یہ بے گناہ ہے۔"

"تیرے لگنے کی کیا بات ہے۔ تجھے تو ہر وہ شخص بے گناہ لگتا ہے جو تجھے سو پچاس تھما دے۔ اس نے بھی مٹھی گرم کر دی ہوگی تیری۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اس سے میری بات ہوئی ہے۔ اس کی باتوں سے یہی لگتا ہے کہ یہ بے گناہ ہے۔"

"پھر تو تو بڑا بے شرم ہے۔"

"کیا ہوا؟" شہاب نے حیرت سے پوچھا۔

"دو کپ چائے اکیلا پی گیا ہے۔ ایک کپ اسے دے دیتا۔ اس میں ایک چانس بھی تھا۔"

"وہ کیا؟"

"تیری چائے کے پیسے بھی وہی دے دیتا۔" سپاہی نے آواز دبا کر کہا۔

"ہٹ سالے۔" شہاب کی ہنسی نکل گئی۔ "ویسے بات تو نے پتے کی کہی ہے۔" وہ بھی آواز دبا کر بولا۔ "ابھی چائے والا آتا ہے برتن لینے تو اس کے لیے بھی چائے منگواتے ہیں۔ پھر بل تو وہی دے گا۔"

"بدتمیز...... تو تو سیریس ہی ہو گیا۔" دوسرا سپاہی پھر ہنسا۔

"خاموش...... کہیں سن نہ لے۔" شہاب نے آواز ہلکی کر کے اسے پھر ڈانٹا۔

شیراز کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔ قدرت اس کی چائے کی طلب کس طرح پوری کرنے جا رہی تھی۔

اسی وقت شہاب نے اندر دیکھا۔

"چائے پینے کا موڈ ہے پروفیسر؟"

"مل جائے تو مہربانی ہے شہاب جی!" شیراز نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ابھی لڑکا برتن لینے آتا ہے تو منگوائے دیتا ہوں۔" وہ کہہ کر دروازے سے ہٹ گیا۔

شیراز نے کتاب کھول لی اور نظریں سطروں پر دوڑانے لگا۔

تقریباً دس منٹ بعد چائے کے برتن لینے کے لیے بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا آیا۔

"ابے...... برتن لے جا اور ایک کپ...... نہیں...... تین کپ گرما گرم چائے کے اور لے آ۔ ملائی ولائی ڈال کے۔"

"اور پیسے؟" لڑکا برتن اٹھا کر بولا۔

"اکٹھے ہی لے جانا۔ بس جا...... اور جلدی آنا۔" شہاب نے اسے ٹرخایا۔ لڑکا خاموشی سے لوٹ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تین کپ ٹرے میں رکھ کر لے آیا۔ شہاب نے ٹرے لے لیا۔ لڑکا لوٹ گیا شہاب نے دوسرے سپاہی سے کہا:

''نادر...... پانی کا گلاس تو پکڑ یار۔ پیاس لگ رہی ہے۔''

نادر اٹھ کر لائبریری کے اندر رکھے کولر کے پاس چلا آیا اور پاس پڑے گلاس میں وہ پانی لے باہر گیا۔ شہاب نے پانی پیا اور چائے کا کپ نادر کو تھما دیا۔ ''اندر دے آؤ۔''

''لو جی چائے پیو۔ گرما گرم اور ملائی والی۔'' نادر نے کپ اس کے پاس میز پر رکھ دیا۔

''شکریہ بھائی......'' شیراز نے مسکرا کر کہا اور آنکھیں کھول کر اونچا ہو کر میز پر رکھے کے کپ کو دیکھتی بلی کو دیکھنے لگا۔

نادر باہر چلا گیا۔ شیراز نے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اسی وقت وہی مانوس اور نایاب خوشبو کا جھونکا جیسے بے چین سا ہو کر کمرے میں داخل ہوا اور سیدھا شیراز پر سائبان ہو گیا۔

شیراز کا ہاتھ بے ساختہ کپ سے ٹکرایا اور چائے چھلک کر میز پر پھیل گئی۔ ٹھیک اسی وقت اس کے دماغ میں استاد کی آواز گونجی۔

''کھانے پینے کی کوئی بھی شے حلق میں اتارنے سے پہلے میری بات یاد کر لینا۔'' خوشبو جیسے اس کے دل و دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت بلی نے اگلے دونوں پنجے میز پر رکھے اور زبان سے میز پر گری ہوئی چائے چاٹنے لگی۔

پھر...... ایک لمحہ گزرا ہو گا کہ وہ بڑی کریہہ اور اذیت ناک چیخ کے ساتھ پیچھے کو الٹ گئی۔ فرش پر گری اور پھر تڑپتی ہوئی اٹھی دو دو فٹ اچھلی۔ تیسری بار فرش پر گری تو پھر نہ اٹھ سکی۔ اس کے منہ سے سرخ سرخ خون ابل پڑا اور وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔ شیراز کرسی پیچھے کھسکا کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اب پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بلی کی چیخوں کو سن کر نادر اور شہاب اندر چلے آئے۔ پھر شہاب نے جیسے سارا معاملہ بھانپ لیا۔

''ارے...... یہ بلی کو کیا ہوا؟'' وہ گھبرا کر آگے بڑھا۔ نادر اس کے ساتھ تھا۔

''یہ تو مر گئی......'' نادر نے جلدی سے کہا۔

''ہاں...... مگر کیسے؟'' شہاب نے سراسیمہ نظروں سے شیراز کی جانب دیکھا۔

''میز پر چائے گری جو اس نے چاٹ لی۔'' شیراز نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ارے......'' شہاب بری طرح چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے...... چائے زہریلی تھی؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

چلو رانا صاحب کو خبر کریں۔'' نادر نے باہر کو قدم بڑھایا۔

''پاگل ہوئے ہو۔'' شہاب نے اسے روکا۔ سارا الزام ہم پر آئے گا۔ ہم نے اس کے لیے چائے منگوائی تھی۔ سمجھا کرو۔''

وہ آگے بڑھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جھک کر ایک شیلف میں دھنسا ہوا بڑا سا شاپنگ بیگ نکالا۔ بلی کو اٹھا کر اس میں ڈالا۔ منہ باندھا اور باہر کو چل دیا۔

''میں اسے کوڑے دان میں پھینک کر آتا ہوں۔ تم جلدی سے فرش اور میز صاف کر دو۔''

جاتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اسی طرح اٹھایا اور ساتھ لیتا گیا۔

نادر نے کچھ سمجھ میں نہ آنے کے انداز میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک اخبار دکھائی دیا۔ اس سے اس نے میز پر گری چائے اور فرش پر دو ایک جگہ پھیلا بلی کا خون صاف کیا۔ اخبار کو موڑ توڑ کر اکٹھا کیا اور خود بھی باہر نکل گیا۔

شیراز وہاں سے جانا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ وہ پرے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس جگہ پر نظریں جما کر کسی خیال میں گم ہو گیا، جہاں کچھ دیر پہلے بلی نے دم توڑا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ خوشبو کا وہ جھونکا جس بیقراری سے اس کے گرد چکر کاٹ رہا تھا وہ کیفیت ختم ہو چکی ہے۔ خوشبو بتدریج مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر جب شہاب اور نادر اندر آئے تو مہک مکمل طور پر رخصت ہو چکی تھی۔

''پروفیسر...... ایک گذارش ہے۔'' شہاب اس کے قریب آ کر لجاجت بھرے لہجے میں

شیراز نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ نادر اس کے ساتھ گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔

''خدا کے لیے اس بات کی بھنک کسی اور کے اور خاص طور پر رانا صاحب کے کانوں میں نہ پڑنے دینا ورنہ ہم بے موت مارے جائیں گے۔ یہ چائے کس طرح زہریلی ہوئی ہم نہیں جانتے، مگر اس کا سارا الزام ہم پر ہی آئے گا۔ ہم تمہارے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔''

شہاب کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر شیراز کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا، جب شہاب اس کے گاؤں کے تھانے کے سپاہی سعید سے ملا تھا۔ سعید نے اسے کوئی شے تھمائی تھی جو شہاب نے جیب میں ڈال لی تھی۔ اب وہ روپے تھے یا ان کے ساتھ زہر بھی تھا، یہ بات ذرا سا سوچنے پر صاف ہو جاتی تھی۔ وہ اس بات کو طول نہ دینا چاہتا تھا۔ اسے تو حیرت اس بات پر تھی کہ استاد کو اس بات کا علم کیسے ہو

گیا؟ اور اگر علم ہو گیا تھا تو اس نے اسے اتنا معمولی کیوں سمجھا کہ محض اسے محتاط رہنے کا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"پروفیسر...... خدا کے لیے۔" شہاب اس کے گھٹنوں پر جھک گیا۔

"ارے ارے...... یہ کیا کر رہے ہو۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں گا۔ تم سیدھے ہو جاؤ۔" شیراز نے اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔

نادر کے ساتھ ساتھ شہاب کے چہرے پر بھی سکون کی لہر دوڑ گئی۔

"ہم زندگی بھر تمہارے ممنون رہیں گے......" نادر نے پھیکی سی آواز میں کہا۔

"میں اب جانا چاہوں گا۔" شیراز اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ہاں۔ آؤ میں چھوڑ آؤں تمہیں۔ مگر...... اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ ورنہ ہم سولی چڑھا دیے جائیں گے۔"

"فکر مت کرو۔ سمجھو...... یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔" شیراز نے کہا اور جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیا۔

"یہ کیا؟" شہاب نے جلدی سے کہا۔

"چائے کے پیسے!" شیراز بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب ہم اتنے بھی احسان فراموش نہیں ہیں۔ یہ پیسے واپس اٹھا لو......"

"تم اس سے بھی زیادہ احسان فراموش ہو سکتے ہو شہاب۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شیراز کے لبوں سے نکل گیا۔ "سعید سے کہنا میرے بھائیوں تک یہ پیغام پہنچا دے کہ ان کا یہ وار خالی گیا۔ اب کچھ اور انتظام کریں۔" وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

نادر منہ پھاڑے شہاب کی طرف دیکھ رہا تھا، جس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ پھر وہ لرزتا ہوا کرسی پر گر پڑا۔



"اب بتا ماسٹر......" استاد نے شیراز کی ساری بات بڑے اطمینان سے سن کر بولا۔ "کیا اب بھی تجھے اپنے انتہائی اقدام پر پچھتاوا ہے۔ یقیناً نہیں ہونا چاہئے۔ یہی میں تجھے صبح سمجھانا چاہتا تھا کہ جب دو دشمن ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی طاقت آزماتے ہیں تو "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔" کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اگر تو اپنے دشمنوں کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے تو یہ تیری بھول ہے، غلطی ہے، جس کا خمیازہ تجھے کسی بھی وقت بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ ایک بات اور......" اسے بولنے کے لیے آمادہ ہوتے دیکھ کر استاد نے ہاتھ اٹھا کر روک

"کل رات جو کچھ ہوا اس کے پیچھے تیرا ہاتھ ہے، یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے خیال کی پرواز اونچی ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ جان سکیں کہ تو زنداں سے نکل کر ان پر جھپٹ سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے؟ یہی ناں کہ وہ اس سے پہلے تجھے دنیا سے چلتا کر دینے کے لیے اپنا وار کر چکے تھے۔ یعنی وہ نہیں چاہتے کہ تو زنداں میں بھی زندہ رہے۔ سانس لیتا رہے۔ تو نے بتایا کہ زہر اس قدر سریع الاثر کہ چند سیکنڈ میں بلی نے دم توڑ دیا۔ اب سوچ...... اگر وہ چائے کا گھونٹ تیرے حلق سے اترا ہوتا، تو...... تب کیا تو اس وقت یہاں میرے پاس رام کہانی سنانے کے لیے موجود ہوتا...... ہرگز نہیں ...... جن لوگوں کو تو ایک آنکھ نہیں بھاتا، جن کو تیرا زندہ رہنا گوارا ہی نہیں، جو تجھے پہلی فرصت میں نابود کر دینا چاہتے ہیں، ان کے لیے دل کو پتھر کر لے۔ ایسا پتھر جس میں کسی رشتے، کسی احساس کی پچھتاوے کی جونک نہ لگ سکے۔"

"میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں استاد۔" شیراز نے بولنے کا موقع پاتے ہی زبان کھولی۔ "مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تمہیں اس معاملے کی خبر کیسے ہوئی؟ اور اگر خبر ہو گئی تھی تو تم نے مجھے اصل صورت حال سے بے خبر کیوں رکھا؟"

"بے خبر کہاں رکھا؟" استاد نے حیرت سے کہا۔ "کیا صبح تجھے روانہ کرتے وقت محتاط رہنے کو نہیں کہا تھا؟"

"ہاں......" شیراز نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا۔ "اور اگر میں بے خیالی، بے دھیانی یا بھول سے چائے کو چکھ لیتا تو اس وقت اوپر پہنچ گیا ہوتا۔"

"پہلی بات......" استاد نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے یقین نہیں ہے کہ تیری یادداشت اتنی کمزور ہے یا تو نسیان کا مریض ہے ماسٹر کہ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے کی بات بھی تیرے دھیان میں نہ ہے۔ پھر میری...... استاد رؤف کی کہی ہوئی بات بھی اگر تو بے دھیانی اور بے خیالی کے قدموں میں بھینٹ کر کے چل رہا ہے تو مجھے اپنے آج تک کے رویے پر ریٹ لینا چاہئے۔ تیسری بات یہ کہ میں نے آج تجھے لائبریری بھیجا ہی اسی لیے تھا کہ تو دشمن کے وار کا انتظار کرے اور آخر دم تک میں تجھے یاد دلاتا رہا کہ تو وہاں کیوں بھیجا جا رہا ہے...... چوتھی بات یہ ہے ماسٹر...... کہ تو دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ تجھے آج سے پہلے جان لینا نہیں آتا تھا، اب تو وہ بھی آ گیا ہے۔ روٹی کو کھانے سے پہلے چھان پھٹک لینا چاہئے کہ اس پر کوئی چیونٹی تو نہیں چڑھ گئی۔ پھر چائے پینے سے پہلے تجھے میری بات آخری لمحوں میں کیوں یاد آئی؟ یہ تو تیرے آگے آج کے زبانی یاد کرنے والے سبق کی طرح استادہ ہونی چاہئے تھی۔"

"بس بس استاد......" شیراز گھبرا گیا۔ "تم تو بھگو بھگو کر مارنے پر اتر آئے۔"

"جی میرا بھی چاہ رہا ہے ماسٹر کہ آج تک کا سارا ادب بے ادبی میں بدل ڈالوں اور تجھے دو چار ہاتھ جڑ دوں مگر......"

"روکا کس نے ہے استاد......" شیراز نے اس کی طرف ممنونیت سے دیکھا۔ "تیرے ہاتھوں مار کھا کر شاید یہ نالائق شاگرد بھی کسی قابل ہو جائے۔"

"بکواس مت کر ماسٹر...... تو بولتا ہے تو اس کا آگا پیچھا نہیں دیکھتا۔ ارے پگلے...... کیا میں تجھے وہ چائے پینے دیتا۔ ظہور......" استاد نے گردن گھما کر ظہور کو آواز دی۔

"جی استاد......" وہ لپک کر قریب چلا آیا۔

"اسے بتا...... جب یہ لائبریری گیا تھا تو میں کہاں تھا؟"

"استاد تمہارے پیچھے نکل گیا تھا۔" ظہور نے شیراز کی طرف دیکھا۔ "اور جتنی دیر میں یہ واقعہ ہوا' استاد سارا وقت لائبریری کی کھڑکی کے پاس موجود رہا ہے۔"

"کیا؟" شیراز کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے یقینی سے استاد کی طرف دیکھا۔

"استاد......" اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ استاد نے جھٹکے سے گردن پھیر لی۔ دھیرے دھیرے شیراز کی آنکھوں میں بے یقینی کی جگہ نمی نے لے لی۔ "استاد...... یہ سچ ہے کیا؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہیں۔ ڈرامہ ہو رہا ہے' رام اور شیام کا۔" استاد نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"استاد......" شیراز نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "مجھے مارو استاد۔ مجھے مارو۔ میں نے کیسا بے مروت فقرہ کہہ دیا تم سے۔ مجھے تمیز ہی نہیں تم سے بات کرنے کی۔ مجھے مارو استاد......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بکواس مت کر ماسٹر۔" استاد نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ "پگلے...... تجھ سے تو میرا جنم جنم کا رشتہ لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے کہ میں تیرے لیے ہر حد سے گزر جانا چاہتا ہوں۔ اب بس کر۔ رو کر میرا جی مت جلا۔" استاد نے اس کا شانہ تھپک کر آہستہ سے الگ کر دیا۔

شیراز نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ ظہور اور امتیاز خاموش بیٹھے سب دیکھ رہے تھے۔

"اب پوچھ کہ مجھے اس معاملے کی خبر کیسے ہوئی؟"

شیراز نے سوالیہ نظروں سے استاد کی جانب دیکھا۔

"جس دن سعید' شہاب سے ملنے آیا مجھے اطلاع ہو گئی تھی۔ اس نے شہاب کو روپے' زہر کی پڑیا اور ایک خط دیا جو میرے آدمی نے اس کی جیب سے پار کر لیا۔ پھر زہر کی پڑیا اور روپے اس کی جیب میں واپس رکھے گئے تو خط بھی ساتھ تھا مگر اس کی فوٹو کاپی لے لی گئی' جو میرے پاس ہے۔"

استاد نے قمیض کی جیب سے ایک سفید تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور شیراز کے ہاتھ میں دے دیا۔

"پڑھ اسے......"

شیراز نے کاغذ کھولا اور اس کی تحریر پر نظریں دوڑانے لگا۔ صرف دو فقرے تھے' مگر ان کے اندر کیا طوفان کروٹیں لے رہا تھا اس کا اندازہ اس کے رنگ بدلتے چہرے سے بخوبی ہو گیا۔

شیراز نے زیرِ لب دہرایا۔

"میں خودکشی کر رہا ہوں۔ اپنی موت کا ذمے دار میں خود ہوں۔" نیچے اس کا نام لکھا تھا۔

"کچھ سمجھ میں آیا......" استاد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔

"سب سمجھ میں آ گیا......" شیراز نے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

"میری موت کو خودکشی قرار دے دیا جاتا۔ خط میری لاش کے قریب ملتا اور......"

"تائیں تائیں فش۔" استاد نے فقرہ پورا کر دیا۔ "ہر سننے والا یہی سمجھتا کہ تو نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کے اثر کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ اب جیل میں زہر کہاں سے آیا؟ کون لایا؟ کس نے منگوا کر دیا؟ یہ کون دیکھتا۔ چند دن انکوائری کے نام پر اتھل پتھل ہوتی۔ تیری پیروی کرنے والے تو خود تیرے مخالفین ہیں۔ کوئی آواز بلند ہوتی نہ کوئی احتجاج کرتا۔ تجھے لاوارثوں کی طرح دفنا دیا جاتا اور بس کھیل ختم......"

"کھیل تو اب شروع ہو گا استاد......" شیراز نے عجیب سے مگر دہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب میرے دماغ پر کوئی بوجھ ہے' نہ دل میں پھانس...... دشمن سامنے ہے اور وجہ صاف۔ مجھے بتاؤ استاد...... اب کیا کرنا ہے مجھے؟"

"بتاؤں گا۔ جلد بتاؤں گا۔" استاد نے اس کے بالوں میں زور سے انگلیاں پھیریں۔

"خود کو ٹینشن مت دے۔ ریلیکس ہو جا۔ بھول جا کہ تیرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"اور استاد...... وہ شہاب؟"

"اس کو رانا سنبھال لے گا۔ میں نے واپسی پر اسے بتا دیا تھا مگر اب تو ایک بات پلے باندھ لے۔"

"کیا استاد؟"

"کوئی کھانے پینے کی چیز اس بیرک سے باہر خود پر حرام قرار دے لے۔ ہاں...... جب تو زنداں سے باہر ہو تو جو جی چاہے کر مگر اندر رہتے ہوئے تجھے جو کھانا پینا ہے' حتیٰ کہ سادہ پانی بھی تو پئے گا تو ہمارے ساتھ۔"

"میں نے دل پر لکھ لیا استاد۔" شیراز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بیرک میں جو کچھ منگوایا جاتا ہے میرے اپنے اعتماد کے آدمی پہنچاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی پر بھروسہ مت کرنا...... سمجھا۔"

"سمجھ گیا۔ ویسے استاد...... اس خوشبو کے جھونکے نے تو آج کمال کر دکھایا۔ یقین کر مجھے بالکل ایسا لگا' جیسے اس کے دھکے سے چائے کا کپ چھلک گیا ہو۔"

"ایسا ہی ہوا ہوگا ماسٹر۔" استاد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "مجھے یقین ہے۔ تو نے جو محسوس کیا وہ درست ہوگا۔ اچھا ہے۔ کبھی میں قریب نہ ہوا تو تو اکیلا نہیں ہوگا۔ تیرا نادیدہ محافظ تیرے گرد حصار بن کر رہے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو استاد......" شیراز کسی سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولا پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "ارے ہاں استاد...... ایک بات اور......"

"کیا؟"

"نعیم اور شوکت' شمشاد کے ہاں سے کوئی چیز لے کر بھی آئے تھے؟"

"تجھے کیسے معلوم؟" استاد نے اسے بغور دیکھا۔

"واپسی پر شوکت نے نعیم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تین کلو مال ملا ہے۔ اس پر شوکت نے کہا کہ چلو رانا صاحب کے پندرہ دن تو نکل ہی جائیں گے۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"زیادہ دماغ مت کھپایا کر۔" استاد نے مسکرا کر دھیرے سے کہا۔ "تیرے ساتھ جانے والے تیرے لیے جان دینے والے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کیا کرتے ہیں تجھے اس سے کیا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے استاد...... میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا!" شیراز نے جلدی سے کہا۔

"اب اس بات کو دماغ پر بوجھ مت بنا لینا۔ وقت آنے پر تجھے اس بھید کا بھی علم ہو جائے گا۔"

"میں کوئی ٹینشن نہیں لے رہا استاد......" شیراز ہنس پڑا۔ "میں نے کہا ناں۔ ایسے ہی خیال آ گیا تو میں نے پوچھ لیا۔"

"لائبریری میں اخبار دیکھا تھا آج کا؟" استاد نے موضوع بدلا۔

"دیکھا تھا......"

"ان دونوں کی کوئی خبر آئی کہ نہیں......"

"نہیں استاد......" شیراز سمجھ گیا کہ استا کا اشارہ اکرم اور آصف کی طرف ہے۔

"حیرت ہے......" استاد نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق ان کے لواحقین کو ان کی لاشیں

رات کے آخری پہر مل گئی تھیں۔"

"اس وقت تک اخبار چھپ چھپا کر تقسیم ہونے کے لیے اخبار مارکیٹ پہنچ جاتے ہیں استاد...... اب یا تو دوپہر کے اخبار میں خبر آ سکتی ہے یا کل کے اخبار میں آئے گی اور لائبریری میں دوپہر کا اخبار نہیں آتا۔"

"اچھا اچھا۔" استاد مطمئن ہو گیا۔ "اب مجھے کیا معلوم بھائی کہ اخبار میں خبر چھپنے کا بھی کوئی خاص وقت ہوتا ہے۔"

اور یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے جب استاد کے موبائل نے انگڑائی لی۔

"ہیلو......" اس نے بٹن دبا کر موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو...... رانا بول رہا ہوں۔" دوسری جانب سے رانا سہیل کی آواز ابھری۔

"ہاں رانا صاحب...... بولو۔" استاد نے شیراز کی جانب دیکھا۔

"سعید اور شہاب اس وقت مسجد کے عقبی حصے میں موجود ہیں۔" رانا نے کہا اور موبائل آف ہو گیا۔ استاد کا ہاتھ بڑی آہستگی سے نیچے آیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ شیراز استاد کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں رانا کا کہا ہوا فقرہ گونج رہا تھا۔ خود اس کے جسم کے عضلات میں کھنچاؤ در آیا تھا۔

"آج عصر کی نماز پڑھ ہی لیں۔" استاد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شیراز نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"ظہور...... امتیاز...... تم دونوں ہماری واپسی تک چائے پانی کا انتظام کرو۔"

"جی استاد......" وہ بیک زبان بولے۔

"آ بھئی ماسٹر...... چلیں......" استاد دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سنتری نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر فوراً حرکت کی۔

"کھولو......" استاد نے آنکھوں سے دروازے کے لاک کی طرف اشارہ کیا۔

سنتری نے کوئی سوال جواب کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔ استاد' شیراز کو ساتھ لیے باہر نکلا اور کاریڈور میں بڑھتا چلا گیا۔

اسی وقت ظہور نے سنتری کو آواز دی اور وہ ظہور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کاریڈور میں کچھ آگے بڑھ آنے پر استاد نے شیراز کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ "میدان میں جاتے ہی تو مسجد کا رخ کرے گا ماسٹر...... میری فکر مت کرنا۔ میں تیرے قریب ہی رہوں گا۔"

کہتے ہوئے استاد نے ہاتھ بڑھا کر چپکے سے شیراز کے ہاتھ میں چھوٹا سا پسٹل تھما دیا۔

شیراز نے چونک کر پسٹل لیا اور خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نیفے میں اڑس لیا۔

کاریڈور سے نکل کر شیراز نے میدان میں قدم رکھا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ اس نے پیچھے پلٹ نہیں دیکھا کہ استاد پیچھے آ رہا ہے یا نہیں۔ اسے یقین تھا کہ استاد نے جو کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔ وہ پل پل اس کے اردگرد رہے گا۔

اسی وقت ...... اس کی ناک سے خوشبو کا ترو تازہ دلاسہ دیتا جھونکا ٹکرایا اور اس کے دل و دماغ میں توانائی سی بھرتی چلی گئی۔

اس کے قدم ایک ٹھہراؤ کے ساتھ اٹھتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ مسجد کے قریب ہوتے چلے گئے۔



مسجد کے اندر جانے کے بجائے شیراز ٹہلنے کے انداز میں بائیں طرف سے ہو کر اس کے عقبی حصے کے قریب آ پہنچا۔ مسجد کے محرابی حصے کے آگے کافی حصہ باغ جیسا تھا۔ وہاں گھاس اُگی ہوئی تھی اور تقریباً چالیس پچاس گز بعد جا کر زنداں کی چاردیواری تھی جو اپنے سر پر خاردار تاروں کی ایک مضبوط، گھنی اور عام افراد کے لیے ناقابلِ شکست باڑ کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔

محرابی حصے اور چاردیواری کے اس درمیانی گھاس آلود حصے پر کاٹھ کباڑ کا ایک وسیع جہان آباد تھا۔ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، میزیں، بالٹیاں، پلاسٹک کے ڈرم، گتے کے خالی ڈبے اور الم غلم اشیاء یہاں بھری پڑی تھیں۔ تاہم جگہ چونکہ کافی تھی اس لیے درمیان سے گزرنے کا راستہ بآسانی مل جاتا۔

مسجد کی دیوار ختم ہوتے ہی شیراز رُک گیا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ باتیں کرنے کی مدھم سی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی خاص طور پر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ فوراً زمین پر بیٹھا اور پاؤں کے بل سرکتا ہوا دیوار کے ساتھ دائیں طرف گھوم کر پلاسٹک ڈرم کی آڑ میں دبک گیا۔

محرابی حصے میں بھی دونوں کونوں پر ایک ایک کھڑکی بنائی گئی تھی جو حسبِ معمول اس وقت بھی کھلی تھی۔ یہ شاید تازہ ہوا کی آمدورفت کے لیے ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔

شیراز نے سر اٹھا کر دونوں کھڑکیوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نظریں محراب کے بالکل پاس یعنی تقریباً درمیان میں کھڑے باتیں کرتے دو سپاہیوں پر جم گئیں۔ وہ سعید اور شہاب تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے سرک کر کھڑکی سے آگے چلا گیا۔

ان کی باتوں کی آواز تو آ رہی تھی مگر پوری طرح سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔

شیراز نے دیکھا کہ ان دونوں کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی کی میز تھی جس پر شہاب کی رائفل پڑی تھی اور سعید کے ساتھ کھڑا وہ ایک کرسی سے ٹیک لگائے بول رہا تھا۔

شیراز نے بڑی احتیاط سے اپنے جسم کو حرکت دی اور پلاسٹک ڈرم کے ساتھ موجود خالی جگہ سے کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ یہ کام اس نے پیروں کے بل بیٹھے بیٹھے کیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ لوگ باخبر ہو جاتے۔

خوشبو کا جھونکا مسلسل اس کے ساتھ فضا میں تیر رہا تھا۔ کبھی یوں لگتا وہ آگے بڑھ گیا ہے۔ کبھی بالکل اس کے جسم سے مس ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کی موجودگی نے شیراز کو خاصا پرسکون اور باہمت کر دیا تھا۔

وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگ کر رک گیا اور غور سے ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔

"اگر اس روز وہ رانا صاحب سے جا کر کہہ دیتا یا نادر ہی بات کھول دیتا تو میں پھانسی چڑھ گیا ہوتا......" شہاب بولا۔

"تمہیں احتیاط سے کام کرنا چاہئے تھا یار......" سعید نے بیزاری سے کہا۔ "اب تم اس طرح بے لگامی سے دوڑ لگاؤ گے تو اسی طرح کی پھنسا دینے والی صورت حال تو پیدا ہو گی۔"

"میں نے کیا بے احتیاطی کی؟" شہاب چڑ کر بولا۔ "وہ حرامزادی بلی نہ جانے کہاں سے آ گئی اور اس نے سارا کام خراب کر دیا۔"

"لگتا ہے ابھی اس کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں۔" سعید نے سر ہلا کر کہا۔ "ورنہ منصوبہ تو بڑا فٹ تھا۔"

"تم تو آسانی سے کہہ کر چھوٹ گئے کہ منصوبہ بڑا فٹ تھا۔ پھنس جاتا تو میں ...... تمہارا کیا جاتا۔"

"پچیس ہزار کم نہیں ہوتے شہاب خان!" سعید نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو اتنی رقم کے لیے پورا خاندان مار دیتا۔"

"یہاں ایک آدمی مارنا عذاب بن گیا ہے۔ تم پورے خاندان کی بات کر رہے ہو۔" شہاب نے منہ بنا کر کہا۔

"بزدل نہ بنو...... دام لیے ہیں تو کام کرو۔ مفت نہیں کر رہے ہو تم یہ کام۔" سعید نے ذرا ترشی سے کہا۔

"ایسا کرو۔ تم اپنا تبادلہ عارضی طور پر یہاں کرا لو۔" شہاب نے تنگ کر کہا۔ "اسے مارنے کے بعد واپس چلے جانا۔ یہ کام تم خود کرو تو زیادہ اچھا رہے گا۔ پچاس میں سے جو پچیس تم نے مجھے دیئے ہیں۔ ان میں سے ابھی پندرہ ہزار میرے پاس بقایا بچے پڑے ہیں، میں وہ بھی تم کو واپس کرنے کو تیار ہوں۔"

"میرے سامنے آنے سے کام بگڑ جائے گا۔" ہاتھ اٹھا کر سعید نے کہا۔ "اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں یہ کوشش بھی کر دیکھتا اور رہی بات پیسے واپس لینے کی تو تم انسپکٹر منیر کو جانتے نہیں۔ وہ کام پورا کرانے اور کرنے کا عادی ہے۔ درمیان سے بھاگ جانے والے کو وہ اپنے ہاتھوں کتے کی موت مار ڈالتا ہے۔"

"جانتا ہوں یار۔" شہاب نرم پڑ گیا۔ "میں نے تو ایسے ہی بات کے جواب میں بات کی تھی۔"

"آئندہ نہ کرنا ایسی بات۔ تم معاملے سے واقف ہو چکے ہو۔ اس لیے اگر تم نے راستے سے لوٹ جانے کی بابت سوچا بھی تو انسپکٹر منیر تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اور اگر اس نے کام پورا ہو جانے کے بعد مجھے اڑا دیا تو......" شہاب نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکے سے خوف کی جھلک تھی۔

"ایسا بھی نہیں ہے۔" سعید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "وہ اپنے ساتھ رہنے اور ساتھ دینے والوں کی قدر کرتا ہے۔ اگر وہ ہر ایک مہرے کو کام مکمل ہونے پر ضائع کرتا رہے تو کوئی بھی نیا آدمی اس کے لیے کام کرنے کو تیار نہ ہو۔"

"ہوں......" شہاب نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمت نہ ہارو۔ دو چار دن بعد کسی اور طریقے سے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔"

"مگر کیسے؟" شہاب نے ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ "میری سمجھ میں ابھی تک کوئی اور طریقہ نہیں آیا۔ اب دوبارہ وہ کوئی بھی کھانے پینے کی چیز چھونے کو اول تو تیار ہی نہ ہو گا اور اگر ہو بھی گیا تو احتیاط کرے گا۔ اسے مجھ پر شک نہیں یقین ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہوں۔ تبھی تو اس نے کہا تھا کہ سعید کو پیغام دے دینا کہ میرے دشمن اب مجھ پر کوئی اور وار کریں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ مجھے تم سے ملاقات کرتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔"

"ہاں ...... یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔" سعید نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے اب کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"سوچو...... مگر کوئی ایسا راستہ نکالو جو براہِ راست مجھ سے کم سے کم تعلق رکھتا ہو۔" شہاب نے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔

شیراز کا سارا جسم سنسنا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا۔ ریوالور نکالے اور ان دونوں کو ڈھیر کر دے۔

اس نے شہاب پر رحم کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا تھا مگر وہ اب بھی اس کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے لیے موت کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ صرف پچیس ہزار روپے کے لیے۔ اپنی زندگی کی یہ قیمت اسے بیحد مضحکہ خیز لگی۔ صرف پچیس ہزار روپے کے لیے وہ لوگ اسے دنیا سے رخصت کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

"یہ بتاؤ۔ استاد سے اس کی اب تک بنی کیسے ہوئی ہے؟" اچانک سعید نے پوچھا تو شیراز نے اپنے خیالوں سے باہر آنے میں دیر نہ لگائی۔

"مجھے بھی اس پر حیرت ہے۔" شہاب نے جواب دیا۔ "ورنہ تو استاد کسی کو اپنی بیرک میں ساتھ رکھنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔"

"پتہ کرو کہ باہر سے ان کی بیرک میں کھانے پینے کی چیزیں کون پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" شہاب نے سوالیہ انداز میں سعید کی جانب دیکھا۔

"باہر ہی سے کوئی چکر چلائیں گے۔ یا تو اس آدمی کو تم ٹریپ کرلو کہ وہ استاد کی بیرک میں جانے والی کسی چیز میں زہر ملا دے یا پھر اس کی جگہ خود سنبھال لو۔"

"تم استاد کو جانتے ہو نہ اس کے لمبے ہاتھوں کو۔" شہاب نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "یہ سوچنا بھی حماقت ہے کہ اس طرح ہم استاد کی بیرک میں جانے والی کسی چیز میں زہر ملا سکیں گے اور پھر کیا یہ ضروری ہے کہ وہ زہریلی چیز شیراز ہی کھائے۔"

"تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے یار......" سعید نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "اگر مجھے علم ہوتا کہ تمہارا وار اوچھا پڑے گا میں کبھی تم سے معاملہ نہ کرتا۔"

"تو اب کون سی دیر ہوگئی ہے۔" شہاب بگڑ کر بولا۔ "اب اپنے ہاتھوں میں لے لو سارا معاملہ۔"

"اب تو تم نے شکار کو چوکنا کر دیا ہے۔" سعید نے بھی ذرا تلخی سے کہا۔ "اب میں کیا ہاتھ میں لے لوں۔"

اسی وقت شیراز بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بات اب اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

ں نے نیفے سے پستول نکالا اور دونوں پر تان لیا۔

"میں تم دونوں کی الجھن ختم کیے دیتا ہوں دوستو......" اس نے بڑے زہریلے انداز میں کہا ر دو تین قدموں میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔

وہ دونوں یوں اچھلے جیسے ان کے قدموں میں پٹاخہ چھوٹا ہو۔ گھبرا کر وہ پلٹے تو دو تین کرسیاں پنی لولی لنگڑی حیثیت کے مارے اِدھر اُدھر لڑھک گئیں۔ تھوڑا بہت شور ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"تم......" دونوں کے لبوں سے بے ساختہ ایک ہی آواز نکلی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ہاب نے پوچھا۔

"یہ بات تو مجھے اس سے پوچھنی چاہیے تھی مگر تم دونوں نے اتنے سوال جواب کیے ہیں آپس ں کہ اب کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔" شیراز نے سعید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہا۔ جو اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر خوف سے خشک ہوتے حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش ر رہا تھا۔

"تو تم نے ہماری ساری باتیں سن لیں۔" شہاب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بڑے ر محسوس انداز میں اس کا ہاتھ پاس میز پر پڑی اپنی رائفل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"مجبوری تھی۔" شیراز نے شانے اچکائے۔ "تم میرے ہی بارے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ ں لیے سننا پڑی۔"

اسی لمحے شیراز نے محسوس کیا کہ خوشبو کا وہ جھونکا بے قراری کے عالم میں اس کے گرد سے دو ین چکر لگا کر آگے بڑھ گیا۔

عین جس وقت شہاب نے جھپٹ کر میز سے رائفل اٹھا کر شیراز کی طرف سیدھی کی اسی لمحے ید کو جیسے کسی نے دھکا دے کر اس پر گرا دیا۔ شہاب کو ایک جھٹکا لگا۔ غیر اضطراری طور پر اس کی انگلی گر پر دبی...... ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سعید کے دل کے مقام پر ایک بڑا گھاؤ پیدا کرتی ہوئی گولی ر سے پار ہو گئی۔

سعید زور سے چیخا۔ الٹ کر پیچھے پڑے گتے کے ڈبوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا گھاس آلود زمین پر بے حس و حرکت ہو گیا۔

رائفل کی گولی نے اس کے دل کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ شیراز کو قتل کرنے کے منصوبے انے والا خود کتے کی موت سے ہم کنار ہو گیا تھا۔

حیرت زدہ اور اس سے زیادہ خوف کی لپیٹ میں آ جانے والا شہاب بے یقینی کے عالم میں یہ

سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران حیران نظریں کبھی اپنی رائفل کی نال سے نکلتے دھوئیں اور کبھی فرش پر لہو میں بھیگے سعید کے مردہ جسم پر تیر رہی تھیں۔

"ماسٹر...... نکل جا...... اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" اچانک شیراز چونک پڑا۔ محرابی حصے کی کھڑکی سے استاد نے جھانک کر اسے خبردار کیا تھا۔

اس نے فوراً پستول نیفے میں اڑسا اور شہاب کو حیرت' بے یقینی اور خوف کے حصار میں قید چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔

"رحیم الدین...... او رحیم الدین......" مسجد کے اندر سے استاد نے وارڈن کو آواز کی سمت کے لیے ادھر اُدھر تاکتے پا کر زور سے آواز دی۔ "ادھر آ۔ یہ سنتری بادشاہ نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔" اس نے وارڈن کو شہاب کی طرف روانہ کیا۔

جس وقت شیراز مسجد میں داخل ہو کر استاد کے قریب پہنچا تو کھڑکی سے جھانک کر اس نے دیکھا کہ وارڈن' شہاب کو قابو کر چکا تھا۔ اس کی رائفل قبضے میں لے کر اس نے شہاب کو کالر سے گرفت میں لیا اور زور زور سے دوسرے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔

"میں...... میں نے...... میں نے کچھ نہیں کیا رحیم...... یہ تو...... اپنے آپ ہی ہو گیا۔ میں تو اس سے باتیں کر رہا تھا۔" گڑگڑاتا ہوا شہاب رحیم الدین سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب رانا صاحب کو بتانا۔ رائفل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سامنے بندہ مرا پڑا ہے۔ فائر تم نے کیا ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ ہی ہو گیا۔" رحیم الدین نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

اسی وقت چند سپاہی دوڑتے ہوئے وہاں آئے اور رحیم الدین نے شہاب کو ان کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے بازوؤں اور کالر سے تھامے دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔

شیراز نے استاد کی طرف دیکھا جو کھڑکی سے ہٹ آیا۔

"یہ کیسے ہو گیا ماسٹر...... میں بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ...... سعید تو آرام سے کھڑا تھا' پھر اسے شہاب پر دھکا کس نے دیا؟" وہ پرخیال لہجے میں بولا۔

"میں خود حیران ہوں استاد۔ اگر ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو میں خود......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مسجد میں ایک دو آدمی اور تھے جو ان سے کافی دور تھے۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔

اسی وقت وہی دلدار خوشبو کا جھونکا ناچتا ہوا' شیراز کے پاس آ پہنچا۔

"استاد......" شیراز نے چونک کر کہا۔

"میں بھی محسوس کر رہا ہوں ماسٹر۔" استاد نے بڑے غیر محسوس انداز میں خوشبو سونگھتے ہوئے

دھیرے سے کہا۔

"جب سعید جھٹکا کھا کر شہاب کی رائفل کی نال پر گرا استاد...... تب یہی خوشبو کا جھونکا ایک لمحہ کو مجھ سے جدا ہو کر ان دونوں کی طرف لپکا تھا۔"

"واقعی!" استاد نے شیراز کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یقین کرو استاد......" شیراز نے کہنا چاہا۔

"مجھے تو یقین ہے ماسٹر...... تو یقین کر لے۔ جان لے کہ کوئی اور نہیں۔ یہ خوشبو تیری نادیدہ محافظ ہے' مددگار ہے' تیرا حصار ہے۔" استاد نے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

اسی وقت جیسے خوشبو کے جھونکے نے شیراز کے سر کے بالوں میں ہلکورا لیا۔ پھر استاد کے گالوں کو چھوتا ہوا مسجد کی فضا میں تحلیل ہو گیا۔

"تو خوش بخت ہے ماسٹر......" استاد نے سرگوشی کی۔ "اللہ کی مدد ہر وقت تیرے شامل حال ہے۔"

شیراز استاد کے چہرے کو تکتا رہ گیا جس پر یقین کا نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

"جا...... وضو کر کے آ...... عصر کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔" استاد نے اس کے شانوں سے ہاتھ اٹھا لیے۔

شیراز نے خاموشی سے وضو خانے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اس کا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ خوشبو کس پیارے کی تھی جو ہر آڑے وقت میں اس کے لیے فولاد کی دیوار بن جاتی تھی۔



نجم چوتھے دن واپس لوٹا۔

اسی سہ پہر کو وہ شیراز سے ملاقات کے لیے آن پہنچا۔

استاد نے سنتری کے ساتھ شیراز کو ملاقات کے لیے بھیجا۔ اب ان کو جس کمرے میں ملنے کی سہولت بہم پہنچائی گئی وہ کلاس اے کے قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ کمرے میں میز' چار کرسیاں' پانی کا جار' دو گلاس اور ایک کونے میں لوہے کی چارپائی بھی پڑی تھی۔

نجم اور شیراز ایک دوسرے کے گلے لگ کر کتنی ہی دیر کھڑے رہے۔ پھر شیراز نے اسے خود سے الگ کیا۔

"بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔" وہ نجم کے پژمردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بس یار۔ وہاں کام ہی ایسا کرنا پڑا کہ سو نہیں سکا۔ فارغ ہوتے ہی واپس چل پڑا۔ کچھ سفر

کی بھی تھکان ہے۔"

"خیریت کا کام تھا......؟" وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"ہاں......" نجم نے میز پر کہنیاں ٹکا کر سر کو کنپٹیوں سے تھام لیا۔

"محمود اصغر کیسا تھا اب؟"

"بہت بہتر تھا۔" نجم نے جواب دیا۔ "تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ رخصت ہونے تک تمہارا ہی نام اس کے لبوں پر تھا۔"

"فون کروں گا اسے......" شیراز نے کہا۔

"نہیں......فون اس کے کمرے سے دور ہے۔ تم ایم۔ایس سے اس کی خیر و عافیت معلوم کر سکتے ہو اور میرا مشورہ بھی یہی ہے شیراز کہ اسے فون مت کرنا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ تمہاری تکلیف سے۔ اس صورت حال سے وہ اتنا ٹینس ہو گیا کہ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے ایمرجنسی ٹریٹ منٹ دینا پڑا۔ اس لیے اس سے خط یا ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کے بجائے تم اگر چند دن رک سکو تو میں تمہاری اس سے ملاقات یا رہائی کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم بذاتِ خود اس کے پاس جاؤ تا کہ اس کو جو تسکین درکار ہے تم اس کے لیے وہ فراہم کر سکو۔"

"اچھا......" شیراز نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "تم کہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔ ویسے مجھے علم نہ تھا کہ وہ اس حد تک مجھ سے مانوس ہو چکا ہے۔"

"وہ دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے تمہیں شیراز......" نجم نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مگر میری رہائی کے لیے تم کیا کرو گے...... کم از کم چھ سال باقی ہیں ابھی میری سزا کے۔"

اچانک شیراز پوچھ بیٹھا۔

"کیا استاد نے کچھ نہیں بتایا تمہیں......؟" نجم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں......" شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"خاص بھی کہہ سکتے ہو......" نجم نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ "بہرحال تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تم استاد سے ابھی ذکر مت کرنا۔"

"نہیں کروں گا۔ تم بتاؤ۔" شیراز نے وعدہ کیا۔

"نئی حکومت بننے کے ساتھ ہی قیدیوں کی ایک مجوزہ تعداد کو رہائی دی جائے گی۔ تمہاری فائل تیار ہو چکی ہے۔ بس مجھے اسے متعلقہ برانچ تک پہنچانا ہے۔ استاد نے اسے پہیے لگا دیئے ہیں۔ امید

ہے رکے گی نہیں۔"

"واقعی......؟" شیراز کو یقین نہ آیا۔

"استاد جیسے لوگ کم کم پیدا ہوتے ہیں شیراز۔ میں نے ایسا قول کا ہیرا آدمی شاید ہی دیکھا ہو۔ زبان سے جو نکال دیتا ہے، جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کا پہرہ بھی دیتا ہے۔ تم سے تو اسے عجیب سی عقیدت ہے۔"

"ہاں......" شیراز کے لہجے میں غرور جھلکا۔ "میں جانتا ہوں۔ مجھے اس کی خاص محبت حاصل ہے نجم۔"

"تو بس......وہ شاید تمہیں سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ اس لیے اس سے ذکر مت کرنا۔"

"کبھی نہیں کروں گا۔ میں اس کی خوشی میں نقب نہیں لگاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔ ویسے اس سارے پراسس میں اندازاً کتنی دیر لگے گی؟"

"تقریباً دو تین ہفتے۔"

"ہوں۔ ابھی کافی وقت ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"اندر رہنے کے سلسلے میں۔" شیراز ہنس پڑا اور کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا۔

"ہاں......" نجم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں جانتا تھا تم نہ بھولو گے نہ نظر انداز کرو گے۔"

"لاؤ......میں سائن کر دوں۔"

نجم نے جیب سے شیراز کی چیک بک اور قلم نکال کر اس کے آگے رکھ دیئے۔ شیراز نے یکے ودیگرے سارے چیک سائن کر دیئے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" نجم نے حیرت سے پوچھا۔

"جو مجھے پہلے دن کرنا چاہیے تھا۔" شیراز نے قلم اور چیک بک اس کی طرف سرکا دی۔ "اب الی بھی کام ہو تمہیں مجھ سے رجوع نہیں کرنا پڑے گا۔ محمود اصغر کا پتہ لیتے رہنا۔ اس کی کوئی ضرورت لہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ میرے سلسلے میں کہیں بھی کتنا بھی خرچ کرنا پڑے، مجھ سے پوچھنے مت ا تم کیا نکلواتے ہو؟ باقی کتنا ہے؟ یہ اب تمہارا دردِ سر ہے۔"

"شیراز......" نجم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم اپنے ہاتھ کاٹ کر دے رہے ہو

"دل نکال کر دے سکتا ہوں دوست۔" شیراز نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "تم کہہ کر

دیکھو۔"

"شیراز......" نجم کے جھکے ہوئے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔اس نے شیراز کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔"ایک کام تم سے پوچھے بغیر کر کے آرہا ہوں۔"

"تم نے جو بھی کیا ہوگا درست ہوگا۔پھر بھی بتانا چاہو تو کہہ ڈالو۔"

"مجھ پر اعتماد کا اتنا بوجھ ڈالو شیراز جسے میں اٹھا پاؤں۔" نجم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم جو بوجھ نہ اٹھا سکو اسے دوستی کے زمرے سے خارج کر دینا۔ میں اف نہیں کروں گا۔اب بولو...... کیا کر کے آرہے ہو؟"

"محمود اصغر نے ایک کیلنڈر پر چھپی ہوئی چھوٹی سے بے حد خوبصورت ایک کمرے کے مکان کی تصویر پسند کی تھی۔"

"پھر......؟"

"میں نے تین دن وہاں رک کر اس کے لیے ایک بڑے پرسکون مقام پر وہ ایک کمرے کی چھوٹی سی کاٹیج تیار کرا دی ہے۔"

"ارے...... تو کیا اب وہ وہاں رہے گا۔"

"تم جاؤ گے اس سے ملنے تو وہ تمہیں وہیں ملے گا۔"

"نجم......" شیراز کا لہجہ ممنونیت سے پر جوش تھا۔"یہ تم نے بہت اچھا کیا دوست۔وہ بہت خوش ہوگا۔"

"پتہ نہیں۔" نجم نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔"یہ سب تمہارے دیکھنے اور محسوس کرنے کی باتیں ہیں۔"

"میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں نجم۔" شیراز اب بھی احسان مند دکھائی دے رہا تھا۔

"بس...... تم خوش ہو گئے۔یہی کافی ہے۔" نجم نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

"بات چھوٹی ہے' مگر میرے پوچھنے پر بُرا نہ مان لینا۔"

"پوچھو......؟"

"اس تعمیر پر کتنا خرچ آیا؟" شیراز نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیوں پوچھ رہے ہو؟" نجم نے بھنویں اٹھائیں۔

"صرف اس لیے کہ میں جان سکوں تم نے پلے سے اس میں کتنا خرچ کیا۔ میں جانتا ہوں وہاں زمین بہت مہنگی ہے۔"

"جس دن تم وہاں محمود اصغر سے ملنے جاؤ گے۔اس دن یہ حساب کتاب کریں گے۔اس کے علاوہ ہر حساب کتاب کے لیے تم آزاد ہو۔"

"بس......اب کوئی اور بات کرو۔" شیراز نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اور بات یہ کہ اب تم بتاؤ۔کسی چیز یا روپے پیسے کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں۔پہلے ہی روپے بچے پڑے ہیں اور ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گا۔"

"تو اب میں چلوں؟" نجم نے اجازت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... جا کر آرام کرو۔تم پر تھکن کا بہت غلبہ ہو رہا ہے۔" شیراز اٹھ گیا۔نجم اس سے گلے مل کر رخصت ہو گیا۔

شیراز کمرے سے نکل کر کاریڈور میں آیا اور واپس اپنی بیرک کی طرف چل پڑا۔سامنے سے رانا ٹہل چلا آرہا تھا۔وہ اسے دیکھ کر رک گیا۔

"ہیلو پروفیسر۔" رانا اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے بولا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہیلو سر......" شیراز نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے نا!" رانا نے پوچھا۔

"بالکل سر......"

"استاد سے مل کر آرہا ہوں۔راؤنڈ پر تھا۔سوچا استاد کی خانقاہ کی بھی زیارت کرتا چلوں۔"

"خانقاہ......" بے اختیار شیراز نے دہرایا اور مسکراتے ہوئے اس لفظ کا مزہ لینے لگا۔

"ہاں بھئی۔استاد بہت بڑا مجاور ہے۔اپنے آپ کا......" رانا ہنسا۔"ایک خبر بھی دینی تھی ے۔"

"خیریت کی خبر تھی سر!" شیراز نے پوچھا اور ہاتھ پر رانا کی گرفت نرم پڑتے ہی ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔

"ہاں...... ظہور اور امتیاز کے آرڈر آ گئے ہیں۔کل وہ رہا ہو جائیں گے۔"

"ارے...... سچ......" شیراز کو عجیب طرح کی خوشی ہوئی۔

"ہاں بھئی......اچھا...... میں چلتا ہوں۔" رانا اس کا شانہ تھپک کر رخصت ہو گیا اور شیراز نے تیز قدموں سے بیرک کا فاصلہ سمیٹنا شروع کر دیا۔

بیرک میں داخل ہوا تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مدھم ہوتے ہوتے دم توڑ گئی۔وہاں تو لگتا

تھا کوئی مرگ ہوگئی ہے۔

استاد کے کندھوں سے لگے ظہور اور امتیاز سسک رہے تھے اور استاد ان کو دلاسہ دے رہا تھا۔

"لو...... ماسٹر آگیا۔ چل ماسٹر میری کچھ مدد کر یار۔" استاد نے اسے قریب آتے دیکھ کر کہا۔

"کیا ہوا استاد؟" شیراز نے معاملے کو سمجھتے ہوئے بھی انجان پن سے کہا۔

"ارے ان دونوں بھڑووں کی رہائی آگئی ہے اور یہ روئے جا رہے ہیں۔" استاد نے ان دونوں کے بالوں کو کھینچتے ہوئے بتایا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے استاد۔" شیراز ان کے قریب ہی آ بیٹھا۔

"خوشی کی بات ان کے لیے ہوتی ہے شیراز' جن کا باہر کوئی انتظار کر رہا ہو۔ جن کا کوئی گھر ہو۔ جن کو خدا نے زمین پر کوئی ٹھکانہ دیا ہو۔ ہم بے آسرا' لاچار اور بے سہارہ باہر جا کر بھیک مانگیں گے کیا؟" ظہور تھرتھراتی آواز میں بولا۔

"بھیک کیوں مانگو گے۔ کوئی کام دھندا کرنا۔" شیراز نے کہا۔

"کام دھندا...... اور ہم......" اب کے بار امتیاز نے زبان کھولی۔ "پہلے چھوٹی موٹی چھینا چکاری کر لیتے تھے۔ موقع ملنے پر جیب بھی تراش ڈالتے تھے۔ مگر جب سے استاد کی چھاؤں تلے آئے ہیں' سب کچھ زنگ آلود ہوگیا۔ اب تو یہ بھی مشکل لگتا ہے کہ بلیڈ انگلیوں میں پھنسا ہی لیں۔ اس سے کام لینا تو درکنار شیراز...... استاد کے بغیر اب کوئی آسرا نہیں۔ استاد یہاں ہے' تو ہم باہر جا کر کریں گے۔ ہم آج ہی کوئی ایسی حرکت کریں گے کہ باہر جانے کے بجائے دوبارہ سزا شروع ہو جائے۔"

"بکواس مت کرو۔" استاد نے ان دونوں کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "خبردار جو ایسی ویسی کوئی الٹی سیدھی حرکت کی۔ تم لوگ کل باہر جاؤ گے اور ایک نئی زندگی شروع کرو گے۔"

"مگر تمہارے بغیر استاد......" وہ بچوں کی طرح پھسل پڑے۔

"میں کیا مرتے دم تک اندر رہوں گا' نالائقو۔" استاد نے پیار بھرے انداز میں ان کو ڈانٹا۔

"یہاں سے نکل کر تم دونوں میرے لیے کام کرو گے۔"

"تمہارے لیے......" وہ دونوں چونک اٹھے۔ "کیا کام استاد؟"

"یہ تمہیں بعد میں سمجھاؤں گا۔ فی الحال اپنے یہ تھوبڑے درست کرو۔ کیا لعنت پھیل رہی ہے ان پر...... جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔"

ظہور اور امتیاز فوراً اٹھے۔ کونے میں رکھے ریڈی میڈ واش بیسن یعنی کولر کی ٹونٹی کھول کر منہ ہاتھ دھویا اور تین چار منٹ بعد پھر استاد کے سرہانے آ بیٹھے۔

"اب بتاؤ استاد۔ کیا کام کرنا ہے ہمیں؟"

"تم دونوں ماسٹر کے گاؤں جاؤ گے۔ وہاں کی صورت حال کا خوب اچھی طرح جائزہ لو گے اور ماسٹر کے دونوں بھائیوں پر نگاہ رکھو گے۔ تم میں سے ایک وہاں رہے گا اور دوسرا ہر دوسرے دن یہاں آ کر مجھے رپورٹ دیا کرے گا۔ اب یہ تم جانو کہ تمہیں وہاں کس طرح جگہ بنانی ہے۔ بس...... جس دن وہ دونوں یا انسپکٹر منیر شہر کی طرف آ رہے ہوں یا' گاؤں میں کہیں ہتھے چڑھ سکتے ہوں۔ اس موقعے کی تلاش کرنا ہے تمہیں......"

"ہوں......" امتیاز اور ظہور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنس پڑے۔

"کیا ہوا؟" استاد کے ساتھ ساتھ شیراز بھی حیران ہوا۔

"استاد...... سمجھو ہم نے گاؤں میں جگہ بنا لی اور پل پل کی رپورٹ بھی مل جایا کرے گی تمہیں۔ بس ایک اعتماد تمہیں ہم پر کرنا پڑے گا۔"

"کیا؟"

"یہ گشتی ٹیلی فون کا ایک سیٹ دینا پڑے گا ہمیں۔ کسی وقت ایمرجنسی اطلاع دینا پڑے تو ہمارے پاس کوئی ہیلی کاپٹر نہیں ہے' جس پر فوراً یہاں چلے آئیں گے۔"

"سیٹ تمہیں مل جائے گا۔"

"تو بس...... آگے ہمارا کام ہے۔ اس کے بارے میں تم فکر مت کرو۔"

"مگر تم لوگ کرو گے کیا؟"

"استاد...... کبھی ہم نے پوچھا کہ تم جو کام کرنے جاتے ہو وہ کیسے کرو گے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم لوگ کہیں کام خراب ہی نہ کر دینا۔" استاد نے ان دونوں کو بغور دیکھا۔

"گردن کاٹ دینا استاد اگر کام خراب ہوا تو......"

"لگتا ہے کوئی بڑی کل دب گئی ہے تم سے جو اس قدر اترا رہے ہو۔"

"یہی سمجھ لو استاد۔" امتیاز نے مزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ کل تم لوگ یہاں سے سیدھے شمشاد کے پاس پہنچو گے۔ اس سے تمہیں موبائل فون اور دوسری ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ جو چاہیے ہو اسے بتا دینا۔"

"مگر وہ ہمیں پہچانتی نہیں استاد۔ استانی سے ہم کیا کہیں گے کہ وہ ہمیں فٹافٹ کر دے گی۔"

"رانا اسے فون کردے گا۔تم لوگ بےفکر ہو کر جاؤ اس کے پاس۔"

"بس ٹھیک ہے۔" ظہور نے سر ہلایا۔

"اور سنو۔" استاد نے دونوں کو مخاطب کیا۔"میرے باہر آنے تک کوئی بھی ضرورت پڑے' کوئی بھی کام ہو' کسی مشکل میں پڑ جاؤ' میرے پاس بھاگے آنے کے بجائے شمشاد سے رابطہ کر' سمجھے......وہ سب سنبھال لے گی۔"

"استاد......" ظہور نے استاد کی آنکھوں میں دیکھا۔"لگتا ہے استانی بھی شیرنی ہی ہے۔"

"جاؤ گے تو دیکھ لینا۔اب بس......" استاد نے شمشاد کا ذکر ختم کرنے کا سگنل دے دیا۔

"استاد......اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔" شیراز نے نیاز مندانہ انداز میں استاد کی طرف دیکھا۔

"ماسٹر...... لگتا ہے تیرا جی بھی شرارت پر آمادہ ہے۔" استاد نے اس کے لہجے سے حقیقت کشید کرلی۔

"نہیں استاد۔ایسی کوئی بات نہیں۔" شیراز نے ہنس کر کہا صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ جب میں شوکت اور نعیم شمشاد کے ہاں پہنچے تھے تو شوکت نے اپنا نام راجہ' میرا خواجہ اور نعیم کا نام کا شربٹ بتایا تھا' یہ کیوں؟"

"تو بھولا ہے ماسٹر۔" استاد نے اسے دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔"جہاں ایک جن ہوتا ہے ناں ماسٹر، وہاں دو دشمن بھی ہوتے ہیں۔پھر دشمن بنتے ہوئے دوست کو دیر ہی کتنی لگتی ہے۔اس لیے وہاں ہمیشہ بات چیت میں دوسرے نام استعمال کئے جاتے ہیں۔سوائے میرے اور رانا کے۔میرا اصل نام شوکت نے شمشاد کو بعد میں بتا دیا ہوگا۔شوکت اور نعیم کو وہ پہلے سے جانتی ہے۔"

"وہاں ہم لوگوں کے سوا نازو اور نمی تھیں استاد۔تین چار تماش بین تھے اور ایک ملازم۔شاید غلام نام تھا۔اس کا......"

"غلام ہی کبھی کبھی پوری بازی الٹ دیتا ہے۔ماسٹر یاد رکھو۔زندگی میں سب سے زیادہ نقصان تجھے وہ پہنچائے گا جو تیرے سب سے قریب ہوگا۔جس پر تو سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہوگا۔تیری پیٹھ میں خنجر وہی بھونکے گا' جس کے آسرے پر تو دشمن کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوگا۔شمشاد' نجم اور رانا جیسے کتنے خوشبودار لوگ ہیں۔انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں مگر نذیر' حمید اور سعید اور شہاب جیسے جھاڑ جھنکار تجھے ہر جگہ پیروں میں زخم دینے کے لیے موجود ملیں گے۔ظہور اور امتیاز باہر جانے سے کیوں خوفزدہ ہیں۔صرف اسی لیے کہ ان کو اپنی قبیل کے افراد ڈھونڈنے سے نہیں ملیں گے۔یہ برائی

سے اچھائی کی طرف لوٹنے والے ماں کے پیٹ سے جنم لینے والے بچے کی طرح معصوم ہو جاتے ہیں مگر ان کو صاف کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوگا۔اس لیے ماسٹر......اپنی حفاظت کے لیے' اپنے پیاروں کی مخبری نہ ہونے دینے کے لیے دو نمبر تعارف ضروری ہے۔" شیراز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔استاد کی بات سو فیصد درست تھی۔وہ اس پر جتنا غور کرتا گیا۔اس کے ذہن کے دریچے کھلتے چلے گئے۔



استاد' شیراز' ظہور اور امتیاز' رانا سہیل کے کمرے میں موجود تھے۔

ظہور اور امتیاز کی رہائی کی ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔استاد سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

ایک سنتری رانا سے اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں دو لفافے تھے۔ جو اس نے امتیاز اور ظہور کو تھما دیئے۔

"اس میں تمہارے کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں جن کی وصولی تم دے چکے ہو۔" رانا نے ان دونوں کو بتایا۔

یہ وہ کپڑے اور دیگر اشیا تھیں جو جیل میں آتے وقت ان کے جسم سے اتار کر جمع کر لی گئیں اور اب رہائی کے وقت ان کے حوالے کی جا رہی تھیں۔

استاد نے ان کو پہلے ہی جیل کے کپڑے بدلوا کر نئے سوٹ پہنا دیئے تھے۔

"یہ کپڑے باہر کہیں ڈسٹ بن میں پھینک دینا۔" استاد نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں استاد......یہ بڑے کام کے کپڑے ہیں۔تم نے جو کام ہمارے سپرد کیا ہے۔اس کے لیے یہی بوسیدہ لباس کام آئے گا۔" ظہور نے جلدی سے کہا۔

"زیادہ اونچا مت اڑنا۔" استاد نے تنبیہ کے لہجے میں کہا۔"کام بڑی احتیاط سے اور ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔"

"تم فکر نہ کرو استاد۔" وہ دونوں بیک وقت بولے۔

"رانا...... شمشاد کو فون کر دو۔یہ دونوں پہلے اسی کے پاس جائیں گے۔"

"ابھی لو۔" رانا نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا۔

"اسے کہنا ان کو ایک موبائل سیٹ اور باقی کا مطلوبہ سامان فراہم کر دے۔" استاد نے کہا اور اٹھ کر کمرے کے دور افتادہ گوشے میں چلا گیا۔

شیراز کا اندازہ تھا کہ وہ فون کے ریسیور میں سے نکلتی ہوئی شمشاد کی آواز سے بھی فاصلہ رکھنا

چاہتا ہے۔ محبت' ضبط اور انتظار کا یہ بھی ایک انداز تھا۔

"ہیلو...... شمشاد...... میں ہوں رانا۔"

"جی رانا صاحب۔" شمشاد نے دوسری طرف سے ہنس کر جواب دیا۔

"ظہور اور امتیاز نام کے دو آدمی آ رہے ہیں تمہارے پاس۔ استاد کے خاص آدمی ہیں۔ ان کو ایڈجسٹ کر لینا۔"

"کیا میرے پاس ٹھہریں گے؟" شمشاد نے پوچھا۔

"نہیں۔ انہیں ایک موبائل سیٹ' کچھ رقم اور دیگر مطلوبہ اشیاء فراہم کر دینا۔ اگر رکنا چاہیں تو ان کی مرضی۔ ورنہ جانے دینا۔"

"ٹھیک ہے رانا صاحب۔" شمشاد نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "اور کچھ......؟"

"بس...... فی الحال اتنا ہی۔" رانا نے جواب دیا۔ "اس بار مال بہت اعلیٰ تھا۔"

"ایک نئی جگہ سے لیا ہے۔" شمشاد نے بتایا۔

"جگہ اور جگہ والے......"

"دونوں بااعتماد ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔" شمشاد نے رانا کی بات پوری کر دی۔

"اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔"

"استاد کیسا ہے؟" شمشاد نے ایک پل رک کر پوچھا۔

"ویسا ہی ہے۔" رانا نے آواز ذرا مدھم کر لی۔ اس نے شمشاد کی آواز میں جھلکتی بیقراری اور اشتیاق کو محسوس کر لیا تھا۔

"اس کا خیال رکھئے گا رانا صاحب۔" شمشاد کی آواز بھیگ گئی۔ "میری امانت ہے' وہ آپ کے پاس۔"

"تم فکر مت کرو شمشاد۔" رانا کے لہجے میں سچ رقصاں تھا۔ "وہ میرا بھی جگر ہے۔ جان ہے میری۔"

"جانتی ہوں۔" شمشاد کا لہجہ ابھی تک شبنمی تھا۔ "پھر بھی ہر بار آپ سے درخواست کرنے سے باز نہیں رہ پاتی۔"

"اچھا لگتا ہے شمشاد۔ تمہارا ایسا کہنا اچھا لگتا ہے۔ اس ایک فقرے میں وہ محبت اور خلوص پنہاں ہے جو اس بدبودار دنیا میں ناپید ہو جا رہا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" شمشاد سنبھل گئی۔

"اس بانکے ایس۔ ایچ۔ او کا کیا حال ہے؟ دوبارہ اس میں حرکت تو پیدا نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔" شمشاد ہنس پڑی۔ "ایک دن سرِ راہ دکھائی دیا تھا۔ رخ پھیر کر نکل گیا۔"

"یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ عقلمند آدمی لگتا ہے۔" رانا نے جواب میں کہا۔

"اچھا رانا صاحب...... اجازت۔"

"او کے شمشاد۔ اللہ حافظ۔" رانا نے فون بند کر دیا۔

"آ جاؤ سوہنیو۔ بات ہو گئی۔" اس نے دیوار کی طرف منہ کئے کھڑے استاد کو آواز دی۔

شیراز بے اختیار مسکرا دیا۔

استاد نے سگریٹ کا آخری کش لیا۔ میز کے قریب آیا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور ظہور اور امتیاز کی طرف دیکھا۔

"بس...... اب تم لوگ چلو...... جیسے میں نے کہا ہے۔ ویسے ہی کرنا۔ بہت ضروری ہوا تو ملنے کے لیے آنا ورنہ موبائل ہی پر رابطہ رکھنا۔"

"جی استاد۔" ظہور اور امتیاز نے کہا۔ پھر استاد کی کھلی بانہوں میں سما گئے۔ لاکھ تسلی' دلاسے اور اطمینان کے باوجود وہ سسک پڑے۔

"بچوں جیسی حرکتیں مت کیا کرو۔ جوان بنو۔" استاد کی آواز میں بھی شبنم اتر آئی۔

"جاؤ اپنا خیال رکھنا۔"

وہ دونوں استاد کے سینے سے الگ ہوئے۔ شیراز سے گلے ملے۔ رانا کو سلام کیا اور دروازے سے باہر کھڑا سنتری ان کو لے کر مین گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

"چائے منگواؤ رانا۔" استاد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بدتمیز جاتے ہوئے خواہ مخواہ اداس کر گئے۔"

رانا نے اردلی کو بلانے کے لیے بٹن پش کیا۔

شیراز اداس اور خاموش بیٹھے استاد کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔





بڑھی ہوئی شیو......بالوں میں گرد و غبار ......چڑھی ہوئی آنکھیں......میلے کچیلے کپڑے ......دھان پان جسم اور ایک بوسیدہ چادر کندھوں پر۔

یہ حلیہ تھا اس اجنبی کا جو آج سات دن سے گاؤں کے قبرستان میں آیا بیٹھا تھا۔ نہ کسی سے بولتا نہ کچھ مانگتا بس آنکھیں بند کئے دن رات قبرستان میں ایک درخت کے نیچے براجمان رہتا۔ کوئی کھانے کو کچھ دے جاتا تو کھا لیتا۔ ورنہ بھوکا ہی بیٹھا جھومتا رہتا۔

گاؤں کے لوگوں اور شہر والوں میں ضعیف الاعتقادی کے حوالے سے کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ نامرادیوں' پریشانیوں اور مشکلات کا شکار لوگ یہاں بھی ویسے ہی ہیں' جیسے دیہات میں ہوتے ہیں۔ مسائل بھی ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ گاؤں والوں کے مسائل تو زیادہ گمبھیر ہوتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے' قتل' اغوا اور دشمنیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ان کو زیادہ پریشان رکھتا ہے۔

گاؤں کی عورتوں نے اگلے چار دن میں اس اجنبی کو 'بابا جی' کا نام دے کر مشہوری شروع کر دی۔

''اری......دن رات قبرستان میں پڑے رہتے ہیں' بابا جی۔ نہ قبروں سے ڈر آتا ہے ان کو نہ بھوتوں سے۔''

''ہم جیسے کو شام کے بعد قبرستان سے گزرنا پڑے تو جان نکل جائے۔ یہ تو کوئی اللہ والا ہی ہے کہ بے خوف ہو کر وہاں بیٹھا اللہ کی عبادت کرتا رہتا ہے۔''

''کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بندہ ہے اللہ کا۔ معمولی سے کپڑے اور ایک چادر میں سردیوں کی برف جیسی راتیں کاٹ دینا عام بندے کے بس کی بات تو نہیں ناں!''

پھر یہ باتیں ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک محلے سے دوسرے محلے میں گردش کرتی کرتی سارے گاؤں میں پھیل گئیں۔

عورتوں نے جھاڑ پھونک کے لیے بابا جی کے گرد ڈیرا لگانا شروع کر دیا۔ کسی کے بچے کا بخار اتر گیا۔ کسی کا میاں راضی ہو گیا۔ کسی کی سوتن بیمار پڑ گئی۔ کسی کے مقدمے کی تاریخ آگے ہو گئی۔ کسی کو محسوس ہوا اس کی گود ہری ہونے کے دن آ گئے اور کسی کو من پسند شادی کے لیے تعویذ مل گیا۔

اردگرد کے دیہات میں بھی ''بابا جی قبرستان والے'' کا نام ڈھول کی طرح بجنے لگا۔

پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ گاؤں کے چوہدریوں اور ان کی بیویوں کے کانوں میں یہ آوازیں نہ پڑتیں۔

''میں تو کہتی ہوں ہمیں بھی اس بابے کے پاس جانا چاہیے۔'' شریفاں نے ثریا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کروں جا کر شریفاں۔ جوان بیٹوں کی موت کے بعد اب کیا مانگوں بابے سے جا کر۔ بیٹے تو میرے لوٹ کے آنے سے رہے۔'' ثریا نے دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر سسکتے ہوئے کہا۔

''دیکھ آپی......میں تو گود ہری ہونے کا نقش لینے جاؤں گی ہی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ تم بھی ابھی کون سی بوڑھی ہو گئی ہو۔ اللہ دوبارہ تمہاری گود بھر دے تو کیا بُرا ہے۔''

''اس عمر میں کیا اچھا لگے گا شریفاں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''بالوں میں سفیدی جھلک رہی ہے۔''

''ہم جیسے کھاتے پیتے گھرانوں میں زندگی کے آخری سانس تک ہر شے جائز ہوتی ہے آپی۔ تم جی چھوٹا نہ کرو۔ میرے ساتھ چلو۔ ذرا دیکھ کر تو آئیں بابا جی کو۔ بھائی بھی اکرم اور آصف کے بعد چپ چپ سے رہتے ہیں۔ کچھ ان کے لیے ہی دعا کرا لینا۔''

''ان کے لیے دعا کراؤں یا نہ کراؤں شریفاں۔'' اچانک ثریا کے لہجے میں نفرت ابھر آئی۔ ''مگر اس کلموہے شیراز کے لیے بددعا ضرور کراؤں گی۔ اس کی ہائے لگ گئی میرے بیٹوں کو۔ نجانے کس درندے کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔''

''چلو......کسی بہانے چلو تو سہی میرے ساتھ۔'' شریفاں نے ثریا کے ہاتھ تھام کر کہا۔

''چلو......ابھی چلنا ہے کیا؟''

''ہاں۔'' شریفاں نے دیوار گیر کلاک میں وقت دیکھا۔ ''دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔ گھنٹے بھر میں لوٹ آئیں گی۔ بھائی اور نذیر تو چار پانچ بجے سے پہلے لوٹیں گے نہیں۔ وہ زمینوں پر گئے ہیں۔''

''چلو......مگر ان کے کھانے کا کیا کریں؟ وہ تو بھجوانا ہے۔'' ثریا اٹھ گئی۔

''نہیں۔ نذیر کہہ گیا تھا کہ آج کھانا ڈیرے پر ہی بنے گا۔''

"چلو...... یہ بھی اچھا ہوا۔"

دونوں دیورانی جیٹھانی گھر سے نکلیں اور پیدل ہی میٹھی میٹھی دھوپ کھاتی قبرستان کی چل پڑیں۔



گاؤں کی عورتوں نے چوہدرانیوں کو آتے دیکھا تو اپنی اپنی جگہ سمٹ سمٹا کر ان دونوں کو را بھی دیا اور جگہ بھی۔

بابا جی کے لیے گاؤں والوں نے مٹی کا ایک چھ ضرب آٹھ فٹ کا چبوترہ بنا کر اس پر دری اس کے اوپر چادر بچھا دی تھی۔ درخت کی شاخوں سے باندھ کر ایک چھوٹا سا شامیانہ سر پر تان کہ دھوپ اور بارش سے حفاظت رہے۔ چبوترے پر ایک کونے میں مٹی کا گھڑا تھا' جس پر مٹی کاغذی پیالہ دھرا تھا۔ پاس ہی کھانے پینے کی چیزیں پلیٹوں میں دھری تھیں' جن کو رکابیوں یا برنگے رومالوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

سامنے دو حصوں میں الگ الگ مرد اور عورتیں نیچے قبروں کے درمیان اس چھوٹے سے قطعہ زمین پر آ بیٹھتے تھے۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

بابا جی اکثر نئے آنے والے کو اپنے بائیں ہاتھ رکھتے' پیالے سے چٹکی بھر نمک ضرور کھلاتے کسی کو دم کرنا ہوتا تو اپنے سامنے چبوترے پر آلتی پالتی مار کر بٹھا لیتے۔ دم کر کے زور سے اس سینے پر پھونک مارتے۔ درد کی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے۔ پھر پھونک مار دیتے۔ زیادہ تا مسئلہ ہوتا یا تکلیف شدت کی ہوتی تو متعلقہ حصہ جسم پر ہاتھ پھیر کر دم کر دیتے۔ نقش یا تعویذ بہت دیتے۔ زیادہ تر چینی پر دم کر کے استعمال بتا دیتے۔

کسی سے خاص سلوک نہ ہوتا۔ جو آتا عام بندوں کی طرح بیٹھتا۔ اپنی باری پر آگے آتا اپنی پتا سنا کر فیض یاب ہوتا۔

بابا جی عورتوں کے جسم کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ان کو دم کرنے کے لیے بھی وہ صرف پھونک ہی سہارا لیتے۔ ہاں ...... بہت ضروری ہوتا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو باتیں کرتے۔ وہ متعلقہ مسئلے کے بارے میں۔ ورنہ صرف سنتے اور جھاڑ پھونک کر کے رخصت کر دیتے۔

جس مرد یا عورت کو تعویذ مل جاتا یا بابا جی اس سے دو باتیں کر لیتے' وہ پھولا نہ سماتا۔ اس پاؤں زمین پر نہ ٹکتے' کیونکہ عام طور پر اس کا کام ہو جاتا تھا۔ اس لیے لوگ اکثر بابا جی سے نقش فرمائش کرتے مگر بابا جی کسی کے کہنے پر بھی نقش نہ دیتے جب ان کی موج ہوتی تب مرحمت فرماتے۔

ثریا اور شریفاں کے لیے عورتوں نے جب ہلچل مچائی' تو بابا جی نے سامنے بیٹھے مرد کو پھو

مار کر فارغ کر کے ان دونوں کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا۔

"کون ہو تم دونوں؟" اچانک انہوں نے بڑے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔ ان کی آواز میں تلخی محسوس کرتے ہی وہ دونوں ٹھٹک گئیں۔

"بابا جی یہ گاؤں کی چوہدرانیاں ہیں جی۔" آگے بیٹھی ایک عورت نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہے...... جاؤ۔ پیچھے جا کر۔ اپنی باری پر آنا۔" بابا جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بابا جی۔" ثریا کے ہونٹوں سے نکلا۔ وہ اور شریفاں دونوں ہی شرمندہ ہو گئیں۔ انہوں نے اردگرد دیکھا۔ اکڑوں اور آلتی پالتی مارے ہاتھ جوڑ کر بیٹھے مردوں اور انتہائی عقیدت احترام سے بابا جی کی طرف نظریں کم کم اٹھاتی عورتوں کے درمیان کھڑی' وہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔

"یہاں سب برابر ہیں۔ کوئی بڑا نہیں۔ کوئی چھوٹا نہیں۔ جاؤ۔ اپنی باری پر آگے آنا۔" اس بار بابا جی نے خاصی نرمی سے کہا۔

"جی بابا جی۔" ثریا اور شریفاں نے سر جھکائے ہوئے قدم واپس لوٹا لیے۔ وہ عورتوں کے آخر میں آ بیٹھیں۔ ان کو ایک پکی قبر کی اینٹوں پر بیٹھنے کی جگہ ملی۔

بابا جی کسی بھی مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ وقت نہ دیتے۔ جو آتا۔ اپنی بات کرتا۔ دعا کراتا یا نقش لیتا اور رخصت ہو جاتا۔ کوئی ہدیہ' کوئی نذرانہ' کوئی بھینٹ نہ مانگی جاتی نہ دی جاتی۔ اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ دینا چاہتا تو بابا جی بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں میں سے کسی کو اشارے سے پاس بلاتے اور پیش کیے گئے روپے اسے تھما کر جانے کا حکم دے دیتے۔

ثریا اور شریفاں اپنی باری آنے تک یہ سب کچھ دیکھتی رہیں اور مرعوب ہوتی رہیں۔ دونوں جوانی سے گزر جانے کے باوجود صحت مند' گوری چٹی' خوبصورت اور پرکشش تھیں۔ گاؤں کی خالص آب و ہوا اور اچھی خوراک نے ان کی عمر کے دس بارہ سال دیکھنے میں کم کر رکھے تھے۔

جب ان کی باری آئی تو دو مرد اور تین عورتیں ان کے بعد ابھی موجود تھیں۔ وہ دونوں اکٹھی ہی آگے بڑھیں اور بابا جی کے سامنے چبوترے پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔

بابا جی نے سوالیہ انداز میں ان دونوں کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"کہو...... کیا بات ہے؟"

"بابا جی...... ہم بہت پریشان ہیں۔" شریفاں نے زبان کھولی۔

"یہاں کوئی بھی خوشی سے نہیں آتا بی بی۔ نہ زندگی میں نہ اس کے بعد۔ جو زندہ ہیں' وہ پریشانیوں کے ہاتھوں لاچار ہو کر آتے ہیں۔ جو زندہ نہیں' وہ موت کے ہاتھوں بے بس ہو کر یہاں آئے پڑے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی خوشی سے کیا اس جگہ آتا ہے۔ بہر حال بولو...... پریشانی

کیا ہے؟"

"آپ آنکھوں والے ہیں' بابا جی۔" ثریا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا زبان سے پڑے گا؟"

"امتحان لینے آئی ہو ہمارا؟" بابا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ان کی سرخ سرخ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی' جس نے شریفاں کے ساتھ ساتھ ایک لمحے کے لیے ثریا کو بھی دہلا دیا۔

"جی نہیں......" ثریا نے ادب سے جواب دیا اور نظریں جھکا لیں۔ "دیکھنا چاہتی ہوں کہ صحیح جگہ پہنچی ہوں یا نہیں۔"

"کیا خط لکھ کر بلوایا ہے ہم نے تمہیں؟" بابا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

"اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ کو ہمارا یہاں آنا منظور نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ آ پاتیں۔" ثریا اب بھی ادب کا دامن تھامے ہوئے تھی۔

"پھر بھی آزمانا چاہتی ہو؟" بابا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"عرض کیا ناں۔ صرف اپنا اطمینان چاہتی ہوں۔"

"اور تم......؟" بابا نے شریفاں کی طرف دیکھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"یہ میرے ساتھ آئی ہے بابا...... مجھ سے الگ نہیں ہے۔" ثریا نے بات اچک لی۔ شریفاں کے ہونٹ لرزے مگر آواز نہ نکلی۔ اس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ بابا جی اگر برا مان گئے تو کیا ہوگا؟ کہیں کوئی بددعا نہ دے دیں؟ اس کے من میں سو طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔

"ہوں......" بابا نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ بات ہے۔"

جواب میں ثریا اور شریفاں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

بابا نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر تک ان کا جسم دائیں بائیں جھومتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے حق ہو کا ایک بلند نعرہ نکلا اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"دو جوان بیٹوں سے ہاتھ دھو چکی ہو۔" بابا کے ہونٹوں سے یہ الفاظ کیا ادا ہوئے کہ ثریا کے سارے کس بل نکل گئے۔

"بابا جی۔" اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں بھر آئیں۔

"یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ کس نے ان کو مار ڈالا۔"

"بابا جی۔" ثریا نے ہاتھ پیر چھوڑ دیئے۔

"خاوند نے رکھیل کا دامن تھام لیا ہے۔"

"بابا جی۔" ثریا کے حلق سے ٹوٹی پھوٹی سرگوشی نکلی اور اس کا سر جھکتا چلا گیا۔ وہ بابا کے سامنے

دوزانو تو پہلے ہی بیٹھی تھی' بالکل اب ہی رکوع کی حالت میں ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بابا کے گھٹنے چھونا چاہے۔

"نہ نہ...... ہاتھ پرے رکھ۔" بابا نے اسے جھڑک دیا۔ "ابھی تیرا اطمینان پوری طرح نہیں ہوا"

"نہیں بابا...... بس...... اور کچھ مت کہیئے۔" ثریا کی آنکھوں سے ساون بھادوں برسنے لگا۔ شریفاں کو پہلی دو باتوں کا تو علم تھا۔ یہ تیسری رکھیل والی بات اس کے لیے نئی تھی۔ ثریا کا اس بات کی تائید کرنے کا مطلب تھا کہ حمید ثریا سے دور جا چکا ہے۔ وہ حیرت سے ثریا کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں بابا کا احترام ایک سنگی بت کی طرح ایستادہ ہو چکا تھا۔

سامنے نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں ساری بات سن کر عقیدت کے مارے مزید پلپل گئے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اٹھ کر بابا کے پیر چوم لیں۔ ہاتھوں کو بوسے دیں اور اپنے سر زمین پر ڈال دیں۔ ان کے ادب اور احترام کے اظہار کا یہی ایک احسن ترین راستہ تھا جو ان کے علم میں تھا اور صدیوں سے وہ اسی پر چل رہے تھے۔ اب یہ غلط تھا یا درست' اس سے ان کو کوئی غرض نہیں تھی۔ تاہم بابا جی نے ان لوگوں کو ایسی حرکتوں سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا' اس لیے وہ صرف "سبحان اللہ...... سبحان اللہ......" کہہ کر ہی دل کو تسلی دے رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آنکھوں سے چھلکتی عقیدت کو ذرا سا بھی حیلہ مل جاتا' تو وہ کم نہ کرتے۔

"ہر ایرے غیرے کے سامنے سر جھکا دینے کا یہی انجام ہوتا ہے بی بی کہ بندہ اپنے خالق اور اس کے غلاموں سے دور ہوتا جاتا ہے۔ ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اب ان لوگوں کے سامنے جو تیرے گھر کی بات کھل گئی اور ان کو پتہ چل گیا کہ تیرا شوہر کسی اور عورت کے ساتھ پھرتا پھر رہا ہے' تو اس کی ذمے دار تو ہے۔ نہ تو ہمیں تاؤ دلاتی اور نہ ہماری زبان سے سرِ عام یہ راز افشا ہوتا۔ اللہ ہمیں معاف کرے۔"

"بابا جی......" ثریا نے چادر کے پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے تھرتھراتی آواز میں کہا۔ "میرا کچھ کیجئے بابا جی...... میں بہت دکھیاری ہوں۔"

"نہ...... نہ......" بابا نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "تو صرف اس حد تک دکھیاری ہے کہ تیرے دو جوان بیٹے قتل ہو گئے۔ اس سے پہلے نہ اس کے بعد تو دکھیاری کب تھی؟ بول۔ اگر تیرے شوہر نے کسی اور عورت کو اپنا لیا ہے' تو اس میں تیرے لیے دکھ والی بات کون سی ہے؟ کیا اس نے پہلی بار ایسا کیا ہے؟"

"مگر بابا...... اس سے پہلے وہ عارضی طور پر ایسی حرکت کرتا تھا۔ اب تو اس نے مستقل طور پر

اسے خرچ دینا شروع کر دیا ہے۔"

"جو مال جس راستے سے آتا ہے وہ اسی راستے سے خرچ ہوتا ہے بی بی۔ حلال اور اپنا ہوتا تو یوں لٹایا نہ جاتا۔"

ثریا لاجواب ہو گئی۔ اس کے دماغ میں بابا کے لیے یقین کا چراغ روشن ہو گیا۔ بابا تو اشارے کنائے میں ہر بات بتائے جا رہا تھا۔ لاکھ ہٹ دھرمی کے باوجود وہ اس حقیقت سے آنکھ نہ چرا سکتی تھی کہ وہ سب گھر والے شیراز کے مال پر ناجائز قابض ہو چکے تھے اور یہ ان کے لیے حلال مال کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

"بابا جی میں آپ سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہوں۔" ثریا نے گڑگڑاتے لہجے میں کہا۔ "مجھے سب کے سامنے بے عزت نہ کیجئے۔" اس کا لہجہ بے حد دھیما ہو گیا۔

"وہ تو تیری اپنی تمنا تھی بی بی...... ہم فقیروں کو تو کھل کر بولنے کی ویسے ہی اجازت نہیں ہوتی۔" بابا نے خشک لہجے میں کہا۔

"مجھے معاف کر دیجئے اور بتایئے میں کہاں اور کس وقت آؤں؟" وہ آواز کو ممکنہ حد تک نیچی کرتے ہوئے بولی۔

"ہم تو ہر وقت اللہ کے ان بندوں میں گھرے رہتے ہیں بی بی۔ جن کو زوردار ستاتے اور حالات نشانہ بنائے رہتے ہیں۔ تجھے کون سا وقت بتائیں' جب ہم اکیلے ہوں۔"

"کوئی بھی وقت بابا جی۔ خدا کے لیے ......" وہ اب بھی سرگوشی ہی میں بولی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھ ہی نہ رہی تھیں۔

"صبح نور کے تڑکے آ سکے گی؟"

"آ جاؤں گی' بابا جی۔" ثریا نے تیزی سے جواب دیا کہ مبادا بابا کا ارادہ بدل جائے۔

"تو جا...... ہفتے کے دن صبح فجر کے فوراً بعد آ جانا۔"

"شکریہ بابا جی۔" ثریا نے بابا کے منع کرنے سے پہلے ہی ان کے گھٹنے چھو لیے۔

"بہت ضدی ہے تو۔" بابا کے لہجے میں نرمی پا کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے گریبان میں رکھا پرس نکالنے کے لیے ہاتھ چادر میں متحرک کیے۔

"نہیں......" بابا نے اسے روک دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اب رخصت ہو جا۔"

"جی بابا جی......" ثریا نے ممنونیت سے کہا۔ سر پر چادر کو درست کیا۔ پھر شریفاں کی طرف دیکھا۔

"تو بھی بات کر لے۔"

"میں بھی بابا جی سے اکیلے میں بات کروں گی۔" شریفاں نے آواز دبا کر کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

"دوسرے کا منہ لال دیکھ کر اپنا تھپڑوں سے لال نہیں کرتے بی بی۔" بابا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں گی بابا جی...... مجھے بھی اکیلے میں وقت دیجئے۔" شریفاں نے سر جھکا کر کہا۔

بابا نے ایک طویل سانس لی۔ پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اچھا بی بی پرسوں شام کے بعد آ جانا۔ عشاء سے پہلے۔"

"جی بابا جی......" اس نے بھی بابا کے گھٹنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"بس بی بی بس...... اب تم لوگ جاؤ۔ بہت وقت لے لیا تم نے!" بابا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں سلام کر کے اٹھ گئیں۔ چبوترے سے اتریں۔ جوتیاں پہنیں اور الٹے پاؤں قبرستان سے نکل گئیں۔

بابا نے نیچے بیٹھے ہوئے مردوں میں سے ایک کو غور سے دیکھا۔ ہلکی ہلکی داڑھی کا حامل وہ تیس بتیس سال کا آدمی مناسب کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر چار خانے کا رومال لپیٹ رکھا تھا اور اس کے لبوں پر بڑی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

بابا نے اس پر سے نظریں ہٹا کر عورتوں کی طرف دیکھا۔ ان کے سر کا اشارہ پا کر ایک ادھیڑ عمر عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور بچے کو سنبھالتی ہوئی چبوترے کی طرف چل پڑی۔



"تم بابا سے اکیلے میں کیا بات کرنا چاہتی ہو آپی۔" شریفاں نے قبرستان سے نکلتے ہی ثریا کو مخاطب کیا۔

"کوئی خاص بات نہیں شریفاں۔" ثریا نے جلدی سے کہا۔ "بات تو وہی کرنی ہے شیراز کی تباہی اور حمید کی واپسی کے لیے۔ وہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے آپی۔" شریفاں نے گلے کے انداز میں کہا۔ "تم نے حمید بھائی کی بات مجھ سے بھی چھپا کے رکھی۔"

"کیا بتاتی شریفاں...... اندر ہی اندر جل کی کوئلہ ہو رہی ہوں۔ وہ کسی طوائف کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اب تو وہ دوسرے تیسرے ڈیرے پر بھی آنے لگی ہے۔"

"پھر بھی مجھ سے بات تو کرتیں آپی۔ میں کوئی تمہاری دشمن ہوں' جو تم نے مجھ سے پردہ رکھا۔"

"جی چھوٹا نہ کر شریفاں۔ اب تو تیرے علم میں آ ہی گیا ناں!"

"ہاں...... اور اس کے ساتھ ہی تم بابا سے اکیلے میں' میرے بغیر ملنا چاہتی ہو۔ مجھ سے اب بھی غیریت ہی برت رہی ہو ناں آپی۔ حالانکہ بابا کے پاس تمہیں مجبور کر کے بھی میں ہی لائی ہوں۔"

"شریفاں......" ثریا نے اسے تمسخر سے دیکھا۔ "تم بھی تو بابا سے اکیلے میں ملنے کی بات کر کے آ رہی ہو۔"

"میں نے تو صرف تمہاری بات سے چڑ کر بات کی ہے آپی۔" شریفاں نے صاف گوئی کہا۔ "ورنہ میرا مسئلہ تو سیدھا سادا ہے۔ مجھے اپنی گود ہری ہونے کے سوا کیا چاہیے؟"

"ویسے ہم سے ایک غلطی ہوگئی شریفاں۔" ثریا نے گلی کا موڑ مڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" شریفاں نے قدم اس کے ساتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں بابا کے پاس قبرستان نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"تو پھر؟" شریفاں حیرت سے بولی۔

"بابا کو گھر بلا لیتے۔"

"وہ کہیں نہیں جاتے۔ کسی کے گھر نہیں جاتے۔ جسے کوئی کام ہے وہ خود ان کے پاس قبرستان آئے۔ یہی ان کی شرط ہے۔"

"گاؤں کے چوہدریوں کے گھر بھی نہیں......"

"نہیں...... ساتھ والے گاؤں کے نمبردار نے باقاعدہ سواری اور بندے بھیجے تھے۔ بابا جی نے صاف انکار کر دیا۔ آخر نمبردار خود لاٹھی ٹیکتا ہوا ان کے قدموں میں آیا۔"

"جن کے پلے کچھ ہوتا ہے۔ وہی ایسا نخرہ کر سکتے ہیں' شریفاں۔" ثریا نے متاثر ہو جانے والے لہجے میں کہا۔

"وہ تو ہے۔ اب اپنی بات ہی لے لو آپی۔ بابا جی نے تمہارے سامنے جتنی باتیں کیں' سب سچ ہی تو تھیں۔"

"مگر شریفاں......" اچانک ثریا کے لہجے میں شک ابھر آیا۔ "ان باتوں کا پتہ تو بابا کو گاؤں کے کسی بھی آدمی سے چل سکتا ہے۔"

"توبہ کرو' آپی...... توبہ کرو۔" شریفاں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "بابا جی پر شک

کر رہی ہو۔ تمہیں علم نہیں وہ کیسے پہنچے ہوئے ہیں۔ گاؤں والے اور دوسرے دیہات کے لوگ کیا گل ہیں جو ان کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر کسی کو کوئی فیض ہوتا ہے تو بھیڑ لگتی ہے۔"

"میں نے بابا پر شک نہیں کیا شریفاں۔" ثریا جلدی سے بولی۔ "ایک خیال ظاہر کیا ہے۔ گر تم برا مان رہی ہو تو میں اپنے کہے پر شرمندہ ہوں۔ مگر خدا کے لیے اب بابا جی سے اس بات کا ذکر نہ کر دینا۔"

"مجھے ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود ہی جان لیتے ہیں دلوں کی بات۔" شریفاں نے منہ بنا کر کہا۔

"اللہ مجھے معاف کرے۔" ثریا نے پشیمانی سے کہا۔ "بس...... پریشانی نے مجھے شکی اور بد اعتماد بنا دیا ہے شریفاں۔"

حویلی آ گئی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئیں اور زنان خانے میں چلی آئیں۔ ایک ملازمہ اور اس کا دس بارہ سالہ بچہ صحن میں کام کر رہے تھے۔ وہ ان کو نظر انداز کر کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بچھے تخت پر بیٹھ گئیں۔

"ویسے آپی...... وہ طوائف کون ہے؟ جس نے حمید بھائی کو باندھ لیا ہے۔" شریفاں نے معلومات حاصل کرنا چاہیں۔

"ہے کوئی حرامزادی...... نازو نام ہے اس کا۔ پہلے تو حمید شہر اس کے کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا۔ یہ تمہیں بھی علم ہے کہ دونوں بھائی شروع سے عیاش ہیں۔ میں بھی خیال نہ کرتی کہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی عادتوں کو میں بدل نہیں سکتی مگر اب وہ اکثر ڈیرے پر آئی رہتی ہے۔ انسپکٹر منیر بھی ان کا ہم پیالہ وہم نوالہ بنا ہوا ہے۔ وہاں دن رات مجرے اور عیاشی کی محفلیں سجتی ہیں۔"

"شیراز کے حصے کی زمین بیچ کر جو رقم ملی ہے وہ دونوں بھائی کیا اسی طرح اڑا دیں گے؟" شریفاں نے فکرمندی سے کہا۔

"کیا کہہ سکتی ہوں میں......" ثریا پریشانی سے بولی۔ "بابا سے یہی بات کرنی ہے مجھے کہ کسی طرح حمید گھر کی طرف دھیان دے۔ اس طرح زمینیں اور جائیداد بیچ بیچ کر کب تک گزارا ہوگا۔ آخر ایک دن کشکول ہاتھ میں آ جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے آپی۔" شریفاں جلدی سے بولی۔ "مگر بات تمہاری بھی درست ہے۔ اکرم اور آصف زندہ تھے تو بہتری کی کوئی امید تھی۔ وہ باپ اور چچا کو لگام دے سکتے تھے۔ مگر اب......"

"وہ بھی بیٹے تھے تو میں آنکھیں بند رکھتی تھی' شریفاں۔ تاہم سچی بات تو یہ ہے کہ وہ باپ

اور چچا سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔"

"جانتی ہوں آپی۔" شریفاں نے ہولے سے کہا۔ "پھر بھی اپنی اولاد کو برا کون کہتا ہے لیکن اب تم ایک بہت بڑی کوتاہی کر رہی ہو آپی۔"

"وہ کیا؟" ثریا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جب سے گھر میں مرگ ہوئی ہے تم نے اپنی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔ ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ دکھائی دیتی ہو۔ حمید بھائی ہو یا نذیر...... انہیں طوائفیں اسی لیے بھاتی ہیں کہ ہم میں ان کو وہ کشش، خوبصورتی اور صاف ستھرا پن نہیں ملتا، جو طوائفوں کے نخرے کی جان ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اب اس عمر میں بھی میں بن سنور کر رہوں۔" ثریا نے حیرت سے کہا۔

"نہ رہو گی تو نازو یا اس کی کوئی اور بہن حمید بھائی کو لے اڑے گی۔ اپنی عمر نہ دیکھو۔ وقت کی نزاکت کو دیکھو۔ حمید بھائی کو رجھاؤ۔ اپنی طرف مائل کرو۔"

"شریفاں۔ تمہاری بات درست ہوگی مگر......؟"

"مگر اگر کرتی رہو گی، تو اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گی آپی۔ نذیر ویسے تو مجھے بہت پیار کرتا ہے تاہم میں جانتی ہوں، میری خالی گود اسے دوسری عورت کی طرف کسی وقت متوجہ کر سکتی ہے۔ اس لیے میں تو بابا جی سے صرف اولاد کے لیے دعا کراؤں گی۔ تم حمید بھائی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے زیادہ نہیں تو کم از کم میرے جتنی بن سنور کر تو رہا کرو۔ ورنہ بابا جی کے تعویذ کوئی میک اپ کا ڈبہ تو ہیں نہیں کہ حمید بھائی کو اپنی گرفت میں لے کر تمہارے بستر پر لا پھینکیں۔"

"بہت تیز ہو رہی ہو شریفاں۔" ثریا نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "خیر تو ہے۔"

"تم بھی تیز ہو جاؤ آپی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور حمید بھائی کے دل کی جیب کاٹ لے، تم ان پر اپنی دھار آزما لو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ثریا نے گھٹنے کھڑے کر کے ان پر ٹھوڑی ٹکا دی۔ "کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"صرف سوچو مت۔ عمل بھی کرو اس پر آپی۔ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔"

جواب میں ثریا نے سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ شریفاں کی باتوں کی تہ میں اپنے لیے سکھ اور سکون کا سیپ تلاش کر رہی تھی۔



"شہاب کو سعید پر گولی چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی چوہدری حمید۔" انسپکٹر منیر نے شراب کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو یہی کہتا ہے کہ گولی اتفاق سے چل گئی۔ اس کا نہ تو ارادہ تھا، نہ اس نے سعید پر رائفل، حمید نے جواب دیتے ہوئے ہاتھوں کو دائیں بائیں صوفے پر پھیلا لیا۔ شہاب اب بھی اسی پر اڑا ہوا ہے کہ سعید لڑکھڑا کر اس پر گرا۔ اس کے دھکے سے ٹریگر دب گیا اور گولی سیدھی سعید کے دل کو چیرتی پھاڑتی نکل گئی۔"

"وہ یہ بھی تو بتاتا ہے کہ اس وقت شیراز ان دونوں پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔ ممکن ہے، گھبرا کر سعید نے بھاگنا چاہا ہو یا بچنے کے لیے ادھر اُدھر ہونا چاہا ہو اور کسی چیز سے الجھ کر شہاب کی رائفل پر گرا ہو۔" نذیر نے پوری صورت حال کا تجزیہ کر دیا۔

"یہ سب اندازے ہیں۔" انسپکٹر منیر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ شہاب کو سعید نے ناکام ہونے پر ڈانٹ ڈپٹ کی ہوگی۔ بات تلخی سے گزر کر ہاتھا پائی تک پہنچی اور اس سے پہلے کہ سعید کوئی وار کرتا، شہاب نے اسے اڑا دیا۔"

"یہ بھی ممکن ہے۔" حمید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ کہو کہ شہاب سے کوئی خطرہ تو نہیں

"خطرہ کیسا؟" انسپکٹر منیر نے لاپرواہی سے کہا۔ "اس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت تو ہے نہیں۔ پھر کہے گا بھی تو کیا...... کہ ہم نے اسے شیراز کے قتل کے لیے خریدا تھا۔ اس طرح ہم پھنسیں گے تو وہ خود سیدھا پھانسی کے تختے پر ہوگا۔"

"اس وقت وہ ہے کس جگہ؟"

"حوالات میں...... رانا سہیل نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اسے قتل عمد کے جرم میں باندھ دیا ہے۔ اب وہ جتنا مرضی چیختا چلاتا رہے۔ عدالت کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔"

"سزا کتنی ہو سکتی ہے اسے؟" نذیر نے پوچھا۔

"سزائے موت سے بچ گیا تو چودہ سال کہیں نہیں گئے۔ وارڈن اس کے خلاف بڑی مضبوط شہادت ہے، جس نے اسے سعید کی لاش کے پاس رنگے ہاتھوں آلۂ قتل سمیت پکڑا۔"

"پھر بھی منیر......" حمید نے کسی خدشے کے تحت کہا۔ "اگر عدالت میں اس نے ہم میں سے کسی کا نام لے دیا تو؟"

"میں خود تو اس سے ملنے نہیں جا سکتا۔ تم اپنا کوئی بندہ بھیجو اس کے پاس اور میرے حوالے یہ پیغام اسے دے دو کہ اگر ہم میں سے کسی کا نام اس کی زبان پر آیا تو اس کے پورے کنبے کو ذبح کر دیا جائے گا۔" منیر نے اس طرح سے کہا جیسے برائلر مرغیوں کو ذبح کرنے کی بات کر رہا ہو۔

"بندہ کون سا بھیجوں...... کوئی قابل اعتماد آدمی نہیں ہے۔ اس وقت نظر میں۔" حمید نے

ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''میرے دونوں شیر آج زندہ ہوتے تو غم ہی کیا تھا؟'' اس کے لہجے میں تاسف ابھر آیا۔

''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی چوہدری حمید۔'' انسپکٹر منیر سیدھا ہو بیٹھا۔

''اتنی حیاتی گزر گئی ہے تمہاری ان چکروں میں۔ تم نے آج تک ذاتی ملازم ایک بھی ایسا نہیں رکھا جو تمہارے کچے چٹھے میں تمہاری پشت پناہی کر سکے۔ تمہارے آنے جانے والی جگہوں کو سنبھال سکے۔ اب یہی معاملہ لے لو۔ اگر تمہارا کوئی وفادار کتا اس وقت موجود ہوتا تو کیا مشکل تھی۔ اب ظاہر ہے شہاب تک کوئی بھی پیغام پہنچانا ہوگا یا اس سے کوئی بات دریافت کرنی ہوگی تو مجھے ہی آسرا دینا ہوگا تم لوگوں کو۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ہر وقت میری تلاشی لیتے رہنا کوئی اچھی صورت حال نہیں ہے۔''

''منیر...... میرے یار کیا بات کر رہا ہے۔'' حمید کو اس کے لہجے سے بدلحاظی کی بو آتی محسوس ہوئی تو وہ گھبرا گیا۔ ''اب تجھے تکلیف نہ دیں تو کسے کہیں۔ آخر کو تو ہماری ساجھے دار ہے۔''

''وہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں چوہدری۔'' منیر نے بے مروتی سے کہا۔ ''مگر خود بھی ہاتھ پاؤں ہلایا کرو۔ کوئی ایسا با اعتماد اچھی نسل کا بلکہ کتے کی نسل کا ملازم تلاش کر کے اپنے پیچھے کھڑا کرو جو یہ چھوٹے موٹے کام کرتا رہے۔ اتنی دولت کیا قبر میں ساتھ لے جاؤ گے۔ اگر تم اپنی سہولت اور فائدے کے لیے بھی مرے ہوئے بیٹوں کو یاد کر کر کے پلہ بچاتے ہو گے تو ایک دن بے موت مارے جاؤ گے میں کب تک تمہارے آنسو پونچھتا رہوں گا۔''

''تم ہی کوئی بندہ دے دو یار۔'' حمید نے منت سے کہا۔ ''جو خرچہ اور تنخواہ ہوگی میں بخوشی دینے کو تیار ہوں۔''

''اب یہ دفتر روزگار والا کام بھی میں ہی کروں۔'' منیر نے طنز سے کہا۔ ''چوہدری۔ تم تو بالکل ہی بے دال کے بودم ہو یار۔ بہرحال...... کرتا ہوں کچھ۔ شراب ڈالو۔'' اس نے حکم دینے کے انداز میں حمید کو اشارہ کیا۔

اس سے پہلے نذیر نے منیر کا گلاس پُر کر دیا۔ انسپکٹر منیر نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ سوڈا ملانے کی اس نے زحمت نہ کی تھی۔

''کب آئے گی تمہاری وہ چھمک چھلو...... '' اس نے خالی گلاس میز پر پٹختے ہوئے حمید کی طرف دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔''

''بس...... آتی ہی ہوگی۔'' حمید نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ ''دس بجے تو وہ چلی تھی یہاں آنے کے لیے۔''

''ایک گھنٹے کا فاصلہ تو نہیں ہے شہر سے۔'' منیر نے برا سا منہ بنایا۔ ''وہ بھی تیری طرح ڈھلم ڈھلی لگتی ہے۔''

''یہ تو نہ کہو انسپکٹر منیر۔'' حمید نے مونچھوں کو تاؤ دے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نازو جیسی جوانیاں دیکھ کر تو کسی ہوئی چارپائی کا خیال آ جاتا ہے۔''

''ہاں...... '' طنز سے منیر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسی چارپائی جس پر دو چار بار دھم سے بیٹھو تو ادوائن ہی نکل جائے۔''

''اب تم سے بحث کون کرے یار۔'' حمید کی ہنسی نکل گئی۔ نذیر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''لو...... آ گئی میری جان جگر۔'' حمید نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

سب کی نظریں کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں سے تقریباً آدھ منٹ بعد دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں اور تین استاد نما بندے داخل ہوئے۔ یہ نازو اور نینی تھیں، جو اپنے سازندوں کے ساتھ چوہدری حمید کے ڈیرے پر آئی تھیں۔

''آؤ آؤ سوہنیو...... بڑی دیر کر دی۔'' حمید نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ ''یہاں ہمارے انسپکٹر صاحب بور ہو رہے ہیں۔''

''ابھی بوریت دور کر دیتے ہیں، جی ان کی۔'' نازو نے بڑی ادا سے انسپکٹر منیر کی طرف دیکھا جو اسے بڑی بھوکی نظروں سے گھور رہا تھا۔

نینی نذیر کے پہلو میں جا بیٹھی۔ سازندوں نے قالین پر بیٹھ کر ساز درست کیے اور اجازت طلب نظروں سے چوہدری حمید کی طرف دیکھا۔

اسی وقت ڈرائیور نے دروازے میں آ کر قدم روکے۔

''چوہدری صاحب...... میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اس نے حمید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔''

''جی چوہدری صاحب...... '' وہ پلٹ گیا۔

''یہ ڈرائیور کب سے ہے تمہارے پاس؟'' انسپکٹر منیر نے اچانک حمید سے سوال کیا۔

''تین ساڑھے تین سال سے...... کیوں...... خیریت؟''

''کیسا آدمی ہے؟''

''مطلب؟''

''میرا مطلب ہے۔ وفادار ہے یا انسانوں کی نسل سے ہے؟''

"کبھی آزمایا نہیں۔ بس ڈرائیونگ کی حد تک ٹھیک ہے۔ کسی ذاتی کام میں اسے ڈالا ہی نہیں۔"

"ذاتی کام میں ڈالا نہیں اور ہیرامنڈی تک اکیلے کو بھیج دیتے ہو۔ عجیب آدمی ہو چوہدری تم بھی...... ارے...... ان پریوں سے زیادہ ذاتی کام کون سا ہوگا جس کے لیے تم اس پر اعتماد کر لیتے ہو۔ اس کا آگا پیچھا کیا ہے؟"

"گاؤں کے ایک مزارعے کا بیٹا ہے۔ جمال دین نام ہے۔ جمالا جمالا کہہ کر بلاتے ہیں۔ گھر بار اسی گاؤں میں ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔"

"اس کو شہاب تک روانہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ میرے پوچھنے کا اصل مقصد یہ ہے۔"

"سوچنا پڑے گا۔ آج تک اسے کوئی بھید دیا نہیں ہم نے کسی کام کا۔" حمید نے الجھ کر کہا۔

"تم نے ساری زندگی سب کام بیٹوں' یاروں اور بھائیوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر کیے ہیں چوہدری۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ تم کسی باہر کے آدمی کو بھی شہ رگ کے قریب آنے کا موقع دو۔ رسک لیے بغیر تو حکومتیں بھی نہیں چلتیں۔ تم کیسے محتاط شکاری ہو جو گیلی زمین پر پیر رکھتے ہی نہیں۔"

"اس کے علاوہ کسی اور آدمی کو تلاش کرنا پڑے گا منیر۔" حمید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے سامنے میں کھل نہیں کھیل سکوں گا۔ گاؤں میں عزت کا معاملہ ہے۔"

"اس کی کوئی جوان بہن ہے؟"

"نہیں......" حمید نے جواب دیا۔ "کیوں؟"

"ہوتی تو بتاتا ناں۔ اب بس کرو۔ چلو بھائی لوگو۔ شروع کرو۔ حمید چوہدری تو میرا مجرہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔" منیر نے سازندوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

"جی سرکار۔" سازندوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

نازو اور نینی اٹھ کر قالین پر آ کھڑی ہوئیں۔

پھر...... طبلے پر تھاپ پڑی۔ گھنگھرو چھنکے۔ لچکدار بدن حرکت میں آئے۔ محفل نے انگڑائی لی۔ شراب کے گلاس بار بار پُر ہوتے رہے۔ کاجو اور کباب کی پلیٹیں خالی ہوتی رہیں۔

رات کے دو بجے تھے جب رقص و سرور کی یہ انجمن اختتام پذیر ہوئی۔ نازو اور نینی نے ان تینوں کو حلق تک پُر کر دیا تھا۔

انسپکٹر منیر نشے میں بری طرح بدمست ہو رہا تھا۔ حمید اور نذیر نے بھی پی تھی' مگر وہ ابھی تک آپے میں تھے۔

"کیا بات ہے حمید...... کیا بات ہے؟" لڑکھڑاتی زبان میں انسپکٹر منیر نے کہا اور اٹھ کر نازو کی طرف بڑھا۔ "آؤ جانِ من۔ اب ذرا دو دو باتیں پیار کی بھی ہو جائیں۔" اس نے نازو کا ہاتھ تھام لیا۔

حمید گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"منیر......" وہ آگے بڑھا۔

"کیا ہے؟" انسپکٹر منیر کی زبان باقاعدہ لکنت کھا رہی تھی۔

"نینی موجود ہے۔ تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔" حمید نے نرمی سے کہا۔

"نینی کیوں؟ نازو کیوں نہیں؟" انسپکٹر منیر نے شرابی والی ضد پکڑ لی۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا ناں تم نینی کو لے جاؤ۔"

"ابھی تو یہ چھمک چھلو خوب توڑے دکھا رہی تھی۔ اب ایک دم کیا ہو گیا اس کی طبیعت کو۔" انسپکٹر منیر نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "میں اسی کو لے کر جاؤں گا۔ تم نینی کو لے جاؤ۔"

"بات کو سمجھا کرو یار۔" حمید نے کسمساتی ہوئی نازو کا ہاتھ منیر کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔

"تم سمجھو...... مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" منیر نے حمید کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تم نازو کو صرف اپنے استعمال میں رکھنا چاہتے ہو۔ مگر میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں چوہدری کہ جب ہم ساجھے دار ہیں تو سب کچھ مل بانٹ کر کھایا جائے گا۔ نازو اور نینی بھی ہمارا مشترکہ مال ہیں۔"

"یہ مال نہیں...... جیتی جاگتی عورت ہے یار۔" حمید نے ذرا تلخی سے کہا۔ "اس کے علاوہ تم جس شے پر ہاتھ رکھو وہ بانٹ لو۔"

"سوچ لو......" انسپکٹر منیر کی آنکھوں میں شیطنیت لہرائی۔ "اپنے الفاظ پر پھر غور کر لو۔ میں وہ سؤر ہوں جس سے تم بھاگ نہیں سکتے۔"

"سوچ لیا۔" حمید نے جھٹک کر کہا۔ "بس...... نازو سے دستبردار ہو جاؤ۔ یہ صرف میرا حصہ ہے۔"

"اور تم کیا کہتے ہو نذیر ڈھلو؟" انسپکٹر منیر نے سامنے کھڑے ہونٹ کاٹتے نذیر کی طرف دیکھ کر ڈگمگاتے ہوئے کہا۔ "تم بھی راضی ہو اس بات پر۔"

"میرا تو معاملہ ہی کوئی نہیں انسپکٹر منیر۔ نازو مل جائے یا نینی مل جائے۔ نہ ملے تو بھی ٹھیک ہے۔"

"تم نے تو فائدہ ہی فائدہ اٹھانے کی ٹھان رکھی ہے دوست۔" منیر بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ "بہر حال...... اس کا مطلب ہے مجھے صرف نازو سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ باقی ہر مال میں

شراکت ہے ناں؟"

"ہاں......" حمید نے بڑے ضبط سے کہا۔ اسے اب نازو کے چہرے پر بیزاری اور نفرت چھلکتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا اب انسپکٹر منیر نازو کا ہاتھ چھوڑ دے۔ قبل اس کے کہ وہ بدمزگی پر اتر آتا۔

"تو یہ لو......" انسپکٹر منیر نے نازو کو آزاد کر دیا۔ "یہ رہی تمہاری نازو اور یہ ہم......" وہ لڑکھڑاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "اب اپنی بات یاد رکھنا۔ نازو کی طرف میں ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا اور آج کے بعد کسی اور پر ہاتھ رکھنے سے تم مجھے نہیں روکو گے۔"

"منظور۔" حمید نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"اور اس میں کسی عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہوگی کہ وہ کون ہے؟"

"ظاہر ہے۔ تخصیص والی کون سی بات ہے۔ جو آئے گی یہیں تو آئے گی یا پھر جس کے پاس ہم جائیں گے۔"

"بالکل......" منیر نے قدموں کو ڈولنے سے روکنے کی کوشش کی۔ "یہ طے ہو گیا۔ اب تم نازو کو لے جاؤ اور آج کی رات نینی کے ساتھ میں رہوں گا۔ کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" حمید نے نازو کو پہلو میں لیتے ہوئے کہا اور نینی کی طرف دیکھا جو زبردستی مسکرا رہی تھی۔ انسپکٹر منیر جیسے درندے کے ساتھ وقت گزارنے کا خیال ہی اسے زہر لگ رہا تھا، مگر...... وہ مجبور تھی۔ انکار کا لفظ اسے لبوں سے نکالنے کی اجازت تو تھی، تاہم اس کے لیے بڑے خاص حالات درکار تھے۔

"آؤ جانِ من...... چلیں۔" انسپکٹر منیر نے نینی کے نازک بدن کو بازو تلے چھپایا اور بائیں کمرے کی جانب بڑھا۔ پھر رکا اور پلٹ کر نذیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب تم آج رات گھر چلے جاؤ چوہدری نذیر۔ یہاں تو کوئی آسامی خالی نہیں ہے۔"

پھر وہ نذیر کی شرمندگی کا خیال کیے بغیر زور زور سے قہقہے لگاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"بھائی جی۔ یہ کیا بلا پال لی آپ نے۔" نذیر نے اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوتے دیکھنے کے بعد حمید کا رخ کیا۔ "یہ تو دن بدن پھیلتا ہی جا رہا ہے۔"

"مجبوری ہے نذیر۔" حمید نے آواز دبا کر کہا۔ "ہم اس کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ ہماری ہر دکھتی رگ اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"پھر بھی بھائی جی۔ یہ تو کل کو بہت زیادہ تنگ کرے گا۔ اس کا آج کا رویہ بے حد خطرناک اور زہریلا تھا۔"

"کچھ سوچتے ہیں یار۔" حمید نے نازو کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "صبح بات کریں گے۔ تم ان استادوں کو باہر والے کمرے میں ٹھہراؤ اور جانا چاہو تو گھر چلے جاؤ۔"

"اب اس وقت میں گھر کیا جاؤں گا بھائی جی۔ ڈھائی بج رہے ہیں رات کے۔" نذیر نے ہنس کر بتایا۔

حمید اس کی بات کا جواب دیئے بغیر نازو کو لے کر اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا اور نذیر استادوں کو باہر لے گیا۔ انہیں ابھی کھانا بھی کھلانا تھا۔ اس نے جمال کو آواز دی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا

"ان کو کھانا کھلاؤ اور اپنے ساتھ والے کمرے میں آرام کرنے کے لیے ٹھہرا دو۔" نذیر نے کہا اور اندر لوٹ گیا۔

"آؤ۔" جمال ان کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ "گھر سے بھوکے ہی چلے تھے کیا؟"

"بھوکے تو نہیں چلے تھے باؤ جی۔ یہاں جو مشقت کی ہے اس سے بھوک لگ گئی۔ ویسے بھی لوگ الو کی نسل سے ہوتے ہیں۔ دن کو سوتے ہیں رات کو جاگتے ہیں۔ اب جاگیں گے تو کھانا پینا ہوگا ہی۔" ایک استاد نے زبان درازی کی۔

"تھوڑا بولو۔" جمال نے ان کو کمرے میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جمائی لی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں باؤ جی۔" تیسرے سازندے نے باقی دو کو جھاڑ پلائی۔ "ان کی نیند خراب مت کرو۔ اگر ان کی آنکھ کھل گئی تو کھانا خود کھا جائیں گے۔ چپ رہو۔" جمال نے گھور کر اس تیسرے میراثی کو دیکھا تو اس نے دانت نکال دیے۔

اپنی مزید عزت کرانے سے خاموشی کو بہتر خیال کرتے ہوئے جمال باہر نکل گیا۔ ابھی اسے کھانا گرم بھی کرنا تھا۔

ویسے اسے حیرت تھی کہ نازو اور نینی نے کھانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اب اسے کیا خبر کہ وہ دونوں حمید اور انسپکٹر منیر کے ساتھ اپنے اپنے کمرے میں کس کس ڈش سے نوازی جا رہی تھیں!





حوالات میں شہاب سے ملنے کے لیے جب رشید پہنچا تو اس کی اطلاع فوری طور پر رانا سہیل کو ہوگئی۔ تاہم اس نے رشید اور شہاب کی ملاقات پر کوئی پابندی لگانے سے قطعاً گریز کیا۔

سلاخوں کے اِدھر اُدھر رشید اور شہاب آمنے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ حوالات کے تنگ کمرے میں شہاب کے ساتھ دو اور ملزم بھی بند تھے جو ایک کونے میں دبکے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

''مجھے انسپکٹر منیر نے بھیجا ہے...... ایک خاص پیغام کے ساتھ۔'' رشید نے شہاب کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ جس کا رنگ چار دن ہی میں پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور مسلسل بخار نے آ لیا تھا۔

''اب کیا ہے؟'' شہاب نے کھانستے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی کسر باقی رہ گئی ہے جو پوری کرنے کے لیے خاص پیغام بھیجا ہے۔''

''آرام سے میری بات سنو۔'' رشید نے لہجہ بدل لیا۔ ''میں جو کہنے آیا ہوں کہہ کر چلا جاؤں گا۔ بعد میں اس پر غور کرتے رہنا۔ اس کی اونچ نیچ کو جانچتے رہنا۔ غصہ کرنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ اطمینان سے خون جلاتے رہنا۔''

''بہت بولتے ہو۔'' شہاب نے دانت پیستے ہوئے رشید کی طرف دیکھا اور اس کی انگلیاں سلاخوں پر مزید سختی سے جم گئیں۔

''کل تک تم بھی بولتے تھے۔'' رشید نے تمسخر سے کہا۔ ''جب تک میری بولتی بند نہیں ہو جاتی میں بھی بولوں گا۔''

چند لمحوں تک شہاب اُسے بے بسی سے تکتا رہا۔ پھر اس کے جسم کا تناؤ ختم ہو گیا۔ ایک گہری اور سرد آہ بھر کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''میرے مالک...... تیرے رنگ بتا رہے ہیں۔ آج میں وہ باتیں بھی سننے کے لیے مجبور ہوں جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

''ظاہر ہے...... کل تک تم گورنر تھے۔ معطل تو آج ہوئے ہو۔'' رشید نے طنز سے کہا۔

''تم جو بات کرنے کے لیے آئے ہو کرو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' رشید نے تنگ آ کر کہا۔

''بات صرف اتنی ہے شہاب خان۔'' رشید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''انسپکٹر منیر نے کہا ہے کہ اگر عدالتی کارروائی میں یا کسی اور جگہ ہم لوگوں میں سے کسی کا نام آیا تو۔''

''تو کیا کرے گا وہ؟...... ہیں؟'' شہاب ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں چپ چاپ پھانسی پر چڑھ جاؤں اکیلا...... یہ نہیں ہوگا۔ میں مروں گا تو ساتھ سب کو لے کر مروں گا۔''

''پوری بات سن لو پہلے۔'' رشید نے دائیں بائیں انکھیوں سے جائزہ لیتے ہوئے پھر اس کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر منیر کا پیغام ہے کہ اگر تم نے کہیں بھی حرامزدگی کی تو تمہارے پورے کنبے کو اڑا دیا جائے گا۔''

''کیا؟'' شہاب کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک ہی پل میں آسمان سے زمین پر آ گیا۔ ''ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ؟''

''جیسے اس نے کہہ دیا ہے ویسے ہی وہ کر بھی دے گا۔'' رشید نے اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر اطمینان سے کہا۔ ''تم اسے جانتے نہیں۔ اپنا مطلب اور حکم منوانے کے لیے وہ کس حد تک جا سکتا ہے یہ تمہارے چھوٹے سے دماغ میں نہیں آ سکتا۔''

''مگر میرے بال بچے کا کیا تعلق اس معاملے سے، وہ تو بے قصور ہیں۔'' شہاب نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''سعید کا کیا قصور تھا؟'' رشید کے لہجے میں تلخی ابھر آئی۔ ''اسے تم نے کیوں مار ڈالا؟''

''میں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے اسے نہیں مارا۔ گولی اتفاقیہ چلی۔'' شہاب بے بسی سے چیخ اٹھا۔

''ہر مجرم یہی کہتا ہے کہ میں نے جرم نہیں کیا۔ جس طرح تم کہہ رہے ہو۔ جب مانے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا تو کہتا ہے یہ میرا پہلا جرم ہے جیسے تم اپنے جرم کو اتفاقیہ کہہ رہے ہو۔''

''اب میں کس طرح یقین دلاؤں تمہیں؟'' شہاب نے ماتھا سلاخوں پر دے مارا۔

''مجھے یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔'' رشید نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ''میں تو انسپکٹر منیر کا پیغام دینے آیا تھا، وہ دے دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ تمہارا چالان عدالت میں کب

پیش ہو رہا ہے؟"

"پرسوں۔" شہاب نے آہستہ سے جواب دیا۔

"محتاط رہنا۔ اپنی زبان کو ایسی گانٹھ دے لو جو غیر ضروری سوال پر کھل نہ سکے۔ ہر بات منہ سے نکالتے ہوئے انسپکٹر منیر کو یاد کر لینا' وہ جو کہہ دے اس کا وہی مطلب ہوتا ہے۔"

شہاب جواب میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس کے دماغ نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

رشید چند لمحے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر "چلتا ہوں" کہہ کر اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر رخ پھیرا اور بیرونی راستے کی طرف چل پڑا۔

تقریباً تیس گز دور آفس میں بیٹھے وارڈن رحیم الدین نے اس کو رخصت ہوتے دیکھا تو آفس سے نکلا اور شہاب کی طرف چل پڑا۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ؟" اس نے شہاب کو آ کر چونکا دیا جو ابھی سلاخوں سے ماتھا ٹیکے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"آں...... کون؟" وہ اچھل سا پڑا۔ پھر رحیم الدین کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ "کون کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہ...... رشید...... جو ابھی تم سے مل کر گیا ہے۔"

"کچھ نہیں...... ویسے ہی ملنے آیا تھا۔"

"دوست ہے تمہارا؟" رحیم الدین نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔

"نہیں......" شہاب کا سر نفی میں ہل گیا۔

"کوئی رشتے دار ہے؟"

"نن...... نہیں......" وہ ہکلایا۔

"تو پھر کیا قسمت کا حال پوچھنے آیا تھا تم سے؟" رحیم الدین نے تمسخر سے کہا۔

"میں...... میں رانا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" اچانک شہاب نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا۔

"کیوں؟"

"یہ میں انہی کو بتاؤں گا مگر رحیم الدین...... خدا کے لیے مجھے ان سے ملوا دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"تمہیں جو کہنا ہے مجھ سے بھی کہہ سکتے ہو۔"

"نہیں...... خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کرو رحیم الدین۔" شہاب کا لہجہ بھک منگوں کا سا ہو گیا۔

"مجھے چند منٹ کے لیے رانا صاحب سے ملوا دو۔"

"ٹھیک ہے۔" رحیم الدین نے اس کا جائزہ لیا۔ "میں رانا صاحب سے بات کرتا ہوں۔ ملنے نہ ملنے کا فیصلہ ان کا اپنا ہوگا۔"

"انہیں کہنا بس ایک بار مجھ سے مل لیں۔ دوبارہ میں ان کو تنگ نہیں کروں گا۔" شہاب نے ہنتے رحیم الدین سے رو دینے کے انداز میں کہا۔

رحیم الدین نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔



کمرے میں رانا سہیل کے علاوہ استاد اور شیراز بھی موجود تھے۔ شہاب ان کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔

"میں سچ کہتا ہوں رانا صاحب...... آپ چاہیں تو میں قرآن اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ نے سعید پر جان بوجھ کر ارادتاً گولی نہیں چلائی۔ میں نے تو شیراز پر رائفل اٹھائی تھی۔ بس اسی جیسے کسی نے سعید کو مجھ پر دھکا دے دیا۔ میری انگلی لبلبی پر تھی۔ دب گئی اور گولی سیدھی سعید کے گھس گئی۔"

"یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکے ہو اور میں بار بار سن چکا ہوں۔" رانا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارے' سعید اور شیراز کے سوا کوئی چوتھا موجود تھا کیا؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کس نے دھکا دیا سعید کو؟"

"یہ میں نہیں جانتا جی۔ ہو سکتا ہے اس کا آگے بڑھتا ہوا اپنا پاؤں رپٹ گیا ہو اور وہ رائفل پر ہو۔"

"چلو...... مان لیا...... مگر یہ تو طے ہے ناں کہ تم نے شیراز پر رائفل اٹھائی تھی۔"

"جی ہاں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"کیوں؟"

"انہوں نے ہم دونوں پر ریوالور نکال لیا تھا رانا صاحب۔"

"بلاوجہ؟"

"جی نہیں......" ایک دم شہاب کے لہجے میں جرأت عود آئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ ایک نظر شیراز کو غور سے دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پھر اس کی نظریں رانا سہیل پر جم گئیں۔

"بلاوجہ نہیں سر...... میں اس سے پہلے شیراز کو زہر دینے کی کوشش کر چکا ہوں۔"

"اچھا......" رانا نے انجان بننے کی زبردست اداکاری کی۔ "وہ کیوں؟"

"مجھے اس کام کے لیے سعید نے پچیس ہزار روپے دیئے تھے۔"

"سعید نے...... مگر اس نے شیراز کو کیوں مروانا چاہا؟"

"اس نے نہیں جی......" شہاب نے ہاتھ نفی میں ہلایا۔"شیراز کے بھائیوں حمید' نذیر او
کے ساتھی انسپکٹر منیر کا منصوبہ تھا کہ شیراز کو جیل ہی میں مار ڈالا جائے۔"

"تم نے شیراز کو زہر دیا...... شیراز بچ گیا...... الزام تم پر بھی تو آ سکتا تھا...... تم پھنس
تھے اس جرم میں۔" رانا نے جرح کی۔

"جی نہیں...... ان لوگوں کا منصوبہ بڑا مکمل تھا۔ ایک خط شیراز کی طرف سے لکھ کر مجھے دیا
تھا کہ جب شیراز ہلاک ہو جائے تو اس کی جیب میں رکھ دوں۔ اس میں شیراز کی طرف سے لکھا گیا
کہ......"

"میں اپنی مرضی سے جان دے رہا ہوں۔ خودکشی کر رہا ہوں۔" رانا نے شہاب کی بات مکمل
دی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" شہاب بری طرح چونکا۔

"تم نے ہلاک ہو جانے والی بلی جس وقت ڈسٹ بن میں ڈالی تھی' میں وہ وقت بھی بتا سک
ہوں شہاب۔" رانا نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔"میرا نام رانا سہیل ہے۔ زنداں میں کوئی پرندہ بھی
کب آتا ہے' کب اڑ جاتا ہے' کس جگہ سے دانا چگتا اور کس پیالے سے پانی پیتا ہے۔ مجھے اس کی
بھی خبر رہتی ہے۔ یہ جیل میری سلطنت ہے' میں یہاں کا بے تاج بادشاہ ہوں اور حکومت سو کر نہیں کی
جاتی' اس کے لیے خود بھی جاگنا پڑتا ہے اور ایسے لوگوں کو ساتھ رکھنا پڑتا ہے جو دن رات جاگنے کے
عادی ہوں۔"

"سر...... میں...... میں......" شہاب حواس باختہ تو تھا ہی اب ہاتھ پاؤں بھی چھوڑ بیٹھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں سر...... میں نے سعید کو جان بوجھ کر قتل نہیں کیا؟ آپ میری بات کا
یقین کریں سر...... اس روز بھی میں اس سے صرف آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ یہ حادثہ
ہو گیا......"

"دوبارہ اس بات کا ذکر مت کرنا شہاب۔" اچانک استاد کی آواز گونجی۔"تم نے قرآن
اٹھانے کی بات کی۔ ہم نے مان لیا کہ تم نے قرآن کی قسم کھا لی۔ تم نے جو کہا سچ کہا۔ ہمارا ایمان ہے
کہ کوئی راندۂ درگاہ' کوئی بدبختِ ازل' کوئی نارِ جہنم کا لقمہ ہی قرآن کی جھوٹی قسم اٹھا سکتا ہے' ایک
مسلمان نہیں۔ تم کتنے بھی گنہ گار ہو' مسلمان تو ہو یا وہ بھی نہیں رہے۔"

"نہیں سر......" اچانک شہاب کی ہمت جوان ہو گئی۔"میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ گنہ گا

ر ہوں۔ راندۂ درگاہ نہیں ہوں۔"

"تو بس...... سمجھ لو اور یقین کر لو کہ ہمیں تمہاری قسم پر اعتبار ہے۔ اب بولو...... آج رشید تم
کیا کہنے آیا تھا اور تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" رانا سہیل نے پھر اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے سر۔" شہاب کی آواز بھرا گئی۔

"کیسی دھمکی؟" رانا نے پوچھا۔ شیراز اور استاد بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوری طرح
کنے ہو گئے۔

"یہ کہ اگر میں کبھی بھی انسپکٹر منیر یا شیراز کے بھائیوں کا نام درمیان میں لایا تو انسپکٹر منیر
ے کنبے کو اڑا کر رکھ دے گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں سر۔ بوڑھی ماں ہے۔ بیوی ہے' ان
اہوں کو مار ڈالنے کا کہہ کر اُس نے مجھے......"

"حوصلہ کرو جوان۔ حوصلہ کرو۔" رانا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"حوصلہ کیا کروں سر۔" روتا ہوا شہاب آگے بڑھا اور رانا کے قدموں سے لپٹ گیا۔"آپ
بے شک پھانسی پر چڑھا دیجئے مگر میرے بال بچے کو بچا لیجئے۔ ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں

"میرے پاؤں چھوڑو اور آرام سے بیٹھو شہاب۔" رانا نے اُسے کندھے سے پکڑ کر الگ
تے ہوئے کہا۔ پھر اُسے پاس پڑی کرسی پر بٹھا دیا۔

"سر...... میرے بال بچے تو بالکل بے قصور ہیں۔" وہ اب بھی سسک رہا تھا۔

"تمہارے حوالے سے بے قصور تو شیراز بھی تھا شہاب۔" رانا نے سرد لہجے میں کہا۔"اُس نے
کیا بگاڑا تھا جو تم اس کے قتل پر آمادہ ہو گئے؟"

"بس...... لالچ میں آ گیا سر...... غریب آدمی ہوں۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔"میں
سے بھی معافی مانگ لیتا ہوں سر۔" اُس نے شیراز کے پاؤں پڑنے کے لیے حرکت کرنا چاہی۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں...... مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔" شیراز نے اُسے ہاتھ اٹھا کر
روک دیا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" رانا نے استاد سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کنائے
بعد شہاب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر...... صرف اپنے بال بچے کی حفاظت چاہتا ہوں۔ میں اس کے لیے خود مرنے
لیے تیار ہوں۔ آپ چاہیں گے تو میں عدالت میں اقرار جرم کر لوں گا۔"

"نہیں...... میں چاہتا ہوں تم عدالت میں اپنے جرم سے انکار کرو۔"

"وہ کیوں سر؟"

"تاکہ تمہیں شبے کا فائدہ دیا جا سکے۔" رانا نے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"مگر سر......" شہاب کی آواز تھرا گئی۔ "میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے میرے خلاف قتل عمد کا پرچہ کاٹا ہے۔"

"ہاں...... سب کو یہی معلوم ہے۔ مگر میں نے ابھی تک تمہارے خلاف پرچہ لکھا ضرور ہے اس میں قتل عمد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آج پرچہ مکمل کروں گا۔"

"سر......" رشید اٹھا اور بے اختیار رانا کے قدموں میں گر پڑا۔ "سر...... آپ نے مجھے لیا۔ مجھے خرید لیا...... آپ میری جان بھی مانگیں تو میں آپ پر قربان کر دوں گا سر۔" وہ رو رہا تھا۔

"میں تمہاری جان بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم جان دینے پر تلے ہوئے ہو۔" رانا بار ہنسا۔ "اٹھو...... اور میری بات غور سے سنو۔"

"جی سر......" ہچکیاں اور سسکیاں لیتا ہوا شہاب دوبارہ کرسی پر بیٹھا تو اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ موت کا خوف دل و دماغ سے نکلتے ہی وہ جیسے جی اٹھا تھا۔

"تمہیں عدالت میں کیا بیان دینا ہے۔ یہ تمہیں وکیل سمجھائے گا۔ میں چاہتا ہوں دو تین پیشیوں میں اس مقدمے سے تمہاری جان چھوٹ جائے۔ اس وقت تک تم انسپکٹر منیر یا اس کے ہوئے کسی بھی آدمی کے ساتھ تو تڑاک نہیں کرو گے۔ انہیں یہی علم ہونا چاہیے کہ تم ان کے کہنے پر چل رہے ہو۔"

"سمجھ گیا سر......" شہاب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان لوگوں کو یقین آ جانا چاہیے کہ تم نے ان کی دھمکی سے خوفزدہ ہو کر ان کا نام کیس کے دوران کہیں بھی سامنے نہیں آنے دیا۔"

"جی سر۔"

"دوبارہ تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ کیس کا فیصلہ ہونے تک ہمارے درمیان کوئی بھی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سر۔ مگر ایک درخواست ہے۔"

"کہو۔"

"میرے گھر والوں کی حفاظت کا پھر بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیجئے۔ مجھے ان بے دینوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔"

"ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔"

"شکریہ سر۔"

"بس...... اب جاؤ اور میری ہر بات پلے سے باندھ کر رکھنا۔" رانا نے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔

"جی سر......" شہاب کسی روبوٹ کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رانا کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ شیراز اور استاد کی طرف ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا' جس کے باہر دو سپاہی اُسے واپس حوالات میں لے جانے کے لیے کھڑے تھے۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا استاد!" اس کے جانے کے بعد دروازہ بند ہوا تو رانا نے پوچھا۔

"بالکل نہیں......" استاد نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی کرنا بہتر ہے۔ اب ان کا ایک مہرہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے اگر اس کی خبر شہاب تک پہنچی تو سمجھو ہم تک ضرور آ جائے گی۔"

"بالکل۔" رانا نے تائید کی۔ "ویسے میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں استاد۔"

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ انسپکٹر منیر کو منظر عام سے ہٹا دیا جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے......" استاد نے گلے پر ہاتھ پھیرا۔

"نہیں...... صرف غائب کر دیا جائے۔"

"فائدہ؟"

"چوہدری حمید اور نذیر کی سب سے بڑی ڈھال ہے وہ...... اسی کے سر پر وہ من مانی کرتے پھرتے ہیں۔"

"اس کی جگہ اُن کے تھانے میں جو بھی جائے گا وہ اُسے خرید لیں گے۔" شیراز نے دخل دیا۔

"نہیں...... انسپکٹر منیر کی جگہ وہاں جو بھی جائے گا بکنے والا نہیں ہوگا۔ ہمارا اپنا آدمی ہوگا۔" رانا نے جواب دیا۔

"ایک حد تک تمہاری بات درست ہے۔" استاد نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی گھنی داڑھی میں خلال کیا۔ "اگر ان دونوں کی بنیاد ہی ہلا دی جائے تو وہ واقعی مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔"

پھر اس نے رانا کی طرف دیکھا۔

"اندازاً کتنے عرصے کے لیے اُسے بنگلے میں چھپانا پڑے گا۔"

"جب تک ہمارا کام مکمل نہ ہو جائے۔" رانا نے معنی خیز نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا۔

''اور اُسے آخر میں نمٹایا جائے گا۔'' شیراز نے جلدی سے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' رانا نے اس کی بات پر مسکرا کر کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اُسے معاف کر دیا جائے گا؟''

''تو یہ نیک کام کب کرنا ہے؟'' استاد نے پوچھا۔

''جلد ہی۔ بس میں ذرا پلاننگ کر لوں۔''

''رکھنا کہاں ہے اُسے؟''

''میرا فارم کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھی جگہ ہے...... پُرسکون...... الگ تھلگ اور محفوظ!'' استاد مسکرایا۔

''تو بس...... ایک آدھ دن میں یہ کام کر گزرتے ہیں۔'' رانا نے جواب دیا۔

''تیار ہو جا ماسٹر...... تیرا سب سے بڑا دشمن بے بس ہونے جا رہا ہے۔'' استاد نے شیراز کے کندھے پر بازو دراز کرتے ہوئے اُسے ساتھ لگا لیا۔

''میں اس سے کب مل سکوں گا استاد؟'' شیراز نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''ایک دو دن بعد...... اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' رانا نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا' جس نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

''ہیلو......'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔

پھر دوسری طرف سے کسی کی بات سن کر اُس نے کہا۔ ''میں آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ تم مہمانوں کو اٹینڈ کرو۔''

''خیریت؟'' استاد نے پوچھا۔

''تمہاری بھابی کا فون تھا یار۔'' رانا نے پی کیپ سر پر جماتے ہوئے جواب دیا۔ ''بچی کو دیکھنے کے لیے کچھ لوگ آنے والے تھے' وہ پہنچ گئے ہیں۔ گھر جا رہا ہوں۔ سہ پہر کو لوٹوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... اور سنو......'' استاد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی صرف دیکھنے دکھانے تک رکھنا معاملہ کو۔ بغیر جانچ پڑتال کے ہاں مت کر دینا۔ یہ بچیوں کے معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں۔''

''تم سے مشورہ کر کے ہی کروں گا جو بھی کروں گا۔'' رانا نے سیٹ چھوڑ دی۔ شیراز بھی اٹھ گیا۔

وہ تینوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ رانا تو گھر کو روانہ ہو گیا اور استاد شیراز کے ساتھ میدان میں دھوپ کھانے کے لیے ایک سنگی بنچ پر آ بیٹھا۔



چوہدری حمید اور نذیر' انسپکٹر منیر کے ہمراہ اس کے تھانے کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک میز پر چائے کے برتن سجے تھے۔ چائے وہ پی چکے تھے۔ آخری سپ لے کر انسپکٹر منیر نے بھی سامنے رکھی فائل بند کر دی اور ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارے...... چار بج گئے...... شام ہونے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا۔'' وہ رسٹ واچ پر وقت دیکھ کر حیرت سے بولا۔

''سردیوں کے دن ہیں یار' وقت کو پَر لگ جاتے ہیں اس موسم میں۔''

''دن یوں بھی چھوٹے ہو جاتے ہیں۔'' حمید نے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے کہا۔

''ویسے خیریت تھی جو فون کیا تھا؟''

''ہاں......'' انسپکٹر منیر نے خود کو کرسی پر ایزی کیا۔ ''خیریت ہی تھی۔ میں ابھی دو گھنٹے پہلے شہر سے لوٹا ہوں۔''

''اور اب آدھ گھنٹے سے ہمیں سامنے بٹھا کر خود فائل میں گھسے ہوئے ہو۔ جیسے ہمیں صرف اپنا دیدار کرنے کے لیے بلوایا تھا۔'' حمید نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''غصے مت ہو میری جان۔'' انسپکٹر منیر نے اُسے پچکارا۔ ''ایک تو میں خود تمہارا کام کر کے لوٹا ہوں اور تم میرے پاس بیٹھنے سے بھی گریزاں ہو۔''

''بات بیٹھنے کی نہیں ہے یار۔ لگتا ہے اب تمہارا موڈ ہم سے بدلنے لگا ہے۔ ورنہ یہ کوئی بات ہے کہ ہم آئے بیٹھے الوؤں کی طرح تمہارا منہ تکا کریں اور تم فائل کھنگالتے رہو۔'' حمید اب بھی روٹھا روٹھا تھا۔

''ارے بابا ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ فائل مجھے ابھی واپس آئی جی کے پاس بھجوانی ہے۔ اسے مکمل ہونے میں دیر لگتی تو کام کل پر پڑ جاتا اور میری خواہ مخواہ کھنچائی ہو جاتی۔''

''اچھا اچھا...... مان لیا۔ اب بولو...... خیر سے گئے تھے شہر؟''

''کہا ناں...... تمہارا ہی کام کرنے گیا تھا۔''

''کون سا کام؟'' نذیر نے زبان کھولی۔

''شہاب کو الرٹ کرنے کا کام۔''

''یعنی...... تم خود گئے تھے اس کے پاس؟'' حمید نے حیرت سے کہا۔

''نہیں۔ رشید کو ساتھ لے گیا تھا۔ آئی جی کے دفتر میں کام تھا۔ سوچا لگے ہاتھوں یہ کام بھی کرتا آؤں جو آج بھی مجھے کرنا ہے اور کل بھی۔''

''یہ تو تم نے کمال کیا میرے یار۔'' حمید کی باچھیں کھل گئیں۔ ''پھر کیا کہا اس ولد الحرام نے؟''

''کہنا کیا تھا۔ رشید بتا رہا تھا کہ اس کی تو بولتی بند ہوگئی۔ گھگی بندھ گئی۔''

''اس کا مطلب ہے اب وہ ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔'' نذیر نے خوش ہو کر کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انسپکٹر منیر نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''وہ مرتا مر جائے گا مگر اپنے گھر والوں کی خاطر خاموش رہے گا۔''

''تم ہر آڑے وقت میں ہمارے کام آتے ہو یار!'' حمید نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا اور ممنونیت سے انسپکٹر منیر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''پھر بھی تم میرے پاس آ کر گھنٹے منت گنتے رہتے ہو۔'' منیر نے ان کا مضحکہ اڑایا۔

''بس کرو یار...... تم تو بال کی کھال نکالنے لگتے ہو۔'' حمید نے مکھن کا ایک اور کوٹ پھیرا۔

''اب تم لوگ ایک کام کرو۔'' انسپکٹر منیر نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ حمید اور نذیر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''شہاب کا چالان آج کل ہی عدالت میں پیش ہو رہا ہے۔ اس کا تفتیشی نور عالم خان نیازی میرا جاننے والا ہے اسے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔''

''تم حکم کرو یار۔ کیا دینا ہے؟''

''ایک لاکھ تو دینا ہی چاہیے۔''

'ایک تفتیشی کو ایک لاکھ روپے؟'' حمید نے حیرت سے کہا۔

''قتل کا کیس ہے۔ وہ کیس انچارج ہے۔ اسے ہاتھ میں رکھنے کے لیے یہ رقم زیادہ نہیں۔''

انسپکٹر منیر نے ان کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''میری پلاننگ کچھ اور ہے۔''

''کیا؟'' نذیر اور حمید آگے جھک آئے۔

''شہاب کسی وقت بھی ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کیس کے دوران ہی کسی وقت اُسے......'' اس نے خاموش ہو کر ان دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''وہ کام اسی ایک لاکھ میں ہو جائے گا ناں؟'' حمید نے جلدی سے پوچھا۔

''تمہیں تو کسی بنئے کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا چوہدری حمید۔'' انسپکٹر منیر نے طنز سے کہا۔ ''یہ پیسہ خرچ کرتے وقت تم اس قدر ہندو کیوں ہو جاتے ہو۔''

''یہ بات نہیں یار۔ دراصل آمدن کا کوئی مستقل ذریعہ تو ہے نہیں۔ فصل تیار ہونے پر تو ہاتھ خاصا کھل جاتا ہے۔ باقی وقت ذرا سوچ سمجھ کر ہی گزارنا پڑتا ہے۔'' حمید نے صفائی پیش کی۔

''اور وہ جو شیراز کی زمین سے روپیہ حاصل ہوا۔ کیا سب ٹکرے لگ گیا؟''

''نہیں...... اس میں سے دس لاکھ تمہیں دیا۔ باقی تیس تیس لاکھ ہم دونوں کے حصے میں آیا۔ اب وہ خرچ ہی ہو رہا ہے۔ کون سا انڈے دے رہا ہے سونے کے۔''

''سب سے زیادہ تو ناز و پر خرچ ہو رہا ہوگا۔'' انسپکٹر منیر نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی سو اخراجات ہیں۔ چوہدراہٹ یوں ہی تو قائم نہیں رہتی۔''

''بہر حال...... اگر شہاب کے کیس میں اسے صرف خاموش رکھنا ہے تو ایک لاکھ اور اگر شہر خاموشاں میں بھجوانا ہے تو اس کا معاملہ الگ سے طے کرنا پڑے گا۔''

''یہ تو خاصا مہنگا کام ہو جائے گا یار۔'' حمید بڑبڑایا۔

''فی الحال یہ ایک لاکھ تو ڈھیلے کرو۔ باقی بعد میں دیکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جا کر جمال کے ہاتھ بھجواتا ہوں رقم۔'' حمید نے بہ امر مجبوری کہا۔

''شام سے پہلے بھجوا دینا۔ کرم داد یہ فائل شہر لے جائے گا تو نیازی سے بھی ملتا آئے گا۔''

جواب میں حمید محض سر ہلا کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے اور انسپکٹر منیر اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی رہائش تھانے کے عقبی حصے میں تھی۔ دو پختہ کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جو اس نے اپنے استعمال میں رکھا ہوا تھا۔ بال بچے ساہیوال میں تھے وہ جگہ جگہ ان کو ساتھ لئے پھرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے جہاں بھی جاتا' اکیلا ہی جاتا۔

آدھ گھنٹے بعد حمید کا ڈرائیور جمال وین آیا اور انسپکٹر منیر کو ایک لاکھ روپے دے گیا۔ اس نے رقم جیب میں ڈالی۔ پھر کرم داد کو طلب کیا۔

''کرم داد...... یہ فائل لو اور شہر چلے جاؤ۔ آئی جی آفس میں اسے پی اے اشرف کے حوالے کر کے ڈائری نمبر لے لینا اور بے شک صبح لوٹ آنا۔ یہ لو...... آنے جانے کا خرچہ رکھو۔''

''یس سر۔'' کرم داد نے اس کے ہاتھ سے سو سو روپے کے دو نوٹ اچکتے ہوئے کہا۔

''اور سنو...... اگر چاہو تو شفیق کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی اتاولا ہو رہا تھا شہر جانے کے

لیے۔اس کا اپھارہ بھی کم ہو جائے گا۔"

"سر...... اُسے جانا ہے تو خود جائے۔ مجھ پر اس کے کرائے بھاڑے کا بوجھ تو نہ ڈالیں۔" کرم داد نے دو سرخ نوٹ مٹھی میں جکڑے جکڑے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"بڑے سؤر ہو تم...... یہ لو...... اس کا خرچہ بھی رکھو۔" انسپکٹر منیر نے سو روپیہ اور اُس کی طرف بڑھایا۔"اور صبح دس گیارہ بجے تک لوٹ آنا۔ میں آج رات گھر جانا چاہتا ہوں۔ مہینہ بھر ہو گیا بچوں کو دیکھے ہوئے۔ میرے بعد یہاں کوئی ذمے دار آدمی بھی رہنا چاہیے۔ فضل کو تو بس سونے سے فرصت نہیں ملتی۔" انسپکٹر منیر کا اشارہ محرر کی طرف تھا۔

"ہم لوٹ آئیں گے سر۔ ویسے سر۔ ایک خبر دینی تھی آپ کو۔"

"کیا؟"

"گاؤں میں ایک کرنی والا آیا ہوا ہے سر۔"

"کرنی والا۔ کون ہے وہ؟" انسپکٹر منیر نے منہ بنا کر پوچھا۔

"قبرستان میں بیٹھتا ہے جی...... کچھ لیتا دیتا نہیں۔ مگر جو کام کرتا ہے لوہے تو ڑ ہوتا ہے۔"

"ارے یہ سب ڈھکوسلے ہیں کرم داد۔ تم کن چکروں پر یقین کرنے لگے۔ جسے زندوں کی دنیا میں آسرے کے لیے قبرستان میں ٹھکانہ ملا وہ بھی کیا کرنی والا ہو گا۔ چھوڑو...... یہ سب ڈھونگی ہوتے ہیں۔ بلکہ اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔ واپس آ کر اس پر نظر رکھو۔ اکثر وارداتئے ایسے سوانگ رچا کر پولیس سے چھپتے پھرتے ہیں۔ مجرموں کی بہت بڑی تعداد جعلی پیروں کے بھیس میں رہتی ہے۔"

"سر...... آپ یقین کریں اس بابے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو بڑا پہنچا ہوا ہے جی۔ دو بار مل چکا ہوں اس سے...... اس نے مجھے سر درد کا دم کیا تھا جو کئی ہفتوں سے میری جان لے رہا تھا۔ اس دن سے سر درد نہیں ہوا دوبارہ۔"

"سر درد تھا تو اسپرین کھا لیتے' بابے کے دم نے اس میں کیا معجون ملا دی کہ تمہیں آرام آ گیا؟" انسپکٹر منیر نے اس کا مذاق اڑایا۔

"سر جی...... چوہدری حمید اور چوہدری نذیر کی بیویاں بھی دیکھی ہیں میں نے اس کے پاس بیٹھی ہوئی۔" آواز دبا کر کرم داد نے کہا تو انسپکٹر منیر چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"وہ کیا لینے گئی تھیں وہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"یہ تو پتہ نہیں جی مگر گئی ضرور تھیں۔"

"کرم داد۔" انسپکٹر منیر نے اُسے اشارہ سے قریب ہونے کو کہا۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور ذرا

سا جھک گیا۔

"میرا ایک ذاتی کام ہے۔ کرو گے؟"

"ضرور کروں گا جی......" کرم داد نے افسر کے نزدیک ہونے کا موقع سونگھ لیا۔

"شریفاں...... کے لیے راہ ہموار ہو سکتی ہے۔"

"راہ ہموار کرنے کی کیا ضرورت ہے جی۔" کرم داد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔"کسی رات ویسے ہی حویلی جا دھمکیں۔ وہ دونوں خنزیر تو ڈیرے پر ہی راتیں گزارتے ہیں۔ رکاوٹ کیا ہے؟"

"نہیں کرم داد...... یوں نہیں۔" انسپکٹر منیر نے نفی میں سر ہلایا۔"میں نہیں چاہتا کہ یہ کام زبردستی ہو یا اس میں ناکامی آڑے آئے۔"

"سر جی...... اگر آپ اجازت دیں تو ایک کام ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" انسپکٹر منیر نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"میں بابے سے شریفاں کے لیے تعویذ لا دوں آپ کو؟"

"بکواس......" انسپکٹر منیر ہتھے سے اکھڑ گیا۔"تو نے مجھے کیا نامرد سمجھ رکھا ہے کرم داد۔ یہ تعویذ وغیرہ کچھ نہیں کرتے اگر اپنے آپ میں دم نہ ہو۔ دیکھ...... ایک جوڑے کے گھر اولاد نہیں ہوتی۔ پیر نقش دے دیتا ہے کہ اسے گلے میں ڈال لو۔ عورت نقش گلے میں ڈال لیتی ہے مگر اب باقی کا کام تو اس کے مرد نے کرنا ہے یا وہاں بھی نقش اپنا نام سلاجیت رکھ کر جھومنا شروع کر دے گا۔"

"سر جی......" کرم داد گڑبڑا گیا۔

"بکو مت......" انسپکٹر منیر نے اسے جھڑک دیا۔"ہاں تم ایک کام کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔" کوئی خیال آتے ہی انسپکٹر منیر نے لہجہ بدل لیا۔

"کیا سر جی......؟" کرم داد بجھتے بجھتے جل اٹھا۔

"بابے سے معلوم کرو یا نظر رکھو کہ شریفاں کسی شام یا رات کو اکیلی بابے سے ملنے جائے۔ بس باقی کام میں سنبھال لوں گا۔ مگر مجھے اس کی اطلاع پہلے ہونی چاہیے اور تمہیں اس میں کوتاہی نہیں کرنی۔ یہ یاد رہے۔"

"سمجھ گیا سر جی۔" کرم داد نے سر ہلا کر دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔"ویسے میں آج شہر جاتے ہوئے قبرستان کے راستے ہی سے گزروں گا۔ بابے سے مل کر جاؤں گا۔ شاید کوئی خبر مل جائے۔"

"وہ تمہارا مسئلہ ہے لیکن خبردار جو تم نے میرے اور شریفاں معاملے میں بابے سے کسی تعویذ کی

بات کی۔"

"مجھے کیا اپنی کھال ادھڑوانی ہے جی آپ کی حکم عدولی کر کے۔ میں تو نسوہ لینے جاؤں گا بس۔ اپنے لئے میں نے صرف کمر درد کا دم کرانا ہے۔ سر درد کا آرام آ گیا اب یہ باقی ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری کمر۔" انسپکٹر منیر اٹھ کھڑا ہوا۔ "بہر حال جیسے میں نے کہہ دیا ویسے ہی ہونا چاہیے۔"

"جی سر......" کرم داد نے اٹن شن ہو کر کہا۔

انسپکٹر منیر کے جانے کے بعد اس نے ایک اطمینان بھرا سانس ہونٹوں سے خارج کیا۔

"اف...... کیا بلا کا تھانے دار ہے۔ جان نکال لیتا ہے پل بھر میں۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر صحن سے گزرتے شفیق کو دیکھ کر باہر نکل آیا۔

"او بھائی...... چل تیری لاٹری نکل آئی۔" اس نے فائل سنبھالتے ہوئے شفیق کو آواز دی۔

"کیا ہوا؟ کیوں شور مچا رہا ہے؟"

"صاحب نے شہر جانے کا حکم دیا ہے۔ چلے گا میرے ساتھ؟"

"ارے...... نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ لپک کر اس کے قریب چلا آیا۔

"تو چل...... تیار ہو کر آ جا...... چھ بجے کی بس سے نکل چلتے ہیں۔"

"واپسی کب ہے؟" شفیق نے جلدی سے پوچھا۔

"صبح...... دس گیارہ بجے تک کی چھوٹ ملی ہے۔"

"بہت ہے۔" شفیق کی باچھیں کھل گئیں۔ "میں نے سوچا کہیں رات ہی میں واپسی کا حکم نہ مل گیا ہو۔"

"بس اب بڑبڑ مت کر۔ جلدی آ جا۔ میں یہیں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ راستے میں مجھے بابا جی کے پاس بھی دس منٹ کے لیے رکنا ہے۔"

"ارے ہاں کرم داد۔ یاد آیا۔ یار بابے کے دم نے تو میرے کڑاکے نکال دیئے یار۔"

"کیا ہوا؟"

"بس یار...... جس دن سے دم کرایا ہے۔ رات کو الٹے سیدھے خواب آنے بند ہو گئے۔ اب خوب مزے سے سوتا ہوں اور ہلکا پھلکا اٹھتا ہوں۔"

"بابے کے پاس بہت کچھ ہے یار۔ مگر اپنے صاحب مانتے ہی نہیں۔ الٹا مجھے جھاڑ رہے تھے کہ میں کن چکروں میں پڑ گیا ہوں۔"

"ارے چھوڑ...... تم نے اس سے ذکر ہی کیوں کیا۔ صاحب تو سیدھا سیدھا ڈنڈا پیر ہے۔ سے ان نازک باتوں سے کیا سروکار۔"

"ٹھیک کہتے ہو یار مگر اب حکم یہ لگ گیا ہے کہ کل سے بابے پر نظر رکھی جائے۔ کہیں وہ کوئی جعلی پیر ہی نہ ہو۔"

"ارے توبہ توبہ......" شفیق نے منہ پیٹ لیا۔ "کیسی عجیب باتیں کرتا ہے ہمارا صاحب بھی۔ اللہ اسے معاف کرے۔"

"اچھا بس...... یہ ذکر چھوڑ اور کپڑے بدل کر آ جا۔ پانچ بج رہے ہیں، وقت کم ہے۔" کرم داد نے بات روک دی۔

شفیق "ابھی آیا۔" کہہ کر چٹکی بجاتا ہوا اپنے حجرہ نما کمرے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔



"اب کیا حال ہے تیرا اسنتری بادشاہ۔" بابا جی نے چراغ کی تھرکتی لو میں کرم داد کا جائزہ لیا جو شفیق کے ساتھ ان کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔ شام کے بعد جھٹ پٹے کا وقت تھا اور اس وقت وہاں ان تینوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں بابا جی۔" کرم داد نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔ "دوبارہ سر درد نہیں ہوا۔"

"چلو...... اللہ نے تمہیں شفا دے دی۔ اس کا شکر ادا کرو۔" پھر وہ شفیق کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اور تم اب آرام سے نیند لے رہے ہو یا نہیں کاکا؟"

"آپ کی دعا سے بالکل سکون ہے بابا جی۔" شفیق نے بھی بے حد پگھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اب امن ہی امن ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ وہی سب کو شفا دینے والا ہے۔ وہی سب کی مشکلیں ٹالنے والا ہے۔" بابا نے آنکھیں بند کر کے سرشاری سے کہا۔

"بابا جی...... اب اس کمر درد کا بھی کچھ کریں۔" کرم داد نے زبان کھولی۔

"لاؤ بھئی...... اس کو بھی بھگا دیتے ہیں اللہ کے حکم سے۔" بابا جی بولے اور اسے رخ پھیرنے کو کہا۔ کرم داد نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ بابا جی نے اس کی کمر پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور نرمی سے تین بار ہاتھ پھیر دیا۔

"اللہ شفا دے گا۔ بس ٹھنڈی چیزوں سے کچھ دن پرہیز رکھنا۔"

"جی بابا جی۔" اس نے پھر رخ ان کی طرف پھیر لیا۔ "بابا جی...... ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پوچھو سنتری بادشاہ...... بُرا ماننے والی ہوگی تو سوچیں گے۔"

"صرف یہ پوچھنا تھا بابا جی...... چوہدرانیاں کس لیے آئی تھیں آپ کے پاس؟"

"تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" بابا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو کرم داد گھبرا گیا۔

"بس ایسے ہی بابا جی۔" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عجیب سا لگا تھا ان کو یہاں دیکھ کر۔ یہ امیر لوگ ہم غریبوں کے ہر ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں۔ منگتے کہیں کے۔"

"سچ کہہ رہا ہے......؟" بابا نے اسے گھور کر پوچھا۔ "یہی بات ہے یا......؟"

"وہ جی...... بابا جی......" کرم داد ٹھٹک گیا۔

"جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے کرم داد۔" بابا نے ڈپٹ کر کہا۔ "تیرا لہجہ چغلی کھا رہا ہے کہ تو غلط کہہ رہا ہے۔"

"بابا جی......" کرم داد نے بابا کے گھٹنے تھام لیے۔ "مجھے معاف کر دیں جی...... دراصل......" اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے شفیق کی طرف دیکھا۔

"کہہ ڈال...... جو کہنا ہے کہہ ڈال۔ یہ کسی سے نہیں کہے گا۔ یہ تیرا ساتھی ہے۔ تجھ سے غداری نہیں کرے گا۔"

"بابا جی...... دراصل ہمارے انسپکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ چوہدرائی شریفاں......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"بس...... زبان روک لے اپنی......" بابا کی آواز اتنی ہی گرجدار اور غصیلی تھی کہ کرم داد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شفیق بھی حواس باختہ ہو گیا۔ بابا کا چہرہ چراغ کی لو میں یوں دہک اٹھا جیسے کسی نے شیشے پر روشنی کی لہر ڈال دی ہو۔

"بابا......" کرم داد اتنا ہی کہہ سکا۔

"بھڑوا سمجھ رکھا ہے ہمیں...... کنجر لکھا ہوا ہے ہمارے ماتھے پر؟"

"بابا......" کرم داد کا حلق خشک ہو گیا۔

"بس...... بکواس نہیں...... چلو بھاگو یہاں سے اور سنو...... اس روپے کے پجاری سے کہہ دینا ایسی کوئی بات ہمارے بارے میں سوچی بھی تو اس کا حشر خراب ہو جائے گا۔"

"بابا......" کرم داد بے اختیار اس کے گھٹنوں پر جھک گیا۔ "مجھے معاف کر دیں بابا جی۔ غلطی ا ہے۔ صاحب نے مجھے آپ سے بات کرنے کے لیے نہیں کہا۔ میں نے تو اپنے طور پر......"

"حق نمک ادا کرنے کے لیے دلالی نہیں شروع کر دیتے کرم داد۔" بابا کا غصہ اب بھی فرو نہ

"میں پھر معافی مانگتا ہوں بابا جی۔" کرم داد گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"آج رات کہاں ہوگا تیرا صاحب؟" بابا نے قبرستان کے اندر آتے راستے پر کسی کا سایہ رتے دیکھ کر پوچھا۔

"آج رات وہ اپنے گھر جا رہے ہیں جی...... تین چار دن تک واپس آئیں گے انسپکٹر حب۔" کرم داد کو کچھ حوصلہ ہُوا۔ بابا کے لہجے میں نرمی پاتے ہی وہ جلدی سے بول اٹھا۔

"ہوں......" بابا نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں۔ "واپس آ لینے دے اُسے۔ پھر ریں گے۔ ویسے ایک بات سُن لے۔ اس کا خراب وقت شروع ہونے والا ہے۔ مگر خبردار تو اس واس بارے میں ہرگز ہرگز کچھ نہیں بتائے گا۔ جب ہم تجھے اجازت دیں گے تب تو زبان کھولے گا۔"

"ایسا ہی ہوگا بابا...... آپ کے حکم کے بغیر میں کبھی زبان نہیں کھولوں گا۔"

"تو بس...... اب رخصت ہو جاؤ تم دونوں۔"

"جی بابا جی......" دونوں نے بابا کے گھٹنے چھوئے جو بابا کے نزدیک ایک ناپسندیدہ فعل تھا مگر اس وقت انہوں نے ان دونوں کو نہ روکا۔

"اور سنو......" بابا نے ان کو چبوترے سے اتر کر جوتے پہنتے دیکھ کر کہا۔

"جی بابا جی......" وہ دونوں متوجہ ہوئے۔

"اس طرف سے نکلو...... پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔" بابا نے قبرستان کے باہر کچے کی طرف اشارہ کیا جو چبوترے والے درخت کے پچھلی طرف دکھائی دے رہا تھا۔

"جی بابا جی۔" دونوں ادب سے سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

بابا نے دور سے آتی شریفاں کو پہچان لیا تھا جو سر سے پاؤں تک سیاہ چادر میں لپٹی لحہ بہ لحہ نزدیک آتی جا رہی تھی۔

پھر کرم داد اور شفیق جب قبرستان سے نکل کر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کچے پر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو شریفاں نے چبوترے کے قریب قدم آن روکے۔

"آ گئی تو......" بابا نے بند آنکھیں کھولیں۔

"جی بابا......" شریفاں سلام کر کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر سے خود کو خوب لپیٹ لیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا بدن گرم سویٹر اور چادر کے باوجود کپکپا رہا تھا جبکہ بابا جی ایک عام سی چادر میں بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔

"بول...... کیا مسئلہ ہے تیرا؟" بابا نے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

"بابا...... آپ سب جانتے ہیں۔"

"اس دوسری کی طرح ہمارا امتحان نہ لے۔ پہیلیاں نہ بجھوا۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈال تاکہ نہ تیرا وقت ضائع ہو نہ ہمیں غصہ آئے۔"

"بابا......" شریفاں نے نظریں جھکا لیں۔ "میری گود سونی ہے۔"

"ہوں۔" بابا نے اس کے خوبصورت' سرخ و سفید اور ملیح چہرے کو غور سے دیکھا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو؟"

"بارہ سال۔"

"کسی ڈاکٹر حکیم کو دکھایا؟"

"بہت علاج کرائے بابا...... کوئی فرق نہیں پڑا۔" شریفاں کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"میاں کو بھی دکھا لیتیں کسی ڈاکٹر کو؟"

"جی......" شریفاں نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا۔

"ضروری تو نہیں کہ نقص تجھ میں ہی ہو۔ اسے بھی تو اپنا آپ کسی وید حکیم کے سامنے کھولنا چاہیے۔"

"مگر......" شریفاں جھجک گئی۔

"سب عورت پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ اُسے نظروں میں رکھتے ہیں' کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے ساتھی میں بھی تو خامی ہو سکتی ہے۔"

"میں اس سے کس طرح کہہ سکتی ہوں۔ وہ تو مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔ مرد کب اپنی ذات میں کوئی رخنہ برداشت کرتا ہے۔"

"یہ ضروری ہے بی بی۔" بابا نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "تیری حالت بتاتی ہے کہ تجھ میں پھل دینے کی صلاحیت ہے۔ مالی کی آبیاری میں کمی ہے۔"

"بابا......" شریفاں اس مرتبہ بڑے زور سے چونکی۔ "کیا...... کیا آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں......" بابا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میاں کو منا' اسے راضی کر۔ اسے بتا کہ اگر گھر میں نئی چاہتا ہے تو کنکشن درست کرائے' ورنہ گھر میں اندھیرا بڑھتے بڑھتے رات آ جائے گی۔"

"کوئی اور راستہ نہیں ہے بابا۔" شریفاں بجھ سی گئی۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تو کوشش تو کر۔"

"بابا...... مجھے امید نہیں کہ میں کامیاب ہو سکوں۔" شریفاں نے سر جھکا لیا۔

"اسے میرے پاس لا سکتی ہے؟" بابا نے اچانک سوال کیا۔

"بات کر کے دیکھوں گی۔" وہ ہولے سے بولی۔

"پہلے کبھی کسی پیر فقیر کے پاس گیا ہے تیرے ساتھ؟"

"کئی بار۔"

"تو یہاں بھی آ جائے گا۔ نہ آیا تو پھر سوچیں گے کیا کیا جا سکتا ہے۔" بابا نے اُسے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے بابا۔ میں جلد ہی اس سے بات کروں گی۔"

"ضرور کرنا۔ اور کچھ؟"

"ہاں...... ایک چھوٹی سی عرض اور ہے بابا۔"

"بول۔"

"اسے شراب اور طوائف کی لت ہے۔"

"تبھی تو گھر کی رونق سے محروم ہے بی بی...... جب بندہ اپنی روشنیاں غیروں کے قدموں نچھاور کرنے لگتا ہے تو اس کے اپنے گھر میں اندھیرے ڈیرے لگا لیتے ہیں۔"

"تو اس کا کچھ کیجئے بابا...... وہ ان عادتوں سے باز آ جائے۔"

"کریں گے...... نوچندی جمعرات کو اسی وقت آنا اس کام کے لیے اور میاں سے بات کر کے مجھے کل پرسوں تک بتانا۔"

"میں کس وقت آیا کروں بابا۔"

"زیادہ بار آنے کی ضرورت نہیں بی بی...... جب کام سبب ہو تب آنا اور جب بھی آنا اسی وقت آنا۔ لوگوں کی نظریں کم سے کم تم پر پڑیں۔ یہی اچھا ہے۔"

"جی...... بابا جی...... اجازت ہے۔"

"ہاں...... جاؤ...... اور سنو...... اب جس رات وہ گھر سے باہر رہنا چاہے ہمیں خبر کرنا۔ اس

کے قدموں میں زنجیر ڈالیں گے۔"

"جی بابا جی...... ابھی کل رات ہی وہ ڈیرے پر گزار کر آیا ہے اپنے بڑے بھائی حمید کے ساتھ...... رات بھر وہاں کیا گلچھرے نہ اڑے ہوں گے۔" وہ سسک پڑی۔ "طوائفوں نے ڈیرے کا بازار بنا دیا ہے۔"

"کیا نام ہے تیرے میاں کا؟" بابا نے اچانک پوچھا۔

"نذیر...... چوہدری نذیر۔"

"ٹھیک ہے ہم آج رات ہی کچھ کریں گے۔ اب جاؤ۔"

"شکریہ بابا جی۔"

شریفاں چبوترے سے اتری، جوتی پہنی، سلام کیا اور رخصت ہو گئی۔ اس کے قبرستان سے باہر نکلتے ہی بابا نے دور مزار کے گنبد کی جانب نگاہ کی۔ جس پر جگمگاتی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ یہ کسی اللہ والے کی قبر تھی، جو سارے قبرستان کو مدھم مدھم مگر رنگ برنگی روشنیوں سے نوازتی رہتی تھی۔

"حق ہُو...... حق ہُو...... حق ہُو......" بابا کے لبوں سے تین بار بلند بانگ نعرہ نکلا اور مزار کے دروازے سے ایک جوان آدمی نکل کر قبروں کے درمیان چل پڑا۔ اس کا رخ بابا کی طرف تھا۔ جو "حق ہُو حق ہُو" کی دھیمی آوازوں کے ساتھ دائیں بائیں جھوم رہے تھے اور ان کی نظریں اس آدمی پر جمی ہوئی تھیں جو قدم بہ قدم ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔



انسپکٹر منیر اپنی جیپ میں تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتا جی ٹی روڈ پر اڑا جا رہا تھا۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ وہ دس بجے گاؤں سے چلا تھا۔ رشید اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

سردیوں کی طویل اور سرد رات...... ویران سیاہ سڑک...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی ہوائی جہاز بنی جیپ کو دیکھتی روڈ لائٹس اور الرٹ بیٹھا انسپکٹر منیر...... وقت کے سینے پر دندناتا نجانے کس خیال میں گم تھا کہ اسے اپنی انگلیوں میں دبے سگریٹ کے ختم ہونے کا احساس تب ہوا جب اس کے گُل کی تپش نے اسے چونکایا۔

"اوہ......" کہتے ہوئے اس نے سگریٹ کا گُل جھاڑا۔ ایک آخری کش لیا۔ اپنی طرف شیشہ نیچے کیا۔ سگریٹ باہر پھینکا اور جلدی سے شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ سرد ہوا نے ایک ہی پل میں اس کے مزاج درست کر دیئے تھے۔

رشید بھی اس سرد لہر سے جاگ گیا۔ کمبل کو کانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے کسمسا کر انسپکٹر

کی طرف دیکھا جو ونڈ سکرین سے باہر نظریں جمائے پھر ڈرائیونگ میں محو ہو گیا تھا۔

رشید کو اس نے صرف اس لیے ساتھ لیا تھا کہ لمبا سفر اکیلے کاٹنا ذرا بور اور مشکل ہو جاتا مگر وہ تو کے آدھ گھنٹے بعد ہی اونگھنے لگا تھا۔

"اونشئی کی اولاد......" انسپکٹر منیر نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تجھے میں اس لیے نہیں لایا کہ تو مجھے بھی اونگھنے پر مجبور کر دے۔"

"سر جی...... سردی بہت ہے اور فارغ بیٹھا میں نیند ہی کا شکار ہو سکتا ہوں۔"

"تو ماہیے سنا مجھے...... ٹپے گا...... کچھ تو کر منحوس...... اگر میری آنکھ جھپک گئی تو دونوں اوپر جائیں گے۔"

"نہ نہ سر جی......" رشید گھبرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی ساری سستی کافور ہو گئی۔ "ایسی باتیں کر کے مجھے ڈرائیں مت۔ ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"شادی کرا کے کیا کرے گا بھڑوے...... اکیلا جی رہا ہے۔ موج کیا کر۔ شادی ہو گئی تو اسی سرد راتوں میں میری طرح لمبی لمبی سڑکیں ناپتا نتھ والی کی طرف بھاگا کرے گا۔" انسپکٹر منیر نے مسکرا کر کہا۔

"نتھ والی کا ایک اپنا ہی نشہ ہوتا ہے سر جی۔" رشید نے مزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ان سے پوچھیے جن کو ابھی تک یہ میوہ نصیب نہیں ہوا۔"

"بڑی سیوا کراتا ہے یہ میوہ...... تجھے کیا معلوم۔"

"سیوا کے بعد جو میوہ ملے اس کا مزہ نہیں بھولتا سر جی۔"

"ابے چغد...... تو کیا مجھے رن مریدی کا سبق پڑھا رہا ہے۔" اچانک انسپکٹر منیر نے بھڑک کر کہا۔ "میں کسی اور معنی میں بات کر رہا ہوں تو مجھے ماشیا بن جانے کے گُر سمجھا رہا ہے۔"

رشید بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ارے...... یہ کیا......" اچانک انسپکٹر منیر کا پاؤں بریک پر دبتا چلا گیا۔ تارکول کی سیاہ جیپ کے ٹائروں تلے کچلی گئی تو چیخ اٹھی۔

انسپکٹر منیر کی نظریں سڑک کے عین درمیان گرے اس بڑے سے درخت پر جمی تھیں جس نے یوں روک لیا تھا کہ پیدل آدمی تو اس پر سے پھلانگ کر گزر سکتا تھا، کوئی سواری اُسے ہٹائے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔

جیپ رک گئی۔

انسپکٹر منیر نے فوراً ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ رشید نے بھی کمبل ہٹا کر اپنی رائفل ہاتھوں میں

تھام لی جو اس کے پیروں میں پڑی موت کی طرح سرد ہو چکی تھی۔

انسپکٹر منیر نے غور سے دائیں بائیں' پھر گردن گھما کر پچھلے شیشے سے باہر دیکھا۔ دور دور تک کھیت اور درخت اور پیچھے حدِ نگاہ تک سڑک ویران تھی' خاموش تھی' دم سادھے ہوئے تھی' سامنے پیچھے سے کوئی اور گاڑی بھی نہ آ رہی تھی۔

"یہ درخت سڑک پر اس طرح کیوں پڑا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

"کوئی آندھی بھی نہیں چلی کہ یہ اکھڑ کر آن گرا ہو۔" رشید نے بھی رائے دینا ضروری سمجھی۔

"مجھے تو خطرے کی بو آ رہی ہے سر جی۔"

"ہوں......" انسپکٹر منیر نے چوکنی نظروں سے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بڑبڑایا۔ "باہر تو نکلنا پڑے گا ورنہ کسی اور گاڑی کے آنے کے انتظار میں نجانے کب تک رکنا پڑے۔"

"مگر سر جی......" رشید نے کہنا چاہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"حوصلہ کر بکری کے بچے......" انسپکٹر منیر چڑ گیا۔ "کیا سر جی سر جی کر کے میرا سر کھا رہا ہے۔ اگر یہ کسی کی شرارت ہے تب بھی وہ باہر کھڑے نہ رہیں گے۔ چند لمحوں بعد دھاوا بول دیں گے۔ اندر بیٹھ کر ہم چوہے کی موت مارے جا سکتے ہیں۔ باہر ہوں گے تو بچ نکلنے کے چانسز ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ کسی کی شرارت ہی ہو۔ اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ درخت اکھڑ کر گر پڑا ہو۔"

"پھر...... کیا کرنا چاہئے سر جی؟" رشید ہکلا کر رہ گیا۔

"میں باہر نکلتا ہوں۔ تم اندر ذرا چوکنے ہو کر بیٹھنا۔ چاروں طرف نظر رکھنا۔ بلکہ ایسا کرو پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ۔ تم آزادی سے حرکت کر سکو گے۔ مجھے کور کرنا۔ اگر کوئی وارداتیوں کا ٹولہ ہی اس حرکت میں ملوث ہے تو ہم الگ رہ کر زیادہ اچھی طرح ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں...... سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا سر جی......" رشید نے کمبل جسم سے الگ کیا۔ پہلے رائفل پچھلی سیٹ پر رکھی۔ پھر خود بھی ادھر لڑھک گیا۔

انسپکٹر منیر نے ریوالور کا میگزین چیک کیا۔ آخری بار چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ کوئی حرکت نہ پا کر اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔

"لائٹ بند کر دو رشید۔" وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

رشید کا ہاتھ جیپ کی چھت کی طرف بڑھا اور اندر کی لائٹ آف ہو گئی۔ اندھیرا ہوتے ہی کلک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ انسپکٹر منیر نے اگلا دروازہ آہستہ سے کھولا اور جھک کر باہر رینگ گیا

اُترتے ہی وہ سڑک پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر چوکنا نظروں سے دیکھ کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور لپک کر جیپ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک منٹ...... دو منٹ...... تین منٹ۔

پورے پانچ منٹ گزر گئے۔

کوئی آواز ابھری نہ کوئی حرکت ہوئی۔

انتظار کے اعصاب شکن لمحات نے انسپکٹر منیر کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ سرد رات اور وحشی...... نادیدہ دشمن کے وار کی سمت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ بالآخر وہ تنگ آ گیا۔ سڑک پر جھکے انداز میں وہ تقریباً دوڑتا ہوا درخت کے قریب پہنچا اور اس کی جڑ کے قریب دبک گیا۔

وہاں بھی وہ تین چار منٹ پڑا رہا...... مگر...... خاموشی نے سانس نہ توڑا۔

اس دوران وہ مسلسل اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا۔ کسی آہٹ کی سُن گُن لیتا رہا۔ ناکامی نے اسے یقین دلا دیا کہ وہاں کسی دشمن کا وجود ناپید ہے تو ایک طویل سانس لے کر وہ آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں آگ اگلنے کو تیار موجود تھا۔

آخری بار اپنا اطمینان کرنے کے لیے اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ ریوالور تانے رکھا۔ خود کو ایک پل کے لیے سُست یا لاپرواہ نہ ہونے دیا۔ تب اُسے سکون نے تھپکی دی کہ وہاں ان کے علاوہ کوئی موجود نہیں ہے۔

"رشید......" اس نے جیپ کی طرف رخ کر کے آواز دی۔

"سر جی......" وہ اندر ہی سے زور سے بولا۔

"آ جا...... یہ درخت ہٹانا پڑے گا۔"

"کوئی خطرہ تو نہیں ہے سر جی؟" وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔

"نہیں میرے باپ...... خطرہ ہوتا تو اب تک مجھے چاٹ گیا ہوتا۔ آ جا......" اس نے ریوالور کو انگلی پر گھماتے ہوئے جواب دیا۔

رشید نے اس کے بعد بھی ایک منٹ جیپ سے باہر آنے میں لگا دیا۔ شاید وہ اپنے طور پر اطمینان کر رہا تھا کہ باہر کی صورت حال واقعی تسلی بخش ہے یا نہیں! پھر جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا۔ رائفل ہاتھ میں تھامے رشید نے ڈرتے ڈرتے سڑک پر قدم رکھا۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ ایک دم اس نے دوڑ لگائی اور انسپکٹر منیر کے پاس آ کر دم لیا۔

"ابے الو کے پٹھے...... تجھے کس نے پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے کہا تھا۔" انسپکٹر منیر کی زبان سے نکل گئی۔ "تیرا کام تو دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھونا ہونا چاہیے تھا۔"

''سر جی...... اندھیرے کے تیر سے ڈر لگتا ہے...... نجانے کس طرف سے موت آ دھمکے۔'' وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ اب بھی وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''تیرا کوئی باپ یہاں موجود نہیں ہے۔'' انسپکٹر منیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ درخت اکیلا ہی راستہ روکے پڑا ہے۔ اسے ہٹانے کی سوچ۔''

''یہ ہم دونوں کے بس کا روگ نہیں ہے سر جی۔ بہت بڑا ہے یہ اور وزنی بھی۔'' رشید نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں غور سے مگرمچھ کی طرح لیٹے درخت کو دیکھا۔

''ہم دونوں مل کر اسے ایک انچ حرکت نہیں دے سکتے جناب رشید صاحب۔'' انسپکٹر منیر نے طنز آمیز ادب سے کہا۔ ''جیپ سے رسی نکالئے اور اس کے ساتھ باندھیئے۔ پھر جیپ اسے کھینچ کر ایک سائڈ پر کر دے گی اور آپ جناب تشریف آگے لے جا سکیں گے۔''

''سر جی...... آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔'' رشید نے شرمساری سے کہا۔

''نہیں جناب چغد صاحب...... میں آپ کی بے عزتی فرما رہا ہوں' اگر آپ محسوس کریں تو......'' انسپکٹر منیر نے دانت بھینچ کر کہا۔ پھر ایک دم اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''اس بے بے کو یہاں رکھو اور جیپ سے رسی نکال کر لاؤ۔'' اس کا اشارہ رائفل کی طرف تھا۔

رشید نے رائفل درخت کے ساتھ ٹکائی اور خاموشی سے جیپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ورنہ اب کے شاید انسپکٹر منیر اسے ایک آدھ جھانپڑ رسید کر دیتا۔

رشید جیپ کے قریب پہنچا۔

انسپکٹر منیر نے ریوالور انگلی میں نچاتے ہوئے رخ بدلا اور دور کھیتوں کے اندھیرے میں گھورنے لگا۔

اسی وقت اُسے جیپ کے دائیں طرف کے کھیتوں میں کسی کا سایہ لہراتا دکھائی دیا۔ وہ ایک دم چونک پڑا...... مگر...... اس سے پہلے کہ وہ رشید کو خبردار کر پاتا یا دو قدم سے زیادہ آگے بڑھ جاتا کوئی سرد سی سخت شے اس کی گدی سے آ لگی۔

''ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' ایک کرخت سرگوشی سن کر اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ سارا بدن اینٹھ کر رہ گیا اور آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' سرگوشی میں درشتی ابھر آئی۔ ساتھ ہی گردن پر سرد نوک کا دباؤ بڑھ گیا۔''

بے اختیار اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے' اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

''حرکت کی تو بھیجہ اڑا دوں گا۔ خاموش کھڑے رہو۔'' آواز میں سفاکی نے کروٹ لی۔ وہ

بے حس و حرکت کھڑا دیکھتا رہ گیا کہ کھیت سے برآمد ہونے والے سائے نے جیپ کے دروازے میں رسی ڈھونڈتے رشید کو کمر سے پکڑ کر باہر کھینچا اور اس کی گردن پر دو ایسے ہاتھ رسید کیے کہ وہ کر سڑک پر بے سدھ گر پڑا۔

اب وہ بے ہوش ہوا یا مر گیا۔ یہ انسپکٹر منیر کو معلوم نہیں تھا۔ وہ تو اپنے سینے میں دھڑ دھڑ کرتے دل کی آواز سن رہا تھا جو آنے والے لمحات کے بارے میں اندازے لگانے میں مصروف تھا۔

''میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔'' انسپکٹر منیر نے ہاتھ فضا میں بلند کیے کیے کہا۔

''میں نے پوچھا نہیں تو تم کیوں بتا رہے ہو؟ ہیں۔'' یہ کہہ کر پیچھے موجود آدمی نے اس کی گدی سے ریوالور یا رائفل جو بھی شے تھی' کی نوک ہٹا لی۔ پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر منیر کچھ سمجھ پاتا' اس کے سر کے عقبی حصے پر کسی سخت شے کا وار ہوا۔ درد کی شدت سے وہ چیخ پڑا۔ اسی وقت دوسری مرتبہ وار کیا گیا۔ وہ سر کو تھامے کٹے ہوئے شہتیر کی مانند سڑک پر گر پڑا۔ تیسرے وار کی ضرورت نہ تھی' وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جیپ کے قریب موجود سائے نے مدھم سی روشنی میں قدم آگے بڑھایا تو انسپکٹر منیر کے بے سدھ جسم کے پاس کھڑے شوکت نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔

جواب میں نعیم نے ہاتھ بلند کر کے او کے کا سگنل دیا۔

اسی وقت شوکت کی جیب میں پڑے موبائل نے اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔

اس نے موبائل نکال کر بٹن دبایا۔ تب تک نعیم قریب آ کر انسپکٹر منیر کا جائزہ لینے لگا۔

''یس......'' موبائل کان سے لگاتے ہوئے وہ الرٹ ہو کر بولا۔

''کام ہو گیا؟''

''جی رانا صاحب۔'' شوکت نے جواب دیا۔ ''دونوں سڑک پر پڑے ہیں۔''

''زندہ ہیں؟''

''صرف ایک......'' نعیم نے انسپکٹر منیر کا جائزہ مکمل کرتے ہوئے شوکت کو اشارے سے بتایا ''رشید اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''کون؟'' رانا سہیل نے بے تابی سے پوچھا۔

''انسپکٹر منیر......'' شوکت نے جواب دیا۔ ''رشید' نعیم کی ضرب سہہ نہیں سکا۔''

''خیر ہے۔ اس خنزیر کو زندہ رہنا چاہیے۔''

''میں نے صرف بے ہوش کرنے کے لیے وار کیا تھا سر...... نعیم سے بے احتیاطی ہو گئی۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس کتے کی لاش کو سڑک سے ہٹا دو۔ انسپکٹر منیر کو لے کر فارم پر چلے

جاؤ۔ میرے اگلے پیغام یا میری آمد کا وہیں انتظار کرنا۔"

"او کے سر۔"

"آل دی بیسٹ۔" رانا سہیل نے کنکشن آف کر دیا۔

موبائل آف کر کے شوکت نے جیب میں ڈالا۔ اتنی دیر میں نعیم، انسپکٹر منیر کی مشکیں کس چکا تھا۔ دونوں اسے گھسیٹ کر جیپ تک لائے اور پچھلی سیٹ پر اوندھا سیدھا ٹھونس دیا۔ صرف یہ خیال رکھا کہ اس کی سانس نہ رک جائے۔

نعیم نے شوکت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس کا کیا کریں؟" اس کا اشارہ رشید کی طرف تھا۔

"اسے گدھوں کی خوراک بننا ہے۔ پھینکو ادھر۔" شوکت نے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے مردار کتے کی طرح اسے ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر دو تین ہلارے دیئے اور کھیتوں میں دور لڑھکا دیا۔

"ذرا ہاتھ نرم رکھتے تو کیا حرج تھا؟" شوکت نے نعیم کی طرف دیکھا۔

"مجھے پتہ ہی نہیں چلا...... دوسرا ہاتھ پڑا تو علم ہوا کہ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" نعیم آہستہ سے بولا۔

"چلو...... بعد میں بھی اسے جان دینا ہی تھی۔ کون سا سنبھال کر میوزیم میں رکھنا تھا اسے۔ خس کم جہاں پاک۔"

"اب پہلے اس درخت کو ہٹا دیں۔" شوکت نے سڑک پر گری رسی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ ضروری ہے۔ یہ بھی شکر ہے کہ ابھی تک کوئی گاڑی نہیں آئی۔"

دونوں نے درخت کا رخ کیا۔ اس کی جڑوں میں دو تین جگہ رسی لپیٹ کر گرہ دی۔ دوسرا سرا جیپ کے بمپر سے باندھا۔ شوکت نے جیپ سٹارٹ کر کے پیچھے کو ریورس کی۔ درخت نے دھیرے دھیرے حرکت کی۔ حتیٰ کہ وہ سڑک کے ایک کنارے سیدھا ہو گیا۔ نعیم نے ہاتھ اٹھا کر شوکت کو جیپ روکنے کا اشارہ کیا۔ پھر آگے بڑھ کر رسی کھول لی۔ رسی کو سمیٹتا ہوا وہ پلٹا۔ سڑک پر گری رشید کی رائفل اٹھائی جس کی مدد سے شوکت نے انسپکٹر منیر کو "ہینڈز اپ" کیا تھا۔ اسی کا بٹ مار کر اس نے انسپکٹر منیر کو سڑک پر لمبا لٹایا بھی تھا۔

جیپ کے قریب آ کر نعیم نے رسی تو پچھلی سیٹ پر انسپکٹر منیر کے بے ہوش جسم پر پھینکی جس کا چہرہ سر سے بہہ آنے والے خون میں تر ہو رہا تھا۔ پھر رائفل کو سڑک پر دو تین مرتبہ زور سے مار کر ٹکڑے کیا۔ دونوں ٹکڑے کھیتوں میں دور پھینک دیئے اور پچھلا دروازہ بند کر کے شوکت کے ساتھ

اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔

شوکت نے جیپ سٹارٹ کی اور یوٹرن لے کر ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔



"لے بھئی ماسٹر...... تیرا ایک بڑا دشمن تو چوہے دان میں پھنس گیا۔" استاد نے بیرک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

شیراز اٹھ بیٹھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو استاد؟" اس نے استاد کے اپنے پاس بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

"انسپکٹر منیر کی۔"

"اوہ......" شیراز کی آنکھیں چمکیں۔ "تو کیا؟"

"ہاں...... تھوڑی دیر میں وہ رانا کے فارم پر پہنچا دیا جائے گا۔"

"یہ......" شیراز نے ہاتھ کا مکہ بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارا۔ "مگر یہ سب ہوا کیسے استاد؟"

"ہونا کیسے تھا؟" استاد ہنسا۔ "اطلاع ملی تھی کہ آج رات انسپکٹر منیر ساہیوال اپنے گھر جا رہا ہے۔ رانا نے شوکت اور نعیم کو اس کے راستے میں ایک ویران ترین جگہ پر پہنچایا۔ سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں ایک درخت نجانے کب سے گرا پڑا تھا۔ اُسے سڑک کے درمیان ڈالا اور ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر لوٹ آیا۔" استاد نے بتانا شروع کیا۔

پھر جب اس نے بات ختم کی تو شیراز نے پوچھا۔

"مگر استاد...... اگر اس دوران کوئی اور گاڑی پہلے وہاں پہنچ جاتی تو......"

"رسک تو لینا پڑتا ہے ماسٹر...... اگر ایسا ہوتا تو پھر کچھ اور سوچا جاتا۔ بہرحال...... رانا کا اندازہ اکثر بے حد درست ہوتا ہے۔ اس کو اطلاع ملی کہ انسپکٹر منیر دس بجے گاڑی سے نکلا ہے۔ تیز رفتاری کا خیال رکھتے ہوئے اس نے وقت کا حساب لگایا کہ انسپکٹر منیر جائے گھات پر کتنی دیر میں پہنچے گا۔ اس میں دس منٹ اوپر نیچے کے جمع کیے اور درخت سڑک پر عین اس وقت ڈلوایا جب انسپکٹر منیر کے وہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ باقی تھے۔ اب یہ قدرت کی مہربانی ہے کہ ان دس منٹوں میں وہاں سے اور کوئی گاڑی نہ گزری۔"

"ہاں...... یہ تو خاص اسی کی مہربانی ہے استاد۔" شیراز نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "ورنہ اتنی آسانیاں اتفاقات سے تو فراہم نہیں ہوتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو ماسٹر۔" استاد نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

"اب آگے کا کیا پروگرام ہے استاد؟" شیراز نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

"یہ میں تجھے ایک آدھ دن میں بتاؤں گا۔ حالات میں بڑی عجیب عجیب تبدیلیاں آ رہی ہیں' بڑی منصوبہ بندی کر کے چلنا پڑے گا۔"

"کیسی تبدیلیاں استاد؟" شیراز نے چونک کر پوچھا۔

"تو جب شمشاد کے پاس گیا تھا تو وہاں دو لڑکیاں موجود تھیں۔ یاد ہے!" استاد نے جواباً سوال کر دیا۔

"ہاں......" شیراز نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شاید نازو اور نینی نام تھے ان کے۔"

"بالکل وہی......" استاد نے تائید کی۔ "وہ دونوں لڑکیاں آج کل تیرے بھائیوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔"

"یعنی......" شیراز کا دل دھڑک اٹھا۔

"نازو کو تو حمید نے جاگیر سمجھ لیا ہے اور نینی کبھی نذیر اور کبھی ان کے کسی اور دوست کا دل بہلاتی ہے۔"

"اوہ......" شیراز کے ہونٹ سکڑ گئے۔

"حمید نازو کو گھر میں ڈال لینے کے چکر میں ہے مگر......"

"مگر کیا استاد؟"

"مگر یہ ماسٹر...... کہ وہ بازارِ حسن کا مال ہے۔ مال صرف مال کمانے کے لیے ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر منجمد ہونے کے لیے نہیں۔ نازو صرف حمید کو خالی کر رہی ہے۔ جس دن اسے حمید کی جیب ہلکی لگی اس کا میک اپ اتر جائے گا۔ تب حمید کو اس کی شکل زہر لگنے لگے گی۔ ڈر آنے لگے گا اسے نازو سے۔"

شیراز خاموشی سے سنتا رہا۔

"ایک خبر اور......"

شیراز نے جواب میں استاد کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"تیرے حصے کی زمین بک چکی۔ اس کے تین حصے ہوئے۔ دس لاکھ انسپکٹر منیر کے ہاتھ لگا۔ باقی تیس تیس لاکھ حمید اور نذیر نے بانٹ لئے۔ اب اسی روپے سے جوانیاں خریدی اور راتیں سجائی جا رہی ہیں۔"

"کب تک استاد...... کب تک؟" شیراز طنز سے مسکرایا۔ "سنا یہی ہے کہ طوائفیں کنویں خالی کر دیتی ہیں۔ یہ تو زمین کا روپیہ ہے۔ کتنے دن چلے گا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو ماسٹر۔" استاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہر طوائف شمشاد نہیں ہوتی۔"

"استاد......" ایک دم شیراز بھڑک اٹھا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کیا ہوا ماسٹر......" استاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"گالی دے رہے ہو اس تاج محل کو جس نے محبت میں انتظار کے موسم کو اپنی پہچان بنا لیا ہے۔"

"ماسٹر......" استاد اب بھی حیران تھا۔

"آئندہ کبھی اسے طوائف نہ کہنا استاد۔ مجھے لگا۔ تم نے مجھے ماں بہن کی گالی دے دی۔"

"ماسٹر......" ایک دم استاد کا لہجہ بدل گیا۔ وہ عجیب عقیدت پاش نظروں سے شیراز کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں استاد...... جس سے ملن کے لمحے کو تم پل پل گن کر سینچ رہے ہو۔ جس سے تم صرف اس لیے فون پر بات نہیں کرتے کہ اس کی آواز تمہیں زنداں توڑ کر اس کے پاس پہنچ جانے پر مجبور کر دے گی۔ جس نے تم جیسے شیر کی شیرنی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے استاد۔ اسے ایسے گھٹیا لفظ سے تو مت پکارو۔ اس لفظ کو نازو اور نینی کے لیے رہنے دو۔ میں جسے اپنی بھابی کے روپ میں دیکھتا ہوں تم اسے......"

"بس کر ماسٹر...... بس کر......" استاد نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"تو نے مجھ سے سارے بدلے لے لئے۔"

"کوئی بدلہ نہیں لیا استاد۔" شیراز نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "صرف رشتے کے اس تقدس کو اجاگر کیا ہے جو اس دن سے میرے نہاں خانہ دل میں دمک رہا ہے جس دن تم نے مجھ پر اپنا سینہ کھولا تھا۔"

"اتنے مشکل مشکل الفاظ نہ بول ماسٹر جو میری سمجھ ہی میں نہ آئیں۔" استاد نے مسکرا کر کہا اور شیراز نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم اچھے بھلے گیانی ہو استاد۔ میں تمہاری بغل میں جھانک کر دیکھ چکا ہوں بڑا صاف ستھرا اور دھلا دھلایا مال چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"ایسے ہی بنا مت ماسٹر۔" استاد خفیف سا ہو گیا۔ "اب چھوڑ اس ذکر کو...... ہاں...... میں تجھے بتا رہا تھا کہ ایک طرف تو تیرے بھائی عیاشیوں میں غرق ہیں اور دوسری طرف تیری بھابیاں کسی اللہ والے کے آستانے پر ماتھا ٹیکنے جانے لگی ہیں۔"

"وہ کون ہے؟ اور وہ کیوں جا رہی ہیں وہاں؟"

"کوئی بزرگ ہے جو تمہارے گاؤں کے قبرستان میں دھونی مارے بیٹھا ہے۔ چھوٹی نے تو اس سے اپنی گود ہری ہونے کی دعا کے لیے جھولی پھیلائی ہے اور بڑی اپنے میاں کو نازو کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے گڑگڑا رہی ہے۔"

"تعویذ گنڈوں سے اگر ایسے کام سیدھے ہونے لگیں تو دنیا میں کوئی مشکل' کوئی رنج' کوئی غم نہ رہے استاد...... بہرحال...... اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور اسی طرح اللہ والوں کی نظر بڑی دوررس ہوتی ہے۔ بندے کو اندر تک کھنگال ڈالتی ہے۔ کیا اس اللہ والے کو یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ کس قدر سنگدل اور بے مروت لوگ ہیں۔"

"اب یہ تو وہ اللہ والا ہی جانے ماسٹر۔" استاد نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں یہاں بیٹھ کر اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"جس دن انسپکٹر منیر سے ملنے چلیں گے' اس اللہ والے کے پاس بھی چکر لگا لیں گے استاد...... کیا خیال ہے؟ پتہ تو چلے وہ ہے کیا بلا......"

"ضرورت ہی نہیں پیارے۔" استاد نے لاپرواہی سے کہا۔ "پتہ لگانے کے لیے وہاں جانے کی کیا پڑی ہے۔ سب یہیں علم ہو جائے گا۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" شیراز نے اطمینان محسوس کیا۔



"شریفاں آئی تھی بابا؟" ثریا نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے سوال کیا۔

"ہاں...... آئی تھی!" بابا نے چادر کو بدن پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے دوسرا سوال داغا۔

"تو کیوں پوچھ رہی ہے بی بی؟" بابا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تو جس کام کے لیے آئی ہے وہ کر دوسرے کے بارے میں ٹوہ مت لگا۔"

"ٹوہ نہیں لگا رہی بابا۔" ثریا نے پوچھے چہچہاتے پرندوں کی آوازوں پر سے دھیان ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"بی بی......" بابا نے اسے نرمی سے دیکھا۔ "تو اکیلے میں مجھ سے مل کر کیا کہنا چاہتی تھی؟"

ثریا نے ایک طویل سانس لی اور گرم چادر کے اندر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ بابا سے کوئی بات اگلوا لینا مشکل ہے۔

"بابا...... ایک تو مجھے اپنے میاں چوہدری حمید کو اس طوائف نازو کے جال سے چھڑانا ہے۔"

"اور دوسرے......؟" بابا نے اس کے رک جانے پر کہا۔

"پہلے آپ اس بارے میں بتائیے۔ کچھ ہو سکتا ہے کیا؟"

"ہو جائے گا۔" بابا نے اپنی گدی کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی۔ اُسے کھولا۔ اس میں تھوڑی سی تھی۔ بابا نے آنکھیں بند کر کے زیرلب چند لمحوں تک کچھ دہرایا پھر چینی پر پھونک کر پڑیا دوبارہ دی۔ "یہ چینی سات جمعے تک اپنے میاں کو کسی میٹھی چیز میں کھلاتی رہ۔ آٹھویں جمعے کو وہ نازو ے نام سے بھی ناآشنا ہو جائے گا۔"

ثریا نے پڑیا لے کر چادر کے پلو میں باندھ لی۔

"اور کچھ......؟"

"ہاں بابا......" ثریا نے ان کی آنکھوں میں دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ "دوسرا کام اس سے زیادہ اہم ہے۔"

"خاوند کو ایک طوائف کے چنگل سے چھڑا کر دوبارہ اپنے بستر پر لے آنے سے بڑا کیا کام ہو ہے ایک بیوی کے لیے...... یہ آج تو بتا دے ہمیں۔" بابا کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"کام بڑا نازک اور رازداری کا ہے بابا۔" ثریا نے اس کے طنز کو نظرانداز کر دیا۔ "اور ہر پر مجھے یہ کام کرانا ہے۔"

"پہلے کام بول...... میں سنے بغیر ہاں نہیں کیا کرتا۔" بابا نے سرد لہجے میں کہا۔

"میرا ایک دیور ہے......"

"سن رہا ہوں۔" بابا نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"قتل کے جرم میں جیل کاٹ رہا ہے۔"

"بولتی رہ...... رک مت......" بابا کے لہجے میں تناؤ آ گیا۔

"میرے دونوں جوان بیٹوں کی موت کا ذمہ دار وہ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس کی ہائے لگی ہے مجھے۔ میرے گھر کو۔ میرے بیٹے مارے گئے۔ جوان شیر جیسے گبھرو تھے' ہرے اکرم اور آصف۔"

"تو نے کیا ظلم کیا اس پر کہ اس کی ہائے تیرے گھر کو سونا کر گئی؟"

"کوئی ظلم نہیں کیا۔" ثریا نے نظریں اٹھائیں۔ "میرے میاں اور دوسرے دیور نذیر کے ساتھ ں کا جھگڑا ہوا۔ وہ اپنا حصہ مانگتا تھا۔ ہم نے دے دیا۔ اس نے تلخی کی اور ایک پرانے ملازم کو مار الا۔ اسی قتل کے جرم میں اسے عمرقید ہو گئی۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ دھوکا کیا۔ فریب دیا ے۔ پھنسا دیا اسے۔ بددعائیں دی ہوں گی اس نے ہمیں کہ میرے جوان بیٹے قتل ہو گئے۔"

"پاگل سمجھتی ہے تو ہمیں۔" بابا نے اس کے خاموش ہونے پر دانت بھینچ کر کہا۔ "جب لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تو اس کی بد دعائیں تجھے کیسے لے ڈوبیں۔ بد دعا، مظلوم کی مقبول ہوتی ہے۔ ظالم یا ایسے شخص کی نہیں جو غلط فہمی میں بد دعائیں دے رہا ہو۔ اللہ کو سب کے دلوں کا حال معلوم ہے۔ پھر کیا اُسے تیرے دیور کے بارے میں علم نہ ہُوا کہ وہ غلط لوگوں کو بد دعا دے رہا ہے۔ اصل معاملہ بول بی بی۔ اللہ اور اس کے نظام سے مت کھیل۔ ہماری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کو سفارشی مت بنا۔ اندر کیا ہے وہ باہر لا...... ورنہ اٹھ اور چلی جا یہاں سے۔ ہمیں اپنے اللہ کو یاد کرنے دے۔"

"تو سچ کہہ کر کیا میں کچھ حاصل کر پاؤں گی؟" ثریا کھلنے لگی۔

"پہلے سچ بول۔ پانے نہ پانے کی بات بعد میں۔"

"تو سچ یہ ہے بابا...... میں چاہتی ہوں شیراز جیل میں مر جائے۔ وہ زندہ باہر نہ آئے۔ وہ کل کا مرتا آج موت کے منہ میں چلا جائے۔" نفرت نے ثریا کے چہرے پر آگ سی لگا دی۔

"کیوں مارنا چاہتی ہے تو اسے؟" بابا نے اسے بغور دیکھا۔

"نہ وہ اپنا حصہ مانگتا...... نہ میرا میاں اُسے پھنسا کر جیل بھجواتا۔ نہ اس کے حصے کی زمین کا روپیہ میرے میاں کے ہاتھ آتا اور نہ وہ طوائفوں کے دامن میں جا کر گرتا۔"

"اس سے پہلے کیا تیرا میاں سادھو سنت تھا؟"

"نہیں......" ثریا نے بابا کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ "مگر وہ ایک حد میں رہتا تھا۔ اب اس کے پاس عمر کے ادھیڑ پن میں لاکھوں آئے ہیں تو وہ بے قابو ہو کر عیاشی کے راستے پر اندھا دھند دوڑنے لگا ہے۔ اس ساری خرابی کا باعث شیراز ہے۔ اس کی ضد ہے۔ نہ وہ اپنی ضد پر اڑتا نہ ایسا ہوتا کہ میں مہینوں گھر میں اپنے بستر پر حمید کا انتظار کرتی رہتی ہوں اور وہ کبھی کبھار گھر میں صرف اس لیے آتا ہے کہ اسے مزید روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"دیکھ بی بی...... تیرے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ایک بے گناہ کو جسے تم لوگ پہلے ہی زنداں میں دھکیل چکے ہو زندگی کی قید سے رہا کر دیا جائے۔"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ ایسا ہی ہو بابا۔" ثریا کے لہجے میں ضد گونج رہی تھی۔ "میری نفرت کو اس کی لاش دیکھ کر ہی چین آئے گا۔"

"اور میں ایسا کوئی کام نہیں کیا کرتا...... جا...... اب تو چلی جا۔"

"بابا......" ثریا کے شانے پر سے چادر ڈھلک گئی۔ "میں اس کے لیے آپ کو منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

"روپیہ پیسہ میری طلب نہیں ہے بی بی!" بابا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"میں گاؤں کی چوہدرانی ہوں بابا......" ثریا نے بیباکی سے آنکھیں بابا کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ "اب بھی سو دو سو میں پُر کشش ہوں۔" اس کی چادر کا بند کھل گیا اور گورا چٹا بدن بول اٹھا۔ گردن سے نیچے ادھ کھلا سینہ اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ "میں آپ کو خوش کر دوں گی۔"

"تو خوش کر سکتی ہے' تو شے ہی ایسی ہے۔" بابا نے اس کے کسے ہوئے بدن کا جائزہ لے کر بڑے ضبط سے کہا۔ "مگر میں شیطان نہیں ہوں بی بی...... اپنا بدن ڈھانپ لے۔ ایسا نہ ہو میں شیطان کے ہاتھوں بک جاؤں۔"

"مان لیجیے بابا...... میں زندگی بھر غلامی کروں گی۔" ثریا لجاجت سے بولی۔

"خود کو سنبھال بی بی...... یہ کالے علم والوں کے دھندے ہیں۔ وہ پہلے جی بھر کر تجھ سے خوش ہوں گے پھر تیرے کام پر دھیان دیں گے اور کام ہو گا یا نہیں اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ میں اپنے اللہ کا ایک گنہ گار سا بندہ ہوں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ بھٹکنے میں مجھے ایک لمحہ نہیں لگے گا اور میرا مالک مجھ سے نگاہ پھیر لے گا۔ جا...... مجھے معاف کر دے...... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ جا چلی جا......" بابا نے اس کے سامنے واقعی ہاتھ جوڑ دیئے۔

ثریا کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے مایوسی کے عالم میں چادر سے بدن چھپا لیا۔

"کوئی صورت نہیں بابا کہ آپ میرا کام کر دیں۔" وہ یاسیت سے بولی۔

"نہیں بی بی...... کوئی صورت نہیں۔ زندگی اور موت میرے خالق کے تابع ہے۔ کیوں اس قسم کا ظلم کر کے اپنا اعمال نامہ سیاہ کرتی ہے۔ مرے گا تو وہ اپنی آئی ہوئی موت سے اور اُس کی موت کے لیے کوشش کرنے کا الزام تیرے حساب میں لکھا جائے گا۔ اللہ سے ڈر۔ اپنے کیے ہوئے پہلے ظلم ہی کی معافی مل جائے تو اسے اللہ کا کرم جان۔ جا اپنے دل میں اس کی یاد کا دیا روشن کر...... ان سفلی جذبات کے اندھیرے سے نکل آ...... جا بی بی جا...... اللہ تیرا بھلا کرے۔" بابا نے آنکھیں بند کر لیں۔

ثریا چند لمحے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر وہ اٹھی۔ چبوترے سے اتری اور خاموشی سے قبرستان سے باہر چل دی۔

"میرے اللہ...... میرے اللہ...... میرے اللہ۔" بابا کی بند آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں اور لرزتے ہونٹوں پر ایک ہی ورد تھا۔ "میرے اللہ...... میرے اللہ...... میرے اللہ۔"





انسپکٹر منیر کو اس کمرے میں قید ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اس کے سر کے زخم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ ناشتہ کھانا وقت پر مل جاتا تھا۔ اٹیچ باتھ روم میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ کمرے میں خوبصورت بیڈ ایک میز دو کرسیاں فرش پر قالین اور ہر وقت آن رہنے والا روم ہیٹر...... اسے سب سہولتیں میسر تھیں مگر اسے ابھی تک اپنے اغوا کر کے یہاں لانے کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

ناشتہ اور کھانا ایک ادھیڑ عمر ملازم لے کر آتا اور پچھلے برتن لے جاتا۔ پہلے دو وقت تو انسپکٹر منیر نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اس کے لیے اسے کسی نے مجبور بھی نہ کیا۔ بوڑھا آتا۔ پچھلے برتن غیر استعمال شدہ کھانے پینے کی اشیاء سمیت لے جاتا اور دوسرے برتن رکھ جاتا۔ اس نے بار بار اس بوڑھے سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ گونگا بہرا بنا اس کی کسی بات کا جواب دیتا نہ اپنی طرف سے کچھ کہتا۔ بھوک اور پیاس نے جب اسے زیادہ تنگ کیا تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔

کمرے کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگی تھیں۔ باہر کی طرف لوہے کی گرل اور ان پر دبیز پردے پڑے تھے۔ اس لیے اُسے دن رات کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ تو ناشتے اور کھانے کی فراہمی سے اندازہ لگا رہا تھا کہ آج اُسے پورے تین دن اور تین راتیں ہو چکی تھیں وہاں قید ہوئے۔

وہ اسے قید ہی سمجھتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ آوازیں دیں۔ شور مچایا بے تکے سوال کیے۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کوئی صدا کسی سوال کے جواب میں نہ ابھری۔ پہلی بار بوڑھا کھانا لے کر آیا تو اس نے اس سے بڑے سخت لہجے میں بات کی۔ وہ خاموشی سے میز پر کھانے کے برتن رکھ کر جانے لگا تو انسپکٹر منیر بھاگ کر کھلے دروازے کی طرف لپکا...... ابھی وہ دہلیز پر ہی تھا کہ باہر سے اچانک ایک کڑیل جوان سامنے آ گیا۔ ایک زور دار گھونسہ انسپکٹر منیر کی ناک پر پڑا۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتا ہوا بیڈ سے آ ٹکرایا۔

جب تک وہ ہوش سنبھالتا بوڑھا جا چکا تھا۔ سیاہ پینٹ شرٹ اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس

گھونسہ مارنے والا بھی ناپید اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔

اس کے اگلے دو دانت ہل گئے۔ خون تھوکتا وہ باتھ روم میں جا گھسا۔ پانی کی کلیاں کرتے تے وہ بے حال ہو گیا۔ اوپری ہونٹ اور ناک سوج کر پکوڑا بن گئے۔ دوبارہ اس نے ایسی حماقت دل ہی دل میں توبہ کر لی۔ وہ سمجھ گیا کہ جو لوگ اس کے پہرے پر ہیں ان کی آنکھیں کھلی اور ہاتھ نضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ ہر پابندی سے آزاد بھی ہیں۔ اس قید نیم تنہائی نے اسے ذہنی طور پر کر دیا۔ اگر اسے علم ہو جاتا کہ اُسے یہاں لانے والے کون ہیں؟ اس سے کیا چاہتے ہیں؟ تو س کے ذہنی تناؤ کا یہ عالم نہ ہوتا مگر وہاں تو اُسے بات کے جواب میں خاموشی اور حرکت کے گھونسے سے نوازا جا رہا تھا۔ اس نے ہوش میں آنے پر اپنی جیبیں چیک کیں۔ اطمینان ہو گیا کہ ایک روپیہ بھی غائب نہیں ہوا تھا۔ تین لاکھ روپے وہ ساتھ لے کر چلا تھا جو اس کی جیبوں میں تھے۔ ان تین لاکھ میں وہ ایک لاکھ بھی شامل تھا جو اس نے حمید سے نور عالم خاں نیازی کے نام مول کیا تھا۔

وہ ایک ظالم اور عیاش آدمی تھا۔

ظالم بظاہر بہادر دکھائی دیتا ہے جبکہ اندر سے وہ کسی ایسی عورت کی طرح ڈرا اور سہما ہوا ہوتا جو چوہے یا چھپکلی کو دیکھ کر چیختی چلاتی میز پر چڑھ جاتی ہے اور تب تک نہیں اترتی جب تک کوئی ہے یا چھپکلی کو مار کر اُسے سہارا دیتے ہوئے نیچے نہ اتار لے۔

ظالم کی بظاہر بہادری اس کی اس طاقت کی مرہون منت ہوتی ہے جو اکثر کسی ہتھیار اختیار ن تعداد اور حفاظت کے انتظامات پر مشتمل ہوتی ہے۔

انسپکٹر منیر کے جسم پر بھی پولیس کی وردی نے اسے دہشت کی علامت بنا دیا تھا۔ اس وردی کی ہی اُسے ڈنڈا پیر بنائے ہوئے تھی۔ آج جب وہ اس وردی میں ہوتے ہوئے بھی بے بس تھا تو اپنے اختیارات کی گمشدگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ اصل میں وردی کے ساتھ ملا ہوا وہ ا اختیار تھا جس نے اسے ظالم عیاش بے خوف اور دوسرے کو نچوڑ لینے کی حد تک بے حس بنا دیا

دو دن تو اس نے اپنی وردی میں گھسے ہوئے سوتے جاگتے گزار دیئے۔ تیسری رات کو سونے پہلے اس نے وارڈ روب کھولی۔ اس میں کتنے ہی جوڑے ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے سلیپنگ سوٹ نکالا اور نہا کر کپڑے بدل لیے۔

اب وہ بظاہر ایک خاموش اور آسودہ مگر مضطرب اور آنے والے وقت کے خوف سے ادھ ئے مہمان کی طرح کھاتا پیتا نہاتا اور سوتا ایک ایسا روبوٹ تھا جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کب اس کا

سوئچ آف کردیا جائے گا۔

چوتھا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ حسب معمول رات کو آٹھ بجے اسے کھانا دیا گیا۔

کھانا کھا کر وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بوڑھا برتن لینے آیا۔

برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکلتے ہوئے اس کے سر جیسے پٹاخہ چھوڑ گیا۔

"ابھی سونا مت...... کوئی تم سے ملنے آ رہا ہے۔"

اس نے چونک کر کمبل ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پھر جب تک اس کے لبوں سے کچھ نکلتا' بوڑھا دروازے سے نکل چکا تھا اور دروازہ...... آج کھلا ہی رہا۔ یا بوڑھا جان بوجھ کر کھلا چھوڑ گیا۔ اس ایک پل کے لیے سوچا کہ دروازے تک جائے۔ پھر اسے پہلے دن کا گھونسہ یاد آ گیا۔ وہ اپنا ارادہ ترک کر کے بیڈ کی پٹی پر ٹک گیا۔

تھوڑی دیر بعد کاریڈور میں ایک سے زیادہ لوگوں کے قدموں کی آہٹیں ابھریں۔ وہ آہٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں کھلے دروازے پر تھیں اور ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔

پھر......

ایک دم اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پھٹی پھٹی حیرت زدہ آنکھیں دروازے میں آ کر رکے آدمی پر جم کر رہ گئیں۔ بے یقینی نے پوری شدت سے اس پر حملہ کر دیا۔

"تم......" وہ سرسرایا۔

"یادداشت تمہاری بہت اچھی ہے انسپکٹر منیر۔" دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے شیراز نے بشاشت سے کہا۔ "ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔" اس کی طنزیہ نظروں میں تمسخر کا رنگ نمایاں تھا۔

"تم تو جیل میں تھے......" انسپکٹر منیر گھبرا کر بولا۔

"جیل میں تو میں بھی تھا انسپکٹر منیر۔" دروازے سے ایک اور آواز ابھری۔ انسپکٹر منیر نے چونک کر ادھر دیکھا۔

استاد رؤف اندر آ چکا تھا۔

"تم...... تم کون ہو؟" انسپکٹر منیر نے ہکلا کر پوچھا۔

"استاد رؤف......" تیسری آواز نے انسپکٹر منیر کی بالکل ہی ہوا سرکا دی۔ وہ رانا سہیل تھا جس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

"تم......؟" انسپکٹر منیر بے اختیار بیڈ پر گر پڑا۔ اس کی خوفزدہ نظروں کا محور وہ تینوں تھے جو کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہے ہوں۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ تم لوگ آپس میں ملے ہوئے ہو۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "مگر ہیل...... یہ ناجائز ہے۔ تم مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہو۔ ان کو جیل سے نکال کر تم نے بہت م کیا ہے۔"

"ہاہاہا......" رانا سہیل کے لبوں سے بے ساختہ قسم کا بلند بانگ قہقہہ نکلا۔ استاد اور شیراز ی اس کا ساتھ دیا۔

ان کے پُرشور قہقہوں سے گھبرا کر انسپکٹر منیر نے حرکت کی اور پسینہ پسینہ پیشانی الٹی آستین شک کرنے لگا۔ اس دوران وہ بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ان کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے نے لگا۔

"استاد......" رانا سہیل نے قہقہے کے اختتام پر طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھو...... قانون م کا سبق ہمیں پڑھا کون رہا ہے۔"

"یہ سب کچھ کر سکتا ہے رانا......" استاد نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ جب چاہے قانون توڑ سکتا جب چاہے کسی کو جھوٹے کیس میں پھنسا سکتا ہے۔ جیسے چاہے کسی کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ ا چاہے کسی کے لیے موت کا ہرکارہ بھیج سکتا ہے۔ اس کا نام انسپکٹر منیر ہے۔ یہ پیسے کے لیے کچھ ر سکتا ہے۔ کچھ بھی!"

"م...... میں...... میں......" انسپکٹر منیر نے کہنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

"کچھ مت کہو بچے......" استاد نے اسے پچکارا۔ "تمہارے کہنے کے دن گزر گئے۔ اب سنا کرو۔ دیکھا کرو اور رویا کرو۔"

"یہ تو تم نے جان ہی لیا ہے انسپکٹر منیر کہ تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔" رانا سہیل نے اسے ب کیا۔ "ایک بار کی کوشش کے بعد تم دوسری بار حرکت میں آئے تو استقبال گھونسے سے نہیں گولی یا جائے گا۔"

"تم لوگ مجھ سے چاہتے کیا ہو؟" انسپکٹر منیر نے ذرا سنبھل کر کہا۔

"اتنی جلدی...... اتنی جلدی کیا ہے انسپکٹر منیر...... ذرا چھری تلے دم لو۔ آخر کو تو تمہیں ذبح ہے۔ جتنی سانسیں لے سکتے ہو وہ تو آرام سے لو۔"

"یعنی تم مجھے مار ڈالو گے؟" وہ بے پناہ خوفزدہ ہو گیا۔

"ظاہر ہے...... اور کیا تمہارا اچار ڈالیں گے؟" یہ شیراز کی آواز تھی۔

''مجھ سے سودا کرلو...... مجھے چھوڑ دو۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تمہارا سارا روپیہ لوٹا دوں ا
اور...... اور...... حمید اور نذیر کو بھی مار ڈالوں گا۔ بس تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مت مارو۔''

''پاگل ہوئے ہو......'' شیراز نے ہاتھ دراز کر کے کہا۔ ''اگر ہم تمہیں یہاں لا سکتے ہیں ا
اُن دونوں کو مارنا کیا مشکل ہے جو نا چتے ہی تمہاری شہ پر ہیں۔ اب تو وہ بالکل بے آسرا اور
ہیں۔ تمہاری مدد کی کیا ضرورت ہے ان کو مارنے کے لیے۔''

''پھر بھی...... مجھ سے جتنی دولت چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے زندگی
دو۔ مجھے جان سے مت مارو۔''

''انسپکٹر منیر...... کتنی دولت ہے تمہارے پاس!'' اچانک استاد رؤف نے پوچھ لیا۔

''بہت ہے...... بہت...... تین لاکھ تو اب بھی میرے پاس ہیں...... تیس لاکھ کے قر
گھر میں ہے اور ساٹھ ستر لاکھ بینک میں میری بیوی کے نام پر پڑا ہے۔ دس کلے زمین اور دو گاڑیاں
ہیں۔ میں سب دینے کے لیے تیار ہوں۔''

اس نے جلدی جلدی سرہانے کے نیچے سے تین لاکھ کے نوٹ نکالے اور شیراز کی طرف بڑھا
دیئے۔

''اگر میں کہوں کہ یہ ساری دولت کم ہے تو پھر......'' شیراز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اور تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''ہاں...... میری دو جوان بیٹیاں
ہیں۔ ایک بہن بھی جوان ہے، تم جس کا رشتہ چاہو میں تم سے کرنے کو تیار ہوں۔''

''ایک عمر قید کے قیدی سے شادی کرو گے اپنی بیٹی اور بہن کی؟'' شیراز کے لہجے میں طنز ہی طنز
تھا۔

''تم مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارا کیس ری اوپن کراؤں گا۔ تمہیں رہائی دلواؤں گا۔ پھر تم آسانی
سے شادی کر سکتے ہو۔''

''سنا ہے...... تمہاری بیوی بڑی خوبصورت ہے انسپکٹر منیر؟'' رانا سہیل نے مونچھوں کو تاؤ
دیتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ایک دم چونک کر اس نے رانا کی طرف دیکھا۔ غصے کی ایک تیز لہر اس کی آنکھوں میں لہرائی
اور معدوم ہو گئی۔

''یہ...... تم زیادتی کر رہے ہو رانا۔'' اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔ ''وہ...... میری بیوی ہے۔''

''شریفاں نذیر کی بیوی نہیں ہے کیا؟'' اچانک شیراز نے دھاڑ کر کہا۔

''بے غیرت...... اس پر بُری نظر ڈالتے ہوئے تو تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ تمہارے دوست کی

عزت ہے۔''

''یہ...... یہ تم سے کس نے کہا؟'' حیرت اور خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ''کیا کرم داد
نے؟''

''کسی نے بھی کہا...... کیا یہ سچ نہیں ہے؟'' شیراز اسی لہجے میں بولا۔

''سچ ہے......'' وہ سر جھکا کر شکستہ لہجے میں بولا۔ ''مگر میں اس وقت نشے میں تھا۔ اچھے
برے کی تمیز کہاں رہتی ہے نشے میں۔''

''بہرحال انسپکٹر منیر...... مجھے تو تمہاری بیوی پسند ہے۔ اس کے بارے میں کچھ سوچو۔'' رانا
سہیل نے ایک بار پھر اسے نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔

''کوئی اور بات کرو رانا۔'' انسپکٹر منیر کا لہجہ بے حد کمزور تھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ ''میں تم
لوگوں کے قبضے میں ہوں۔ تم جو چاہے کہہ سکتے ہو مگر یہ بات منوا نہیں سکتے۔''

''تم سے منوانے کی کیا ضرورت ہے۔'' رانا سہیل نے تعجب سے کہا۔ ''یہاں سے میں اگر
سیدھا تمہارے گھر چلا جاؤں تو تم روک لو گے مجھے؟''

''نہیں...... ایسا نہیں کر سکتے تم۔'' وہ گھبرا کر آگے بڑھ آیا۔

''کون روکے گا مجھے؟'' رانا سہیل نے تمسخر سے کہا۔ ''تم...... جو خود باہر تو کیا جاؤ گے، اپنی
آواز بھی باہر نہیں پہنچا سکتے۔''

''رانا...... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' انسپکٹر منیر گڑگڑا کر بولا۔ ''میری دوسری بیٹی حاضر ہے۔
اس سے شادی کر لو مگر مجھے اس ذلت پر آمادہ ہونے کے لیے مت کہو۔ میری بیوی کا کیا
قصور...... تمہاری تو دشمنی بھی مجھ سے کوئی نہیں۔ پھر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''دوست کا دوست اپنا دوست اور دوست کا دشمن اپنا دشمن۔ یہ میری زندگی کا اصول ہے منیر
خان۔'' رانا نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''تم شیراز کے دشمن ہو تو میرے لیے زہریلے سانپ جیسے
ہو جسے مارنا ثواب کا کام ہے۔''

''شیراز......'' انسپکٹر منیر نے بڑی لجاجت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں مانتا ہوں کہ میں
نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ ظلم کیا...... مگر اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ مجھے
معاف کر دو میں اپنے جرم کی ہر قیمت چکانے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ہر مجرم کو اپنے جرم کی قیمت چکانی پڑتی ہے انسپکٹر منیر۔'' شیراز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''تم بھی چکاؤ گے مگر تمہاری سزا، تمہاری قیمت وقت طے کرے گا۔ میں ابھی تم سے کوئی سودا کرنے
کے لیے تیار نہیں ہوں اس لیے کہ سودا برابری کی سطح پر رہ کر کیا جاتا ہے اور تم اس وقت اس پوزیشن

میں نہیں ہو۔ آج قدرت نے مجھے وہ جگہ دی ہے جس کے بارے میں تم زندگی بھر سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر میں تمہیں کوئی بھی رعایت کیوں دوں؟ کیا تم نے میری فریاد کے جواب میں کبھی مجھ پر رحم کی ایک نظر بھی ڈالی تھی۔ قطعاً نہیں۔ تو پھر آج تم اس قدر باؤلے کیوں ہو رہے ہو کہ اپنی جان بچانے کے لیے بیٹیوں اور بہن کو پیش کر رہے ہو...... اور میں جانتا ہوں...... مجھے یقین ہے کہ اگر تم پر تھوڑا سا دباؤ اور ڈالا گیا تو تم اپنے ہاتھوں اپنی بیوی رانا سہیل کو پیش کرنے پر بھی تیار ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ تم ابن الوقت ہو۔ ظالم ہو۔ تمہیں صرف اپنی جان پیاری ہے۔ تمہیں صرف سوچنے کے لئے چند لمحے درکار ہیں، پھر تم ہاں کر دو گے یہ سوچ کر کہ اگر رانا سہیل کو خوش کر کے میری جان بچتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ کسے پتہ چلے گا کہ میری بیوی کے ساتھ کون کیا کر گیا۔ تم یقیناً اس کے لیے بھی ایسی پلاننگ کر لو گے انسپکٹر منیر کہ بیوی کی نظروں میں بھی بے گناہ اور لاعلم بنے رہو گے اور رانا سہیل کو ڈس لینے کے لیے من ہی من میں پیچ و تاب بھی کھاتے رہو گے۔ کیوں...... جھوٹ کہا کیا میں نے؟"

شیراز کے فقرے تھے کہ ہتھوڑے...... انسپکٹر منیر کی ذہنیت اپنے آپ میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ سچ کا زہر تھا کہ اس کو اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا اور وہ کسی لٹے ہوئے جواری کی طرح کھڑا رہ گیا۔

"ارے ہاں......" استاد رؤف جیسے کوئی بات کرتے ہوئے کہا...... "رانا...... انسپکٹر منیر کو یہ تو بتاؤ کہ کرم داد اور شفیق کا کیا حال ہوا؟"

"کیا ہوا ان دونوں کو؟" انسپکٹر منیر نے سر اٹھایا۔

"اللہ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے انسپکٹر منیر...... وہ شہر سے لوٹتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے۔ جس بس میں سوار تھے وہ ایک ٹرالر سے ٹکرا گئی۔ پولیس والے ہونے کے ناطے انہوں نے ضد کر کے اگلی سیٹوں پر جگہ لی ہوگی۔ ٹرالے پر سریا لدا ہوا تھا۔ ان کے جسم سریوں میں یوں پروئے ہوئے ملے جیسے موت نے ان کو آگ پر بھوننے سے پہلے سیخوں میں پرو دیا ہو۔"

"رشید بھی ان کے پاس پہنچ گیا انسپکٹر منیر۔" شیراز نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔ "اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ قدرت نے تمہیں بھی سزا پانے والوں کی لسٹ میں لکھ لیا ہے یا نہیں۔ بس ذرا انتظار کر لو۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔ اس خدا کو جی بھر کے یاد کر لو جس کو تم نے زندگی بھر بھلائے رکھا۔ کہتے ہیں کہ اللہ کو ایک بار یاد کرو تو وہ دس بار یاد کرتا ہے۔ تم بھی اللہ کو اتنی شدت سے یاد کرو کہ وہ تمہیں یاد کر لے۔" بڑی ذومعنی بات تھی جس نے شیراز کے لبوں سے ادا ہو کر انسپکٹر منیر کو لرزا کر رکھ دیا۔

"کوئی صورت نہیں......؟" اس نے مایوسی بھری نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا۔

"نہیں......" قطعی لہجے میں شیراز نے جواب دیا۔

"میری دونوں بچیاں شادی کے قابل ہیں۔ میں نے ان کو رخصت کرنا ہے۔" انسپکٹر منیر کے ہونٹ لرزے۔ "وہ تو معصوم ہیں۔"

"شہاب کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ معصوم بیوی تھی جسے تم نے پورے کنبے کی موت کی دھمکی دے کر بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی انسپکٹر منیر...... اور یہ بھی طے ہے کہ اگر وہ تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیتا تو تم اس کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے...... ہے ناں!"

"اس نے یہ بات تم لوگوں کو بتا دی؟" وہ رانا سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں......" اس نے جواب دیا۔ "اور اب وہ قطعی طور پر محفوظ ہے۔ تین چار ماہ میں رہا بھی ہو جائے گا۔"

اس کا سر جھک گیا۔ پے در پے حملوں نے اُسے بے دست و پا کر دیا تھا۔

"چلیں استاد......" رانا سہیل نے شیراز کے بعد استاد کی طرف دیکھا۔

"چلو......" استاد نے دروازے کا رخ کیا۔

"رانا......" انسپکٹر منیر نے شیراز کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے رانا سہیل کو آواز دی۔

وہ رک گیا۔ پلٹا نہیں۔

"میری طرف دیکھو رانا۔" وہ تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

رانا نے گردن گھما کر دیکھا۔ انسپکٹر منیر گھٹنوں کے بل قالین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور آنکھیں نم تھیں۔

"میری بیوی...... میری بیٹیاں...... میری بہن...... وہ سب معصوم ہیں۔ بے گناہ ہیں۔"

"اطمینان رکھو انسپکٹر منیر......" رانا نے اس کی طرف بڑی سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے غیرتی کے جس مقام پر تم ہو...... ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمہاری بیوی صرف تمہاری بیوی ہے مگر تمہاری بیٹیاں ہماری بیٹیاں اور تمہاری بہن ہماری بہن ہے۔"

وہ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ کاریڈور میں ان تینوں کے قدموں کی دور جاتی آہٹیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔

انسپکٹر منیر نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور فرش پر گرے ہزار ہزار کے سینکڑوں نوٹ اس کی آنکھوں میں دھندلاتے چلے گئے۔



"بھائی جی...... یہ انسپکٹر منیر کہاں غائب ہو گیا ہے' آج دس دن ہو گئے۔ اس کا کچھ اتہ پتہ ہی نہیں۔" نذیر نے فکرمند لہجے میں حمید سے کہا۔

"کیا کہہ سکتا ہوں یار۔" حمید بھی پریشان سا تھا۔ "وہ دو دن کے لیے گھر گیا تھا مگر آج تک کوئی خیر خبر ہی نہیں آئی اس کی۔"

وہ دونوں آج بہت دنوں بعد حویلی میں موجود تھے۔ ڈیرے پر پچھلے تین چار دنوں سے بے رونقی تھی۔ آج انہوں نے رات گھر پر ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ثریا اور شریفاں ان کے لیے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ دونوں بہت خوش تھیں۔

"محکمے والے تو اس کی تلاش میں اس لیے بھی ہیں کہ وہ رشید سنتری کو ساتھ لے کر گیا تھا' جس کی لاش راستے میں ایک جگہ کھیتوں میں پڑی ملی۔ خود منیر اور اس کی گاڑی کا کوئی پتہ نہیں۔ اگر رشید کو اسی نے قتل کیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اگر اس نے قتل نہیں کیا تو وہ خود کہاں ہے؟ محکمہ ابھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔"

"رشید کو قتل کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی بھائی جی۔" نذیر نے قیاس کے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ "وہ تو اس کے خاص آدمیوں میں تھا۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" حمید نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کے نہ ہونے سے خود کو بڑا ادھورا اور غیر محفوظ سا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

"نیا انسپکٹر بھی یار باش سا آدمی لگتا ہے۔ اس سے ملاقات کے لیے تو جانا چاہیے تھا ہمیں۔" نذیر نے کہا۔

"کون...... وہ طاہر گوندل۔" حمید نے منہ بنایا۔ "تم بھی اونٹوں میں بھیڑ پہچانتے ہو نذیر۔ کہاں انسپکٹر منیر جیسا بے جگر اور کہاں طاہر گوندل جیسا میسنا۔"

"آپ اسے پہلے سے جانتے ہیں بھائی جی؟" نذیر چونکا۔

"ہاں...... تین چار بار مل چکا ہوں اس سے شہر میں۔ انسپکٹر منیر لالچی تھا' مطلبی تھا' برا تھا' جو بھی تھا مگر میرا جگری یار تھا۔ اس نے پیسے کے لالچ ہی میں سہی مگر ہمارے لئے کیا نہیں کیا۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھائی مگر طاہر گوندل...... اس کا مجھے اعتبار نہیں' اس لیے اس سے پرہیز ہی رکھو۔ انسپکٹر منیر نجانے کس چکر میں پھنس گیا کہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح اڑن چھو ہو گیا مگر مجھے یقین ہے وہ ایک دن لوٹ آئے گا۔ اسے ہضم کرنا کسی حادثے کے بس کی بات نہیں۔"

نذیر محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"دیکھو ذرا...... کون ہے اس وقت...... رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔" حمید نے نذیر سے کہا' جو فون کے قریب تھا۔

"ہیلو......" نذیر نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ پھر دوسری طرف سے کسی کی آواز سن کر گھبرا گیا۔

"کون ہے؟" حمید نے فوراً پوچھا۔

"نازو......" نذیر نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ پھر ٹیلی فون ٹیپ کی تار صوفے کے پیچھے سے نکالتے ہوئے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو......" حمید نے آواز دبا کا ماؤتھ پیس میں کہا۔

"ہیلو چوہدری صاحب...... میں ہوں نازو۔" دوسری طرف سے اٹھلائی ہوئی آواز ابھری تو حمید کی حالت خراب ہو گئی۔

"نازو...... خیریت......" وہ ایک دم ہشاش بشاش ہو گیا۔ "اس وقت فون کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی۔"

"آپ نے تو دس بارہ دن سے یاد ہی نہیں کیا۔ میں نے سوچا خود ہی سلام عرض کر لوں۔" وہ شکوے کے انداز میں بولی۔

"بس کیا بتاؤں نازو۔ ایک پریشانی میں گھرا ہوا ہوں۔"

"یا اللہ خیر......" وہ ایک دم گھبرا گئی۔ "کیا ہوا نصیب دشمناں!"

"تم پریشان نہ ہو جانی۔" حمید کو اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ "بس ذرا انسپکٹر منیر کی طرف سے پریشان تھا۔"

"کیوں...... کیا ہوا اُس جن کو؟" نازو نے بیزاری سے پوچھا۔

"آج دس دن سے غائب ہے۔ پتہ ہی نہیں کہاں ہے۔"

"چلو...... اچھا ہی ہوا...... مجھے اس سے ویسے ہی نفرت ہے۔" نازو نے حقارت سے کہا۔

"نازو...... وہ ایسا برا آدمی بھی نہیں۔ یار ہے میرا۔" حمید نے دبی دبی آواز میں کہا اور مسکرا دیا۔

"اگر مجھے آپ سے چھین لینے کی بات نہ کرتا تو مجھے بھی اچھا لگتا مگر...... جس دن اس نے میرا ہاتھ تھام کر آپ سے کج بحثی کی تھی' مجھے اسی دن سے زہر لگتا ہے وہ۔"

"اچھا اچھا جانی...... چھوڑو اس کے ذکر کو...... تم کہو...... فون کیوں کیا تھا؟" حمید نے بات بدلی۔ اسے خطرہ تھا کہ ثریا یا شریفاں میں سے کوئی اندر نہ آ جائے۔

"کل میری سالگرہ ہے چوہدری صاحب۔"

"ارے واہ۔" وہ اس کے اٹھلانے پر قربان ہوگیا۔ "کل کس وقت کا پروگرام ہے۔"

"وہ تو آپ بتائیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سالگرہ آپ کے ڈیرے پر منانا چاہتی ہوں میں۔"

"ارے...... واہ واہ...... واہ واہ۔" حمید کے ہوش بے خود ہوگئے۔ "تو اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے! کتنے لوگوں کا انتظام کرنا ہوگا؟"

"میں اور نیلی آئیں گی۔ ساتھ وہی تین استاد ہوں گے جو ہمیشہ آتے ہیں ہمارے ساتھ اور آپ ہوں گے۔"

"بس......" حمید نے حیرت سے کہا۔ "یہ تو روٹین کا ہنگامہ ہوگیا نازو جان۔ سالگرہ تو نہ ہوئی۔"

"آپ کے ساتھ گزاری ہوئی ہر گھڑی سالگرہ ہے چوہدری صاحب۔ میں بھیڑ بھاڑ اکٹھی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ بھی پلیز انسپکٹر منیر جیسے خبیثوں کو مت بلائیے گا۔ یہ خالص نجی محفل ہے ہماری آپ کی۔"

"ٹھیک ہے جان ٹھیک ہے...... بس...... میں اور نذیر ہوں گے۔ باقی کھانے پینے میں کیا ہوگا؟"

"جانی واکر تو ہے ناں سٹاک میں۔" نازو نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"دو کریٹ پڑے ہیں ابھی۔"

"تو بس...... ایک کیک چاہیے...... ایک شمع اور باقی کا کھانا پینا آپ کی پسند کا۔"

"سب ہو جائے گا۔ بے فکر ہو جاؤ۔"

"تو کل کس وقت پہنچ جائے گا جمال ہمارے پاس۔"

"میں اُسے چار بجے روانہ کروں گا۔ ساڑھے پانچ تک تم لوگوں کے پاس پہنچ جائے گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اجازت۔"

"او کے جان۔" حمید نے ماؤتھ پیس کو بوسہ دیا اور کلک کی آواز سن کر ریسور فون پر ڈال دیا۔

"کیا معاملہ ہے؟" نذیر نے راز داری سے پوچھا۔

"کل نازو کی سالگرہ ہے۔ ڈیرے پر رات بھر کا جشن رہے گا۔ بس تم میں اور وہ دونوں ہوں گی۔" حمید نے بائیں آنکھ دبائی۔

"ٹھیک ہے۔" نذیر کی باچھیں کھل گئیں۔

اسی وقت شریفاں کمرے میں داخل ہوئی۔

"بھائی جی...... کھانا لگ گیا۔"

"چلو بھئی نذیر خان۔ آج گھر والیوں کو بھی خوش کر دیں۔" حمید مسکراتا ہوا اٹھا اور شرما کر ریفاں باہر نکل گئی۔

دونوں بھائی ہنستے ہوئے اٹھے اور آنے والی کل کے نشے میں جھومتے جھامتے کھانے کے مرے کی طرف چل پڑے۔



"میں کئی دن سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی!" شریفاں نے نذیر کے بالوں بھرے سینے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو کرو سوہنیو...... میں نے تمہارے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ چھوڑا ہے کیا؟" وہ مسکرا کر بولا اور ریفاں کی طرف رخ کر لیا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ دونوں کو چہلیں کرتے خاصی دیر ہوگئی تھی۔

"پہلے وعدہ کریں کہ آپ بُرا نہیں مانیں گے؟"

"بھئی بُرا ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گا۔" نذیر نے شریفاں کے گال پر چٹکی لی۔

"اوئی......" وہ تڑپ کر رہ گئی۔ "کیسی بُری عادتیں ہوتی جاتی ہیں آپ کی۔" اس کی نکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے ارے......" نذیر نے اس کا گال سہلایا۔ "زیادہ زور سے ہوگیا۔ معاف کرنا بھئی۔ ہی نہیں چلا۔"

"بس کیجئے...... آپ بہت ظالم ہیں۔" شریفاں نے نخرہ کیا۔

"اچھا بس...... اب نہیں...... بولو...... کیا کہہ رہی تھیں تم؟" نذیر نے اُسے منانے کے راز میں کہا۔

"میں آٹھ دس دن سے چاہتی تھی کہ آپ سے بات کروں مگر آپ رات کو گھر ہی نہیں آ رہے ھے۔"

"اب کہہ بھی ڈالو...... کیوں وقت ضائع کر رہی ہو۔" نذیر نے بے صبری سے کہا۔

"نذیر...... گھر میں بے رونقی آپ کو بھی اچھی تو نہ لگتی ہوگی۔" شریفاں نے ہلکی آواز سے ہا۔ "بچوں کے بغیر گھر' گھر تو نہیں ہوتا ناں!"

"ٹھیک کہتی ہو شریفاں۔" نذیر کا لہجہ کمزور پڑ گیا۔ "مگر اللہ کی مرضی میں کسے دخل ہے؟"

"ہم نے اتنے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کرایا۔ تعویذ گنڈے کرائے' دم جھاڑا کرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"ظاہر ہے...... جب تک اللہ کا حکم نہ ہو کوئی روحانی یا جسمانی علاج کیا کرے گا۔"

"میں چاہتی تھی جیسے میں نے اپنا معائنہ کرایا ہے...... آپ بھی ایک مرتبہ......"

"کیا؟" نذیر بدک اٹھا۔ "تمہارا مطلب ہے میں اپنا چیک اپ کراؤں۔"

"کیا حرج ہے اس میں؟" شریفاں نے جلدی سے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" وہ غصے میں آ گیا۔

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے۔ غصہ نہ کیجئے۔" شریفاں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"بکواس مت کرو۔" نذیر نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ "تم نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟"

"سوچنا پڑتی ہے۔" شریفاں کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کیا ضروری ہے کہ نقص مجھی میں ہو۔ کمی آپ میں بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"شریفاں۔" نذیر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں اب مار بیٹھوں گا۔" وہ لال بھبوکا ہو گیا۔

"جی بھر کر ماریئے۔ میں اف نہ کروں گی مگر...... میری بات دھیان سے' ٹھنڈے دل سے سن ضرور لیجئے۔ اگر میں غلط کہوں تو گردن اڑا دیجئے گا۔"

"میں نے سن لیا۔ تم نے کہہ لیا۔ اب مزید بک بک کی ضرورت نہیں۔" نذیر نے اُسے بری طرح جھاڑ دیا۔

"نذیر......" شریفاں بھی اٹھ گئی۔ "آپ مجھے جان سے مار دیجئے مگر میری پوری بات سن لیجئے پہلے۔"

"تم باز نہیں آؤ گی۔" نذیر نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں گھور کر کہا۔

"نہیں......" وہ نفی میں سر جھٹک کر بولی۔ "آپ کو سننا پڑے گا۔" اس کی آواز بلند ہو گئی۔

"آہستہ بولو......" نذیر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بھائی اور بھابی بھی جاگ نہ رہے ہوں۔"

"سننے دیجئے آج سب کو...... آپ نہ سنیں۔ کوئی اور تو سنے میری بات۔" وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر ضدی لہجے میں بولی۔

"اچھا بول...... بول میری دشمن...... کیا بکواس کرنا چاہتی ہے۔ مگر آہستہ بول...... آواز نیچی رکھ۔" نذیر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں نذیر۔" شریفاں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ہم نے اتنے علاج کرائے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا کئی بار معائنہ ہوا۔ پتہ چلا کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے۔ آج بھی اگر ہمیں اولاد کے نام پر کہیں دوا یا دعا کے لیے جانا پڑے تو آپ انکار نہ کریں گے۔ مگر ہو گا یہ کہ اگر کوئی دوا آئے گی تو اس کی کڑواہٹ سے میرا حلق تار تار ہو گا۔ اگر کوئی نقش پینا پڑے گا تو میں پیوں گی۔ اگر کوئی اور عمل کرنا پڑے گا تو میں اس کا تختہ مشق بنوں گی۔ میں اس کے لیے عمر بھر تیار ہوں مگر...... ایک بار اگر آپ اپنا معائنہ کرا لیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ یہ پتہ چل جائے گا کہ آپ صحت مند ہیں یا دوا کی ضرورت آپ کو ہے۔ اگر آپ صحت مند ہوئے تو میں ہر کڑواہٹ کا زہر حلق سے اتار لوں گی۔ اگر خدانخواستہ آپ میں کوئی کمی نکل آئی تو مل کر اس کے علاج میں جت جائیں گے۔ پھر اللہ کے گھر سے امید میں بھی ایک آس بندھ جائے گی لیکن اگر اسی طرح ہم اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے تو ایک پھانس دل میں چبھی رہے گی کہ شاید آپ ہی اس محرومی کا باعث تھے۔ میری بات کو طعنہ نہ سمجھئے نذیر۔ یہ سوچ کر میری درخواست مان لیجئے کہ اس گھر' اس جائداد' اس زمین کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اکرم اور آصف تھے تب بھی ہمارا دیا آگے جلنے کی امید نہیں تھی۔ اب تو وہ بھی نہیں رہے۔ کل کلاں کو اگر ہم دونوں چل بسے تو پیچھے نام لینے والا کوئی ہے کیا؟ اس بات پر غور کر کے مان جائیے۔" وہ بے اختیار رو پڑی۔

"شریفاں......" نذیر نے اس کو سینے سے لگا لیا۔ "تم نے سچ کہا۔ مت رو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے واقعی شریفاں۔ ہمارے بعد تو ہماری قبر پر دیا جلانے والا بھی کوئی نہیں ہے اور اگر واقعی مجھ میں نقص ہے تو کسی بھی علاج کا کیا فائدہ جب تک میں ٹھیک نہ ہو جاؤں۔ تم نے ٹھیک کہا۔ میں پہلی فرصت میں شہر جا کر اپنا چیک اپ کراؤں گا۔ میرا وعدہ ہے یہ تم سے۔"

"نذیر......" شریفاں اس سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔

"بس بس...... اب چپ ہو جا...... میری رات خراب نہ کر۔ چل...... خاموش ہو جا......"

نذیر نے اسے پچکارا اور ہاتھ بڑھا کر بیڈ سوئچ آف کر دیا۔





دروازہ کھلا تو انسپکٹر منیر سمجھا' بوڑھا ملازم رات کا کھانا لے کر آیا ہے۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نگاہ دروازے کی طرف اٹھائی۔ پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اندر آنے والا ملازم نہیں' شیراز تھا۔

"تم......" وہ خوف زدہ سا ہو گیا۔

"ڈرو مت......" شیراز نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "تم تو ہر آواز پر یوں خوفزدہ ہو جاتے ہو انسپکٹر منیر جیسے ہر آہٹ موت کی آہٹ ہو۔"

جواب میں انسپکٹر منیر شرمندہ شرمندہ سا واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے بہت راتوں سے سوئے نہیں۔" شیراز نے کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ گو۔۔ں رکھتے ہوئے اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر بڑھی ہوئی شیو اب داڑھی کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔

"ہاں......" اس نے مختصر جواب دیا اور دھنسی ہوئی آنکھوں سے فرش پر بچھے سرخ قالین کو گھورنے لگا۔

"کیوں؟" شیراز نے پوچھا۔ "یہاں کوئی تکلیف ہے کیا؟"

"نہیں......" وہ اب کی مرتبہ بھی ایک ہی لفظ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تمہارا محکمہ تمہیں بری طرح تلاش کر رہا ہے۔ انتظامیہ کا خیال ہے کہ رشید کو قتل کر کے تم غائب ہو گئے ہو۔"

چونک کر انسپکٹر منیر نے شیراز کی طرف دیکھا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ میرا غائب ہو جانا میرے خلاف سب سے بڑی شہادت ہے۔" وہ ایک سرد ...ر کر بولا۔

"پوچھو گے نہیں...... میں کیوں آیا ہوں۔" شیراز اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم خود ہی بتا دو گے۔ پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"عقلمندی کی باتیں کرنے لگے ہو۔" شیراز طنز سے بولا۔

انسپکٹر منیر نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

"میں تمہیں آزاد کر سکتا ہوں۔"

"کس شرط پر؟" اس نے شیراز کے فقرے کے جواب میں پوچھا اور نظریں اٹھائیں۔

"تمہیں حمید اور نذیر کو قتل کرنا ہو گا۔"

"کب......؟" انسپکٹر منیر نے کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر یوں پوچھا جیسے اُسے شیراز سے اسی ...ے کی توقع تھی۔

"آج ہی رات...... اب سے کچھ دیر بعد......"

"اور اس کے بعد......"

"تمہیں قید سے آزاد کر دیا جائے گا۔"

"آزاد ہو کر میں تم لوگوں سے کیا سلوک کر سکتا ہوں' اس کے بارے میں تمہیں کوئی خوف یا ...ہیں؟"

"رانا سہیل کے آدمی تمہارے گھر کے باہر موجود ہیں۔ جہاں تم نے گڑبڑ کی وہیں تمہارے گھر ...سٹ کر دیا جائے گا۔ اب بولو۔"

"میرے ہی نقشِ قدم پر چل نکلے ہو۔" وہ زندگی کی طرف لوٹتے ہوئے بولا۔

"کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ تمہارے نقش قدم پر نہیں چل رہا۔ تمہارا وار تمہی پر لوٹا رہا ہو۔" ...نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تو چلیں......؟" انسپکٹر منیر کے چہرے پر تازگی کی لہر ابھری۔

"تیار ہو ذہنی طور پر؟" شیراز نے پوچھا۔

"اپنے گھر' اپنے خاندان کی خاطر میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو چلو...... اٹھ جاؤ۔" شیراز نے کرسی چھوڑ دی۔ "مگر یاد رہے تمہاری ذرا سی بھی چالاکی ...ے کنبے کو لے ڈوبے گی اور اس کے بعد جو حشر تمہارا ہو گا وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کل تک تو تم خود یہ کام کرنے کو تیار تھے۔ آج کیا ہُوا کہ مجھے آگے کر دیا۔" انسپکٹر منیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں ذرا کہانی میں ٹوسٹ رہے۔ کل تک تم تینوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا آج اس سے بڑھ کر تم ان دونوں کے ساتھ کرو۔ دوست ہی دوست کو جہنم واصل کرے' اس سے زیادہ خوبصورت کلائمکس کیا ہوگا۔"

"ناول لکھا کرو۔ اچھے خاصے رائٹر لگتے ہو۔" انسپکٹر منیر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ایک دن تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔ فی الحال یہ ٹوپی سر پر اوڑھو۔" شیراز نے جیب سے پیراشوٹ کی باریک ٹوپی نکالی اور اس کے سر پر چڑھا دی۔ پھر کھینچ کر اس کی گردن تک چہرہ ڈھانپ دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" انسپکٹر منیر گھبرا گیا۔

"میرا ہاتھ تھامو اور خاموشی سے چلے آؤ۔ ٹوپی مت اتارنا۔ میں نہیں چاہتا تمہیں اس جگہ کی سُن گن ملے۔"

اس نے ٹوپی اتارنے کی کوشش ترک کر دی۔ شیراز نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمرے سے نکل گیا۔ انسپکٹر منیر اندھوں کی طرح سنبھل سنبھل کر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کاریڈور خالی تھا۔

باہر نکل کر اس نے پورچ میں کھڑی سیاہ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اُسے اندر بٹھایا۔ پھر خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شوکت ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔

"چلیں......؟" اس نے مختصراً پوچھا۔

"ہاں......" شیراز نے جواب دیا۔ پھر جیکٹ کی اندرونی جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔

شوکت نے یوٹرن لیا اور گاڑی عمارت کے مین گیٹ کی طرف بھاگتی چلی گئی جس کو کھولے دو رائفل بردار جوان الرٹ کھڑے تھے۔



نازو نے سالگرہ کا کیک کاٹا۔ نذیر اور حمید نے تالیاں پیٹیں۔ سازندوں نے طبلے بجا بجا کر آرکسٹرا کا کام دیا۔ حمید نے نازو کو سونے کا ہار اور نذیر نے نقد دس ہزار پیش کیا۔

پھر...... مجرا شروع ہو گیا۔

نازو اور نینی نے آج اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔ ایسے ایسے زاویوں سے بدن کی نمائش کی ۔حمید اور نذیر پاگل ہو گئے۔

شراب کے گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔ نازو اور نینی نے بھی بیچ بیچ میں چسکی لگائی' رات ے گیارہ بجے وہ تھک کر حمید اور نذیر کی آغوش میں گر پڑیں۔

"واہ جانی واہ۔" حمید نے نازو کی زلفوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "آج تو سرور آ گیا۔ تم نے اپنی لگرہ پر جو مستی اور بے خودی لٹائی ہے اس کے لیے تو میں آج تک ترستا ہی رہا۔"

"چوہدری صاحب...... یہ سب آپ ہی کے لیے ہے۔" اس نے حمید کا ہاتھ چوم لیا۔

اسی وقت جمال کھانے پینے کا سامان لے کر آ گیا۔ ان چاروں نے وہاں اور سازندوں نے معمول جمال کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا کر کھانا کھایا۔

"چوہدری صاحب...... ایک بات کہنا تھی۔" نازو نے کھانے کے بعد اس کے قریب بیٹھتے ے کہا۔

"بولو بولو جان...... پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" حمید اب بھی نشے میں مدہوش تھا۔

"استادوں کو واپس بھیجنا ہے۔"

"کیوں؟ صبح تمہارے ساتھ ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں...... وہاں بھی ایک فنکشن ہے آج۔ یہ نہ پہنچے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔" نازو نے رمندی سے کہا۔

"ارے فکر مند نہ ہوا کرو جانی۔ ہم تو نوکر ہی تمہارے ہیں۔" حمید نے لڑکھڑاتی زبان سے ا۔ پھر جمال کو آواز دی۔

"استادوں کو شہر چھوڑ آؤ ان کے ڈیرے پر' اور واپس اپنے گھر چلے جانا۔ نازو جان اور نینی صبح ئیں گی' ناشتے کے بعد۔ آٹھ بجے ناشتے کا سامان لے کر پہنچ جانا۔"

"جی چوہدری صاحب۔" جمال نے تابعداری سے سر جھکایا۔

"باہر دونوں ملازم ہوں گے۔ ان کو بھی چھٹی دے دو۔ گیٹ کو بند کر جانا۔"

"جی......" جمال نے جواب دیا۔

"لو بھئی استادانِ گرامی۔" حمید نے جیب سے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر نازو کے سر پر سے ے اور ان کی طرف اچھال دیئے۔ "یہ ہماری نازو جان کے سر کا صدقہ ہے۔ لے جاؤ۔"

سازندے بھوکے گدھوں کی طرح نوٹوں پر جھپٹے۔ پھر اپنے اپنے ساز سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمر تک جھک کر ان چاروں کو سلام کرتے ہوئے وہ جمال کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

"چلیں اپنے کمرے میں۔" حمید نے ان کے جانے کے بعد نازو کی طرف دیکھا۔

"ذرا رُکیں چوہدری صاحب......" نازو نے ایک ادا کے ساتھ اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "ایک ضروری فون آنے والا ہے۔"

"تو اندر موجود ہے ناں فون۔ وہیں سن لینا۔"

"نہیں......" نازو نے شرما کر کہا۔ "وہاں جا کر آپ کہاں سننے دیں گے فون شون۔"

"ہو ہو ہو......" حمید بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہاں تو بدن کو بدن سے باتیں کرنا ہوتی ہیں' فون کون سنے گا۔"

"تو ہمیں اجازت ہے؟" نذیر نے نینی کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھی پئے ہوئے تھا مگر حمید سے کم نشے میں تھا۔

"بڑے بے مروت ہیں آپ۔" نازو نے اُسے شکوے بھرے انداز میں دیکھا۔ "چند منٹ ہماری خاطر بیٹھ نہیں سکتے۔"

"لو بابا بیٹھ گئے۔ ناراض مت ہو۔" نذیر ہنستے ہوئے بولا اور نینی سے چہلیں کرنے لگا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔

"لو...... لگتا ہے تمہارا ہی فون ہے۔" حمید نے اٹھنا چاہا۔

"آپ بیٹھیے۔ میں دیکھتی ہوں۔" نازو جلدی سے اٹھ گئی۔

"دیکھنا...... کہیں حویلی سے ہی نہ ہو۔" حمید نے احتیاط کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کریں...... میں سنبھال لوں گی رانگ نمبر کہہ کر۔" وہ ہنستی ہوئی فون کے قریب پہنچ گئی۔

ریسور اٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ "ہیلو......"

"کیا پوزیشن ہے جانی۔" دوسری جانب شوکت تھا۔

"فسٹ کلاس۔"

"او کے...... ٹھیک دو منٹ بعد۔"

"او کے......" اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"ہو گئی بات...... کس کا فون تھا؟" حمید نے اس کی طرف مچپاتی آنکھوں سے دیکھا۔

"تھا ایک جاننے والا۔ آنا چاہتا تھا۔"

"یہاں؟" حمید نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں......" نازو اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"پھر...... تم نے کیا کہا؟"

"میں نے......" نازو نے اس سے چند قدم دور رک کر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے۔ "میں نے کہہ دیا...... آ جاؤ۔"

"کیا مطلب؟" حمید بری طرح چونکا۔ "کون ہے وہ جسے تم نے اچانک آنے کے لیے کہہ

"آپ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے چوہدری صاحب۔" نازو اٹھلا کر بولی۔

"ارے وہ کوئی لڑکی ہے کیا جو میں خوش ہو جاؤں گا۔" حمید کی زبان میں لکنت کم ہوتی جا رہی تھی۔

"لیجیے وہ آ گیا......" نازو نے کھلے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

حمید اور نذیر نے ایک ہی وقت میں دروازے کی طرف دیکھا اور دونوں اچھل پڑے۔ یوں لگا جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"تم......" وہ شراب کے نشے میں دھت ہونے کے باوجود سامنے کھڑے شیراز کو پہچاننے ں کوئی غلطی نہ کر رہے تھے۔

"پہچان لیا......؟" شیراز کے ہونٹوں سے طنز آلود آواز نکلی۔

نازو اور نینی دونوں الگ ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ اب ان کو صرف دیکھنا تھا۔ ان کا تم ہو گیا تھا۔

"تم تو اندر تھے!" حمید نے گھبرا کر کہا۔ "باہر کیسے آ ئے؟"

"یہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ تھا۔" نفرت سے شیراز کے ہونٹ کھنچ گئے۔ "جیسے بھی' باہر آیا آ یا۔"

"ارے نذیر...... پولیس کو فون کرو۔ یہ جیل توڑ کر آیا ہے۔ فون کرو پولیس کو۔" حمید نے جیسے مچا دیا۔

"پولیس کو فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارے جگری دوست کو ساتھ لے کر آیا

ہوں۔اس کی موجودگی میں پولیس کا کیا کام؟"

"کون...... کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے ذرا میں بھی تمہاری اس محفل کے رنگ ڈھنگ دیکھ لوں۔" شیراز نے نازو کی طرف دیکھا۔

"نازو...... دو گلاس تو تیار کرو۔"

نازو نے جواب میں کچھ کہے بغیر میز پر پڑی شراب کی بوتل اٹھائی اور دو گلاس پُر کر دیئے۔ پھر ان میں سوڈا ملانا چاہا مگر بوتل خالی تھی۔

"آں ہاں......" شیراز نے اسے روک دیا۔ "سوڈا میرے پاس ہے۔ گھبراؤ مت۔" شیراز نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے سوڈے کی بوتل نکال کر نازو کی طرف اچھال دی جسے اس نے ہوا میں لپک لیا۔

دونوں گلاسوں میں سوڈے کی پھوار ماری اور سوالیہ نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا۔ شیراز آگے بڑھا۔

اس کے دونوں ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں گلاس تھامے اور حمید اور نذیر کی طرف بڑھا۔

"وہیں رک جاؤ شیراز......" اچانک حمید نے ریوالور اس پر تان لیا۔ لگتا تھا جب وہ گلاس اٹھانے کے لیے بڑھا اس وقفے میں حمید نے ریوالور نکال لیا۔ "اگر ایک قدم اور آگے بڑھے تو میں گولی چلا دوں گا۔" اس نے کپکپاتے ہاتھوں میں ریوالور تھام کر اُسے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ نشے کی زیادتی نے اسے حواس باختہ کر رکھا تھا۔ اعصاب اس کے قابو ہی میں نہ تھے۔

"میں صرف آپ دونوں کو آپ کی من پسند شے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں غصے کی بات ہے؟" شیراز نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"بکو مت......" حمید نے ڈپٹ کر کہا۔ "میں اگر اس وقت تمہیں گولی مار دوں تو مجھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم جیل سے فرار ہو کر آئے ہو۔ مفرور مجرم کو اپنی حفاظت کے لیے مارنا جرم نہیں ہے۔ پولیس کو صفائی دینے میں مجھے دقت نہ ہو گی۔"

اُسی وقت کمرے میں خوشبو کا وہ جھونکا در آیا جس نے سارے کمرے کو پل بھر میں معطر کر دیا۔ شیراز نے آنکھیں بند کر کے جیسے اس مہک کو دل میں اُتار لیا۔ ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھولیں تو ان میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

ٹھیک اسی لمحے نذیر نے پیچھے سے شیراز پر حملہ کرنا چاہا۔ جونہی وہ صوفے سے اٹھا ہلکی سی مگر تیز سرسراہٹ کے ساتھ جیسے جھونکے نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ لڑکھڑایا اور میز سے ٹکرا کر فرش پر جھک گیا۔

شیراز نے ذرا سی گردن گھما کر نذیر کو فرش پر گرتے دیکھا۔ اسی وقت دروازے کی طرف سے کسی نے سائلنسر لگے ریوالور سے حمید پر فائر کیا۔ اس کے لبوں سے ایک زوردار کراہ نکلی اور ریوالور فضا میں اچھل گیا۔ نازو نے اُسے فرش پر گرنے سے پہلے دبوچ کر نذیر پر تان لیا۔

"چوہدری نذیر...... اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں ٹریگر دبا دوں گی۔" اس کے لہجے ایسی سفاکی تھی کہ نذیر ہکا بکا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر حمید کی نظروں کے تعاقب میں اس نے بھی دروازے کی طرف دیکھا جہاں شوکت ریوالور تانے کھڑا تھا۔

حمید زخمی ہاتھ کو بغل میں دبائے کراہے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کی شدت صاف ہویدا تھی۔

"ادھر آؤ۔" شیراز نے نذیر کو سر کے اشارے سے پاس بلایا۔

اس نے ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو نازو نے ریوالور کی نال سے اُسے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بادل نخواستہ اٹھا اور شیراز کی طرف بڑھ گیا۔

"پکڑو۔" شیراز نے ایک گلاس اُسے تھما دیا۔ اس نے چپ چاپ گلاس پکڑ لیا۔

دوسرا گلاس شیراز نے حمید کو پیش کیا۔

"پکڑو اسے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ حمید نے اُسے کچا کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور گلاس تھام لیا۔ پھر اس نے ریوالور بردار نازو کی جانب دیکھا۔

"نازو...... آخر طوائف ہی نکلیں ناں۔" وہ بڑے دکھ اور قہر سے غرایا۔

"جب ہوں ہی طوائف تو طوائف ہی رہوں گی چوہدری حمید۔ کیا میں نے کبھی خود کو چوہدرانی بتایا تھا؟" وہ لاپرواہی سے بولی۔

حمید جواب میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

"چلو...... اب ایک دوسرے کو اپنا اپنا شراب سے لبریز گلاس پیش کرو۔" شیراز نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر حکم دیا۔

ایک لمحے کے لئے دونوں بھائیوں کی آپس میں آنکھیں ملیں۔ پھر جونہی شیراز نے جیب سے ریوالور برآمد کیا۔ بے بسی ان کے چہروں پر رقصاں ہو گئی۔ خاموشی سے حمید اور نذیر نے آپس میں

گلاس بدل لیے۔

"اب پی جاؤ اسے......" شیراز نے اگلا حکم دیا۔

"نہیں......" دونوں نے بیک وقت گھبرا کر کہا۔ "ہم نہیں پئیں گے۔" حمید نے لرزتی آواز میں انکار کیا۔

"کیوں؟" شیراز نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے اس میں سوڈا ملایا ہے......" یہ نذیر کی آواز تھی۔

"تو......؟"

"اس میں زہر بھی ہو سکتا ہے۔"

"زہر......" شیراز نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "تمہیں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ سانپ بھی کبھی زہر سے مرتے ہیں۔"

"ہم نہیں پئیں گے۔" نذیر نے گلاس میز پر رکھنا چاہا۔

"خاموشی سے پی جاؤ۔" اچانک شیراز کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا۔ "ورنہ مجھے مجبوراً گولی چلانی پڑے گی۔ مجھ سے کسی قسم کے لحاظ کی توقع مت رکھنا۔"

اس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ وہ دونوں لرز کر رہ گئے۔

"چلو...... جلدی کرو۔" اس نے انہیں بڑی خوفناک نظروں سے گھور کر کہا اور ریوالور لہرایا۔

کانپتے ہاتھوں سے دونوں نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیے۔ پھر شیراز کے حکم کے بموجب وہ گلاس ان کے ہونٹوں سے تب الگ ہوئے جب خالی ہو گئے۔

دونوں نے خالی گلاس فرش پر لڑھکا دیے۔

"یہ ٹھیک ہے......" شیراز نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر اطمینان سے کہا۔

"اب دھیان سے میری بات سنو...... کیونکہ میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے۔ تم دونوں کے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح گھبرا گئے۔ حمید کو زخمی ہاتھ کی ٹیسیں چین نہ لینے دے رہی تھیں۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔

"مطلب بھی اپنے وقت پر سمجھ میں آ جائے گا۔" شیراز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں مختصر بیان کرتا ہوں۔" وہ ایک پل کو رکا...... پھر انہیں بڑی طنز آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے اپنے باپ کے ترکے سے جائز حصہ مانگا۔ تم نے مجھے موت کے منہ میں دھکیل

دیا۔ میں بچ گیا۔ عمر قید ہو گئی۔ ٹھیک؟"

وہ دونوں اسے خالی خالی نظروں سے گھورتے رہے۔

"بولو...... ٹھیک؟" شیراز نے گرج کر کہا۔

"ہاں...... ہاں ہاں......" دونوں گڑبڑا کر رہ گئے۔

"جہاں میں تم سے گواہی چاہوں، ہاں ہاں کرتے رہو، اگر اب رکے تو میرا ریوالور تم سے باتیں کرنے لگے گا۔ سمجھے۔"

وہ صرف سر ہلا کے رہ گئے۔

اسی وقت وہ خوشبو کا جھونکا شیراز کے چہرے کو چھو کر جیسے دروازے کی طرف نکل گیا، جہاں شوکت دروازے کے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا اور کسی بھی مشکل لمحے کے لیے ریوالور اس کے ہاتھ میں ناچ رہا تھا۔

"زنداں میں بھی تم لوگوں کو میرا سانس لینا اچھا نہ لگا۔ تم نے سوچا۔ کل کلاں کو باہر آ کر میں تمہیں انتقام کا نشانہ بناؤں گا اس لیے تم نے مجھے جیل میں زہر دینے کی کوشش کی...... بولو درست ہے؟"

خوفزدہ انداز میں حمید اور نذیر سر ہلا کر رہ گئے۔ ان کے حلق خشک تھے، جنہیں وہ تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا نشہ ہرن ہو رہا تھا۔

"تب میں نے سوچا...... اب مجھ پر فرض ہے کہ میں تمہارے اگلے وار سے پہلے حرکت میں آ جاؤں اور...... میں نے اکرم اور آصف کو اڑا دیا۔"

"کیا؟" حمید کے لبوں سے چیخ سی نکلی۔ "میرے بیٹوں کو تم نے مارا۔ تم نے قتل کیا تھا؟"

"ہاں......" بڑے اطمینان سے شیراز نے جواب دیا۔

"تم...... درندے...... تمہیں میرے معصوم بیٹوں پر ذرا رحم نہ آیا۔" وہ بچوں کی طرح بلک پڑا۔

"ایک تم معصوم...... ایک یہ......" شیراز نے نذیر کی طرف اشارہ کیا۔ "دو معصوم تمہارے بیٹے...... پانچواں معصوم انسپکٹر منیر...... تم سب نے مل کر مجھے جان سے مارنے کی ہر کوشش کر ڈالی اور درندہ میں...... کیا بات ہے؟" شیراز نے طنز کے تیروں سے حمید کا سینہ چھلنی کر دیا۔ "اور اگر میں مارا جاتا تمہارے ہاتھوں تو تم سب تو معصوم ہی رہتے۔ ہے ناں!"

"اف...... میرے اکرم اور آصف کو تم نے قتل کر دیا۔ ہائے...... میرے بیٹے!" حمید نے نا

کرنے کے انداز میں بولا۔ ''ثریا کو پتہ چلے گا تو وہ جیتے جی مر جائے گی۔''

''نہیں مرے گی۔'' شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اتنی آسانی سے مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی...... آگے سنو......'' اس نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''پھر میں نے انسپکٹر منیر کو اغوا کیا۔''

''ارے......'' وہ حقیقتاً اچھل پڑے۔ ''منیر تمہارے قبضے میں ہے؟''

''ہاں...... وہ میرے ساتھ آیا ہے!''

''کہاں...... کہاں ہے وہ؟ وہ تو تمہیں کچا چبا جائے گا۔ بلاؤ اُسے۔ کہاں ہے وہ؟''

''اسے اندر لے آؤ شوکت!'' شیراز نے آواز دی اور شوکت دروازے سے ہٹ گیا۔ حمید اور نذیر بڑی بے تابی سے کھلے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دروازے میں انسپکٹر منیر نمودار ہُوا۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ انسپکٹر منیر نہیں' ایک مریض لگ رہا تھا۔

''انسپکٹر منیر...... کیا ہوا تمہیں؟'' حمید نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''دیکھو...... یہ خبیث ہمیں کس طرح تنگ کر رہا ہے۔''

انسپکٹر منیر ان سے چند فٹ دور آ کر رک گیا اور سپاٹ نظروں سے دونوں کو گھورنے لگا۔

''اب آخری چند باتیں۔'' شیراز نے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر منیر سے میرا سودا ہو چکا ہے۔ ابھی یہ تم دونوں کو گولی مار دے گا۔''

''کیا؟'' وہ دونوں بے یقینی سے بولے۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی ہوگا۔ حالانکہ اس کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نذیر نے پوچھا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔

''مطلب یہ کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو جو شراب پلائی ہے اس میں وہی زہر ملا ہوا تھا' جو تم نے جیل میں مجھے بھیجا تھا۔ سوڈا زہریلا تھا۔''

''نہیں......'' وہ خوف کے عالم میں چیخ اٹھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے چہروں کا رنگ سرسوں جیسا پیلا ہو گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ زہر تو......''

''بہت تیز تھا۔'' شیراز نے ان کی بات پوری کر دی۔ پھر طنز سے اس کے ہونٹ پھیل گئے۔

''میں نے اسے بہت ہلکا کر لیا ہے۔ کم از کم دس منٹ بعد وہ تمہارا کلیجہ کاٹنا شروع کرے گا۔''

''اوغ...... او...... اوغ......'' اچانک نذیر سینہ پکڑے دوہرا ہو گیا۔

''کیا ہوا...... نذیر......'' حمید نے زخمی ہونے کے باوجود اس کی طرف جھکتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''انسپکٹر منیر......'' شیراز ان کو آپس میں لپٹتے دیکھ کر خاموش کھڑے انسپکٹر منیر کی طرف متوجہ ہا۔ ''سنبھالو...... پورا چیمبر ان دونوں پر خالی کر دو۔'' اس نے ریوالور اس کی طرف پھینکا اور خود دی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

انسپکٹر منیر نے ریوالور لپک لیا۔ میگزین چیک کیا۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک ہی صوفے پر خوف سکڑے سمٹے پڑے حمید اور نذیر کی طرف سیدھا کر لیا۔

''نہیں...... نہیں یار...... ہم دوست ہیں۔'' حمید گڑگڑایا۔ موت کا خوف اس پر پاگل پن کی رح سوار ہو گیا۔

انسپکٹر منیر نے خالی خالی نگاہوں سے ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ پھر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہراز کی جانب نظر اٹھائی جو ہونٹ بھینچے اس کے اگلے اقدام کا منتظر تھا۔ دونوں ایک لمحے کو ایک ہرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر انسپکٹر منیر نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اس کی آنکھوں میں ہرانی بڑھ سی گئی۔ جن سے وہ ایک ٹک حمید اور نذیر کو گھور رہا تھا۔

اسی وقت شیراز نے دروازے میں کھڑے شوکت کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا سائیلنسر لگا یوالور اس کی طرف اچھالا۔ شیراز نے اُسے کیچ کر لیا۔ شوکت اس کا اشارہ پاتے ہی دروازے سے ٹ گیا۔ ایک لمحے بعد اس کی پرچھائیں کمرے کی کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ پر لہرائی۔

شیراز نے ریوالور کی نال میں پھونک ماری۔

''انسپکٹر منیر......'' اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس سے پہلے کہ یہ خون اگلے تمہارے یوالور کو حق دوستی ادا کر دینا چاہیے۔''

اور...... انسپکٹر منیر کی انگلی کا دباؤ ریوالور کے ٹریگر پر بڑھتا چلا گیا۔

حمید اور نذیر کے سینوں اور پیشانیوں میں یکے بعد دیگرے دھماکے دار سوراخ ہوتے چلے گئے۔

پھر جب انسپکٹر منیر نے آخری فائر کیا...... تو حمید اور نذیر دم توڑ چکے تھے...... ان کی ادھ کھلی نکھوں میں موت کے خوف سے زیادہ حیرت کا تاثر تھا۔ انہیں مر کر بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ ان کا وست ان کے لیے موت کا ہرکارہ ثابت ہوا ہے۔

خالی ریوالور والا ہاتھ انسپکٹر منیر کے پہلو میں لٹک گیا۔ وہ خاموش کھڑا حمید اور نذیر کی لہولہان اشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

شیراز نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ انسپکٹر منیر کو خبر نہ

ہوئی کہ شیراز نے ریوالور ایک پولی تھین کے لفافے میں ڈال کر اس کا منہ بند کیا اور جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔

اسی وقت کمرے کی کھڑکی سے شوکت کا سایہ ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے کے دروازے پر دکھائی دیا۔

انگوٹھا کھڑا کر کے اس نے شیراز کو ''او کے'' کا اشارہ دیا۔ شیراز نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھا۔

''انسپکٹر منیر...... آؤ چلیں۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اب کہاں؟'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ یوں لگا جیسے وہ ایک دم ہوش میں آ گیا ہو۔

''باہر تمہاری جیپ آ چکی ہے۔ تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تم آزاد ہو۔''

انسپکٹر منیر چند لمحے اسے بے یقینی کے عالم میں دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''سب کو اپنے آئینے میں مت دیکھا کرو انسپکٹر منیر۔ ہم میں سے نہ کوئی تمہارا پیچھا کرے گا نہ تمہارے گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ تم یہاں سے روانہ ہو گے تو تمہارے گھر سے پہرہ اٹھا لیا جائے گا۔ اگر تمہیں مارنا ہی ہوتا تو اس سے اچھا موقع اور کون سا تھا مگر میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں آزاد کرتا ہوں۔''

''تم ایک اچھے دشمن ہو شیراز۔'' انسپکٹر منیر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں پہچان نہ سکا۔ شاید تم دوست اس سے بھی اچھے ثابت ہوتے۔''

''کوئی افسوس نہ کرو انسپکٹر منیر۔'' شیراز نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''مکافات عمل کا انتظار کرو۔ اس کی بے آواز لاٹھی سے کوئی مجرم نہیں بچ سکتا۔ یہ میرا ایمان ہے۔''

انسپکٹر منیر نے شیراز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔

''نازو...... تم بھی نینی کو لے کر آ جاؤ' گلاسوں پر تمہاری انگلیوں کے نشان ہوں گے انہیں بوتلوں سمیت ضائع کر دو۔'' شیراز نے چلتے چلتے کہا اور انسپکٹر منیر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ نازو اور نینی نے جلدی جلدی ان چیزوں کو توڑ پھوڑ کر ضائع کیا' جن پر ان کی انگلیوں کے نشان ہو سکتے تھے۔ پھر دونوں باہر کو لپکیں۔

شیراز انسپکٹر منیر کو لے کر اس کی جیپ کے پاس پہنچا تو اگلا دروازہ کھول کر استاد باہر نکلا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' اس نے شیراز کی طرف دیکھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' شیراز نے جواب دیا۔ ''انسپکٹر منیر کو رخصت کر دیا جائے؟''

''ہاں......'' استاد نے قمیض کی سائڈ پاکٹ سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور انسپکٹر منیر کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''یہ تمہارے تین لاکھ روپے ہیں جو تم کمرے میں بھول آئے تھے۔'' استاد نے روپے اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔ پیچھے مڑ کر بے شک مت دیکھنا۔ ہماری طرف سے پشت پر وار نہیں ہوگا۔ آنے والا وقت تم پر کیا وزن ڈالنے والا ہے اس کے بارے میں کون جانے۔''

انسپکٹر منیر کو اس کی جیپ کے پاس چھوڑ کر شیراز' استاد اور شوکت اپنی کار کی طرف بڑھ گئے جو سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے اندھیرے ہی کا حصہ لگ رہی تھی۔

انسپکٹر منیر نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور جیپ میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی جیپ نے کھلے ہوئے مین گیٹ کو کراس کیا تو شیراز اور استاد نے شوکت کی طرف دیکھا۔

''گاڑی میں بیٹھو...... یہاں زیادہ دیر رکنا خطرناک ہوگا۔'' استاد نے کہا۔

نازو' نینی اور استاد پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ شوکت نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شیراز اس کے ساتھ آ بیٹھا۔

''قبرستان کی طرف چلو۔'' استاد نے گاڑی مین گیٹ سے باہر آنے پر شوکت سے کہا۔

شوکت نے جواب دیئے بغیر گاڑی کو بائیں طرف موڑ لیا۔ خاصا کھلا سڑک نما راستہ تھا۔ گاڑی کچے پر بھی آسانی سے دوڑ رہی تھی۔

''اس وقت قبرستان میں کیا کام ہے استاد؟'' شیراز نے رخ پھیرے بغیر پوچھا۔

''اس اللہ والے سے بھی مل لیں یار...... جو اس دن تمہارے لئے الجھن بن گیا تھا۔''

شیراز کچھ جواب دیتے دیتے خاموش ہو گیا۔ گاڑی قبرستان کے پاس پہنچ چکی تھی۔



گھاس پھونس اور پتیوں کے چرمرانے کی آوازیں سن کر چبوترے پر براجمان بابا نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔

رات ابھی کافی باقی تھی۔ چراغ کی لو مدھم ہو چکی تھی۔ تاہم اتنی روشنی ضرور دے رہا تھا کہ بابا نے اپنی طرف آتے لوگوں کو صاف دیکھ لیا۔ وہ ایک دم چونک پڑا۔ ان کے ہلتے لبوں کی حرکت رک گئی۔

سب سے آگے استاد اس کے ساتھ شیراز' پیچھے شوکت اور آخر میں خوفزدہ نظروں سے قبروں کو دیکھ کر لرزتی کانپتی آتی نازو اور نینی تھیں۔

بابا جی چبوترے پر کھڑے ہو گئے۔ وہ لوگ اب چبوترے کے بالکل قریب آ کر رک گئے تھے۔

استاد بابا کے سامنے کھڑا اُن کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے میں گڑی ہوئی تھیں۔ شیراز اور شوکت کے ساتھ ساتھ نازو اور نینی بھی بابا کو گھور رہی تھیں۔

پھر...... اچانک شیراز کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے۔

''کیوں بابا...... سب ٹھیک ہے ناں؟'' اچانک استاد کی ٹھہری ہوئی آواز گونجی۔

''سب ٹھیک ہے...... استاد......'' بابا کے لبوں سے نکلا۔ پھر اُن کا جسم گھٹنوں پر جھکا اور حیرت زدہ شیراز نے دیکھا کہ ظہور استاد کے چوڑے چکلے سینے میں کسی بچے کی طرح سما گیا۔

''بڑا مکمل بابا لگ رہا ہے ظالم۔'' استاد نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا اور ہنس دیا۔

''استاد......'' ظہور اس کے سینے سے لگا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''امتیاز کہاں ہے؟'' ذرا دیر بعد استاد نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہاں...... وہ وہیں رہتا ہے رات دن۔'' ظہور نے کچھ دور مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''بلاؤں!''

''بُلا......'' استاد نے اجازت دے دی۔

''حق ہُو...... حق ہُو...... حق ہُو......'' ظہور نے چبوترے پر آلتی پالتی مار کر تین بار نعرہ لگایا۔

اس کی آواز میں نجانے کیا تھا کہ استاد تڑپ گیا۔

''ظہور......'' اس نے ایک دم ظہور کے شانے تھام لیے۔

''استاد'' ظہور نے آنکھیں کھولیں جن میں نمی ابل پڑی تھی۔

''یہ آواز...... یہ آواز تیری تھی ظہورے!'' استاد نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''کبھی کبھی تو مجھے بھی اپنی نہیں لگتی استاد'' وہ لرزتے لبوں سے بولا اور اس کی آنکھوں کے سوتے پھوٹ بہے۔

''پھر کہہ...... ظہور...... پھر آواز دے......''

''استاد......'' ظہور کی آواز بھرا گئی۔

''آواز دے ظہور...... آواز دے......'' استاد بے کل ہو رہا تھا۔ سب لوگ اس صورت حال کو عجیب عجیب جذبوں سے تول رہے تھے۔

''حق...... ہُو......'' ظہور کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''حق ہُو......'' اس نے دوسری مرتبہ کوشش کی۔ ''حق...... ہُو......'' تیسری بار آواز اس کے حلق میں ٹوٹ گئی۔ وہ چیختا ہوا استاد کی بانہوں میں ڈھیر ہو گیا۔

''ظہورے......'' استاد نے اُسے یوں پکارا جیسے وہ اس سے بہت دور ہو۔ پھر اسے بانہوں میں لے کر دیوانہ وار اس کا سر منہ چومنے لگا۔

''ارے...... تو کہاں پہنچ گیا ظہور...... تُو تو میری بساط سے باہر نکل گیا رے...... ارے ظالم...... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا...... مجھے اکیلا چھوڑ گیا۔''

''حق...... ہُو...... حق...... ہُو۔'' ظہور کے لبوں سے مسلسل یہی الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

پھر...... اس کا لرزتا ہوا بدن استاد کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے مگر آواز سرگوشی سے بھی ہلکی تھی۔

''سلام استاد۔'' امتیاز کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ ایک ملنگ کے روپ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

''امتیاز...... یہ...... یہ دیکھ ظہور کو کیا ہو گیا رے۔'' استاد نے بھیگی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے استاد...... اسے ''حق ہُو'' کی چھت میسر آ گئی ہے۔'' امتیاز نے بڑی گھمبیر آواز میں کہا۔

''مگر...... مگر امتیاز......''

''جس دن تم نے ہمیں اس گاؤں میں آ کر چوہدریوں پر نظر رکھنے کو کہا تھا استاد...... اسی دن ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہمیں کس روپ میں یہاں آ کر رہنا ہے۔ تم شاید بھول گئے استاد۔ ظہور کسی

زمانے میں بہروپ بھر رہا ہے۔ اس نے تمہیں بتایا تھا' تمہیں یاد نہیں رہا۔ اس نے ایک بابے کا روپ دھارا اور مجھے مزار پر بٹھا دیا۔ یہاں وہ لوگوں کو دم درود کرنے لگا جو خبر ملتی "حق...... ہو" کا نعرہ لگا کر مجھے طلب کرتا اور آ گاہ کر دیا۔ میں موبائل پر تمہیں آ گاہ کر دیتا۔ مگر پہلے دس دن بعد ہی اس کی حالت بدل گئی۔ نہ بھوک نہ پیاس۔ نہ سردی نہ گرمی۔ اسے کسی بات کا احساس ہی نہ رہ گیا۔ بس دن رات "حق...... ہو" میں گم رہنے لگا۔ پھر یوں ہوا استاد کہ لوگوں کو اس کے ہاتھ سے شفا ہونے لگی۔ یہ جو کہہ دیتا ہے' اللہ اسے پورا کر دیتا ہے۔ بس...... اب یہ ہے اور "حق ہُو" کے نعرے ہیں۔"

امتیاز خاموش ہو گیا۔

سب لوگ حیرت سے کبھی امتیاز اور کبھی ظہور کو دیکھ رہے تھے۔ شیراز کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ شوکت بت بنا کھڑا تھا۔ نازو اور نینی کو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی پر یقین نہ آ رہا تھا۔

"ظہور...... او ظہور......" استاد نے بانہوں میں بھرے ظہور کو آواز دی۔ تیسری آواز پر اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ استاد سے نظریں ملیں تو وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لبوں پر بڑی ہلکی مگر بے حد جاندار مسکراہٹ ابھری۔

"استاد......" دھیرے سے اس نے کہا۔

"استاد نہ کہہ رے مجھے......" استاد نے تھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تُو تو پیر ہو گیا میرا۔ مرشد ہے تو۔"

"نہ استاد نہ......" ظہور نے تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مرشد تو میرا تُو ہی ہے استاد...... میں نے جو تجھ سے لیا' وہ اللہ کے حضور پیش کر دیا۔ مُرشد تو تو ہے استاد...... تیرا مرتبہ کوئی دوسرا لے لے' میں اس سے پہلے مر نہ جاؤں۔"

"نہ رے نہ......" استاد نے اسے پھر سینے سے لپٹا لیا۔ "ایسا نہ کہہ۔ اب تو تجھے زندگی ملی ہے۔ اب تو جینے کا مزا آئے گا تجھے' جیتا رہ ظہور...... اب تو تجھے موت بھی پوچھ کر آئے گی رے۔"

اس کے سر کو بوسہ دے کر استاد نے خود سے الگ کیا۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں اپنی آستین سے صاف کیں۔ پھر اسے اس کی گدی پر بٹھا کر کمبل اس کے گرد لپیٹ دیا۔

"آیا تو میں تجھے لینے کے لیے تھا ظہور...... مگر اب میری ہمت نہیں پڑتی کہ تجھے ساتھ چلنے کے لیے کہوں۔"

"تم حکم کرو استاد میں تیار ہوں۔" ظہور نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نہیں ظہور......" استاد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ "تو یہاں بجتا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے...... یہاں سے تجھے فیض ملا ہے۔ تجھے یہاں سے جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

اس نے ظہور کے ہاتھ چوم کر چھوڑ دیے۔ "بس...... ایک درخواست ہے تجھ سے۔"

"مجھے چھریاں نہ مار استاد۔" ظہور نے تڑپ کر کہا۔ "مجھے حکم دے۔ جان چاہیے کیا؟"

"نہ ظہور نہ......" استاد نے اسے آگے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ "آج تو کہا ہے پھر کبھی نہ کہنا۔ اب تیری جان پر کسی دنیا والے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ حق کے نام لگ گئی۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہاں اپنے آس پاس' اپنے اردگرد میرے اور اپنی استانی کے لیے دو دو گز زمین مخصوص کر رکھنا۔ آخری سانس کے بعد کی گھڑیاں تیرے پاس' تیری حق ہُو کر صدائیں سنتے گزریں' بڑی شدت سے دل مچلا ہے اس پر۔"

"استاد......!" ظہور روئے جا رہا تھا۔ "استاد...... کیسی بات کرتے ہو۔ میں کس قابل ہوں۔ مجھے موت نہ آ جائے تجھ سے پہلے۔"

"یہ کون جانتا ہے ظہور۔ کون پہلے اور کون بعد میں۔ مگر یاد رکھنا۔ ہم دونوں کی قبریں تیرے پاس امانت ہیں اور اگر تو اپنے اللہ سے پہلے جا ملا تو میں تیری قبر پر مجاور بن کر آ بیٹھوں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا تجھ سے۔ اپنے آپ سے۔" ظہور بچوں کی طرح روتا ہوا پھر استاد سے لپٹ گیا۔ اس کی ہچکیاں رک ہی نہ رہی تھیں۔ شیراز اور شوکت بھی آبدیدہ ہو گئے اور رہ گئیں نازو اور نینی...... تو ان کی سسکیاں دل چیر رہی تھیں۔ سینے جلا رہی تھیں۔

"اچھا...... اب بس...... بہت ہو گئی برسات......" استاد نے خود کو سنبھالا۔ ظہور کو گدی پر دوبارہ سجا کر بٹھایا۔ اس کا اور اپنا چہرہ خشک کیا۔

"امتیاز......" پھر اس نے آواز دی۔

"جی اُستاد......" وہ اس کے قریب آ گیا۔

"ظہور کا خیال رکھنا...... اسے کبھی اکیلا مت چھوڑنا۔ اور سن......" استاد نے قمیص کی جیب سے نوٹوں کی خاصی تعداد نکال کر امتیاز کی جیب میں ڈال دی۔ "وہاں...... مزار پر رہنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ گاؤں میں کوئی جگہ دیکھ لے۔ یہ تو اب یہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ تو کوئی مستقل ٹھکانہ بنا لے۔ جب یہ لوگوں کی بھیڑ سے خالی ہو جائے تو تو بھی گھر چلا جایا کرنا۔ موبائل ہے تیرے پاس' کوئی بھی بات ہو فوراً خبر کرنا مجھے۔"

"جی استاد......" امتیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور اداس نہ ہونا۔ میں اور استانی تم سے ملنے آیا کریں گے۔ اس بابے کی دعا بھی تو لینی ہوگی اکثر۔" استاد نے ظہور کو محبت پاش نظروں سے دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"ظہور......" شیراز نے آگے بڑھ کر ظہور کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ وہ بڑی گرمجوشی سے اس سے بیٹھے بیٹھے گلے ملا۔ پھر شوکت سے ہاتھ ملایا۔ نازو اور نینی نے اس کے گھٹنے چھوئے' ظہور نے ان کے سروں پر پیار دیا۔

"اچھا بھئی ظہور بابا۔" استاد نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "اب اجازت۔"

"میں باہر تک ساتھ چلتا ہوں استاد۔" اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

"نہیں ظہور بابا......" استاد کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھری۔ "تو بیٹھا رہ۔ ہمیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا...... دعا کرتا رہ..... یہی درکار ہے...... بس!"

ظہور نے استاد کے ہاتھوں کو شانوں سے ہٹا کر بوسہ دیا۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرے استاد کے ہاتھوں کی پشت پر گرے۔ ظہور نے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا اور چھوڑ دیا۔

استاد نے ایک پل اُسے غور سے دیکھا۔ پھر پلٹ گیا۔

سب لوگ اس کے پیچھے سر جھکائے چل پڑے۔ یوں جیسے کسی استاد کے پیچھے شاگردوں کی قطار چل دی ہو۔

انہوں نے قبرستان سے باہر قدم رکھا تو فضا میں "حق...... ہو" کا نعرہ روشن ہوا۔ استاد نے آنکھیں موند کر چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور بڑی گہری سانس لی۔ اسی وقت دوسری مرتبہ ظہور کی آواز ابھری۔ استاد نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ تک گئے۔ شوکت نے کار گیئر میں ڈالی اور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اُسے آگے بڑھا دیا۔

ظہور کی تھراتی ہوئی' بھرائی ہوئی' حق ہو' کی صدائیں دور تک ان کا پیچھا کرتی رہیں اور ان کے دل ایک عجیب سے لذت آمیز درد سے بستے چلے گئے۔





نجم اور شیراز ملاقات کے کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پر تازہ اخبارات پڑے تھے جن میں حمید اور نذیر کے قتل کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ نامعلوم قاتل یا قاتلوں نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ حمید کے ذاتی ڈرائیور جمال نے صرف اتنا بیان دیا تھا کہ اس رات چوہدری حمید اور نذیر نے اُسے رات کے گیارہ بارہ کے درمیان باقی دونوں ملازموں سمیت چھٹی دے دی تھی اور خود دونوں ڈیرے پر رک گئے جو ایک معمول کی بات تھی۔ اب بعد میں کون آیا' کیا ہوا؟ یہ اس کے علم میں نہیں۔ دونوں ملازموں نے بھی اس کے بیان سے اتفاق کیا اور ابھی تک اپنے بیان پر اڑے ہوئے تھے۔

یہ تو شوکت' رانا سہیل' شیراز اور استاد ہی جانتے تھے کہ جمال اور دونوں ملازموں کو ایک معقول رقم کے عوض خرید لیا گیا تھا تاکہ وہ نازو اور نینی وغیرہ کا نام نہ لیں۔ طاہر گوندل ویسے ہی رانا سہیل کا اپنا آدمی تھا اس لیے اس نے جمال اور دیگر ملازموں کو صرف رسمی طور پر بیان دینے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھا۔

"یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟" نجم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اسے چھوڑو۔" شیراز نے اخبار ایک طرف ہٹا دیئے۔ "اپنی کہو...... کوئی نئی تازہ......"

"وہ بھی ہے......" نجم نے اسے غور سے دیکھا۔ "مگر تم اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے؟"

"ضرورت ہی کیا ہے نجم...... میرے ساتھ ان لوگوں نے کون سا اچھا سلوک کیا تھا جو میں رونا دھونا شروع کر دوں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ پھر جب وہ تمہیں یہاں بھی جان سے ماردینے کی کوشش کر چکے تھے تو تمہارا رویہ سمجھ میں آتا ہے۔ ویسے کوئی اندازہ ہے ان کی کسی سے دشمنی......؟"

"گاؤں والوں کی دوستیاں اور دشمنیاں بڑی عجیب' گہری' ڈھکی چھپی اور سمجھ میں نہ آنے والی ہوتی ہیں نجم...... ہوسکتا ہے کسی اور پر بھی انھوں نے ظلم کا پہاڑ توڑا ہو یا...... کوئی اپنا ہی دشمنی پر اتر آیا ہو۔"

"ہوں......" نجم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اچھا چھوڑو۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔ "میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں جسے فی الحال تم اپنے آپ تک رکھو گے۔"

"کیا؟" شیراز کا دل زور سے دھڑکا۔

"تمہاری اور استاد کی رہائی کے آرڈر ہو گئے ہیں۔"

"واقعی......؟" شیراز کو یقین نہ آیا۔

"ہاں...... نئی حکومت کی خوشی میں جن لوگوں کو رہائی دی جارہی ہے ان میں تم دونوں کے نام بھی شامل ہیں۔ میں خود دیکھ کر آرہا ہوں۔" نجم کے چہرے پر مسرت ناچ رہی تھی۔

"اور یہ رہائی کب تک عمل میں آئے گی؟" شیراز نے بے تابی سے پوچھا۔

"دو یا زیادہ سے زیادہ تین دن میں۔" نجم نے جواب دیا۔

"نجم......" شیراز نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔ "میں تمہارے کس کس احسان کا بدلہ دوں گا یار۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا...... سب رانا سہیل اور استاد کی کوشش کا نتیجہ ہے۔"

"پھر بھی...... تم نے کم وقت تو خراب نہیں کیا ہوگا اپنا۔"

"بس بس...... زیادہ بکواس نہیں۔" نجم نے کہا اور اُسے الگ کرتے ہوئے ہنسا۔ "تمہارے لیے وقت خراب نہیں کروں گا تو کس کے لیے کروں گا۔ ایک ہی تو یار بنایا ہے زندگی میں۔"

"شکریہ نجم......" شیراز بھی مسکرایا۔

"اچھا...... اب میں چلوں گا یہ خبر تو میں تمہیں آتے ہی سنانا چاہتا تھا مگر پہلے خراب خبر دے کر اچھی خبر آخری لمحوں کے لیے روک لی تھی۔" اس کا اشارہ حمید اور نذیر کی طرف تھا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" شیراز اب بھی مسکرا رہا تھا۔ "اور نجم...... باہر جاتے ہی سب سے پہلے محمود

اصغر کے پاس چلیں گے۔"

"ہاں......" ایک رنگ سا نجم کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ "ضرور......" اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ "اب اجازت۔"

"او کے......" شیراز نے گرمجوشی سے اسے رخصت کیا اور اس کے جانے کے بعد کمرے سے زنداں کے کاریڈور میں نکل آیا۔

ابھی وہ اپنی بیرک سے کچھ دور ہی تھا کہ کسی نے سے پکارا۔ پلٹ کر دیکھا تو رانا سہیل کا اردلی دکھائی دیا جو اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ مڑا اور اس کے پاس چلا آیا۔

"میں آپ کو ہی بلانے جارہا تھا...... رانا صاحب نے یاد کیا ہے!" وہ بولا۔

شیراز کچھ پوچھے بغیر اس کے ساتھ چل دیا۔

اردلی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے "یس" کی آواز سن کر دروازہ کھولا۔ شیراز اندر داخل ہوا اور دروازہ بند ہو گیا۔

شیراز آگے بڑھا۔ رانا سہیل' استاد اور طاہر گوندل سامنے بیٹھے تھے۔

"آؤ بھئی پروفیسر...... بیٹھو۔" رانا نے اس کے سلام کا جواب دے کر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ طاہر گوندل ہے۔ اپنا خاص آدمی۔" رانا نے تعارف کرایا۔ شیراز نے سانولے اور مضبوط جسم کے انسپکٹر سے ہاتھ ملایا جو بڑی گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ پروفیسر شیراز ہے گوندل...... غائبانہ تفصیل میں بتا چکا ہوں۔" رانا نے بات مکمل کی۔

"جی سر......" گوندل نے سر ہلایا۔

"یہ کچھ تصویریں آئی ہیں ماسٹر دیکھو...... ذرا دیکھو۔" استاد نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر ایک سفید لفافہ شیراز کی طرف بڑھایا۔ "ہم تو دیکھ چکے ہیں۔ تمہاری رائے بھی ضروری ہے۔"

شیراز نے لفافہ کھولا اور چھ سات رنگین تصویریں نکال لیں۔

ہر تصویر ایک ہی اینگل سے لی گئی تھی اور علی الترتیب ایک کہانی بیان کر رہی تھی۔ پہلی تصویر میں انسپکٹر منیر' صوفے پر زخمی چوہدری حمید اور نذیر پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔ دوسری میں اس کی گولی چوہدری حمید کا سینہ چھید چکی تھی۔ تیسری میں نذیر لہولہان ہو چکا تھا۔

آخری تصویر میں چوہدری حمید اور نذیر خون میں نہائے ہوئے ایک ہی صوفے پر آڑے ترچھے آدھے اوپر' آدھے زمین پر گرے پڑے تھے اور انسپکٹر منیر دھواں اگلتا ریوالور لیے ان کو گھور رہا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہیں...... کوئی کمی نہیں۔" شیراز نے تصویریں لفافے میں ڈال کر کہا۔"شوکت نے کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی۔ ہر چہرہ واضح اور سامنے ہے۔"

"لو بھئی گوندل۔" رانا نے تصویروں والا لفافہ اور پولی تھین بیگ میں موجود وہ ریوالور اس کی طرف بڑھایا' جس سے انسپکٹر منیر نے یہ واردات کی تھی اور جس پر اس کی انگلیوں کے نشان موجود تھے۔"اب تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔ اُسے آج ہی گرفتار کرلو۔ ویسے اس وقت وہ ہے کہاں؟"

"مخبر کی اطلاع کے مطابق وہ اپنے خالہ زاد کے ہاں قصور کے ایک محلے میں ہے۔ آدھ گھنٹے پہلے تک تو وہیں تھا' جونہی کسی جگہ کے لیے نکلا' اطلاع مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ ضمنی میں نے لکھ دی ہے۔ اسے کھاتے میں چڑھا لینا۔" رانا سہیل نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا جسے گوندل نے کھول کر پڑھا اور سر ہلاتے ہوئے تصویروں والے لفافے میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت ہے سر؟" اس نے پی کیپ سر پر رکھی۔

"او کے...... آل دی بیسٹ۔" رانا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

گوندل استاد اور شیراز سے بھی ہاتھ ملا کر دونوں اشیاء سنبھالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ضمنی میں کیا لکھا ہے سر......؟" شیراز نے رانا کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ کسی نامعلوم شخص نے یہ تصویریں اور آلۂ قتل جس پر انسپکٹر منیر کی انگلیوں کے نشان موجود ہیں' انسپکٹر گوندل کو بھجوائے جن کی روشنی میں انسپکٹر منیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ثبوت اتنے ٹھوس ہیں کہ وہ بچ ہی نہیں سکتا۔"

"اور اگر اس نے ہم لوگوں کے بارے میں بک بک شروع کر دی تو......؟" شیراز نے پوچھا۔

"کرتا رہے' ناقابل یقین باتوں پر عدالت دھیان کب دے گی۔ اپنی باتوں کے حق میں اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہے نہ ثبوت۔ بالآخر اس کی چیخ و پکار نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائے

گی۔"

"ہوں......" شیراز نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"اور سنو پروفیسر......" رانا نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔"اس کے خلاف وکیل تم کھڑا کرو گے۔ اپنے بھائیوں کی بیواؤں کے آنسو پونچھنے کے لیے...... وہ ناقص العقل عورتیں ہیں۔ میرا مشورہ ہے ان کو اپنے انتقام کی فہرست سے خارج کر دو۔"

"کر دیا سر......" شیراز نے ایک پل کی دیر کیے بغیر کہا۔ استاد بے ساختہ مسکرا دیا۔ جیسے اسے شیراز سے اسی رویئے کی توقع تھی۔

"یہ کیس نجم لڑے گا سر...... کیا خیال ہے؟" شیراز نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔"اس سے بہتر اور کون لڑ سکتا ہے۔ وہ انسپکٹر منیر کو پھانسی کے تختے پر پہنچا کر دم لے گا۔" رانا نے ں کر جواب دیا۔

شیراز نے استاد کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا اور شیراز نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔



دوسرے دن کے اخبارات نے عوام میں دو خبروں کی وجہ سے تہلکہ مچا دیا۔ ایک تو حمید اور نذیر کے قتل کے جرم میں انسپکٹر منیر کی گرفتاری کی خبر تھی۔ ساتھ وہ تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں جن میں' وہ ان دونوں کو گولیاں مار رہا تھا۔ آلۂ قتل کی برآمدگی نے اُس کے بچ نکلنے کے سارے راستے بند کر دیئے۔ اس نے معمولی مزاحمت کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

دوسری خبر نئی حکومت کی طرف سے اقتدار سنبھالنے کی خوشی میں سات سو چھیاسی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں تھی۔

دن کے دس بجے تھے جب رانا سہیل استاد کی بیرک کے سامنے آ کر رکا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

"ارے ارے...... آج تو بڑا مبارک دن ہے۔ بڑی دیر بعد ہمارے ہاں بھی روشنی ہوئی ہے۔" استاد اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا جسے سنتری' رانا کے اشارے پر کھول چکا تھا۔

"ایک خوشخبری ہے استاد۔" رانا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

استاد کے ساتھ ساتھ شیراز بھی اس کے قریب آ گئے۔

"تمہارے آنے سے بڑی کیا خوشخبری ہوگی رانا۔"

"ہے استاد...... تم دونوں کے لیے۔"

"کیا؟" استاد نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نئی حکومت نے آتے ہی سابقہ روایات کی پاسداری کرتے ہوئے جن قیدیوں کی رہائی کے احکامات جاری کیے ہیں ان میں تم دونوں کے نام بھی شامل ہیں۔ آرڈرز مل گئے ہیں مجھے۔"

"ارے واہ......" استاد نے رانا کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو تھام لیا۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے۔ رانا' استاد کے بعد ہنستے ہوئے شیراز سے بھی گلے ملا۔ اس کے بعد استاد نے شیراز کو سینے سے لگا کر یوں بھینچا کہ اس کی پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔

"مبارک ہو ماسٹر...... مبارک ہو......" وہ بے حد خوش تھا۔

"یہ سب رانا صاحب اور تمہاری دعائیں ہیں استاد۔" شیراز نے قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس بارے میں ذرا سی بھی بھنک رکھتا ہے۔

"یہ تو ہے۔" استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ کیوں رانا!"

"ہاں...... ہاں......" رانا کھلا جا رہا تھا۔ "میں کاغذی کارروائی مکمل کر کے آ رہا ہوں۔ تم لوگ چلو میرے ساتھ۔"

"ابھی......" استاد نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... ابھی اور اسی وقت۔"

"تو چلو پیارے...... ابھی چلو......" استاد بچوں کی طرح قلقاری مار کر بولا۔ رانا ان دونوں کو لے کر اپنے آفس میں آیا۔

"میں یہ خوشخبری نجم کو سنانا چاہتا ہوں سر۔" شیراز نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور سناؤ...... فون کرو اُسے......" رانا نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

شیراز نجم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو نجم......" شیراز نے رابطہ ہونے پر جلدی سے کہا۔

"کچھ مت کہنا۔" نجم نے تیزی سے اُسے روک دیا۔ "میں مٹھائی لے کر آ رہا ہوں۔" ساتھ اس نے فون کاٹ دیا۔

"کیا ہوا؟" استاد نے اسے ریسیور واپس کریڈل پر ڈالتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ مٹھائی لے کر آ رہا ہے۔" شیراز نے کہا اور بے اختیار ہنس پڑا۔

"کیسا خوش قسمت ہے تو ماسٹر...... ہر شخص تیری خوشی میں ناچتا پھر رہا ہے۔" استاد نے کہا تو رانا نے مسکرا کر اردلی کے لیے بٹن دبا دیا۔

"یس سر......" اردلی نے دروازہ کھول کر سر اندر گھساتے ہوئے پوچھا۔

"آفس میں چلے جاؤ۔ نجم الدین وکیل آنے والا ہے۔ اُسے ساتھ لے کر یہیں آ جاؤ۔"

"یس سر......" اس نے سر ہٹا لیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

دس منٹ بعد نجم جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں مٹھائی اور دوسرے میں پھولوں کے ہار تھے۔

شیراز اٹھا اور اس سے جا لپٹا۔ دونوں بچوں کی طرح کھلے جا رہے تھے۔

"شیراز...... شیراز......" نجم کہتے کہتے نہ تھک رہا تھا۔

"نجم...... نجم......" شیراز کے ہونٹوں سے کچھ اور نکل نہ رہا تھا۔

بمشکل وہ الگ ہوئے۔ نجم نے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالا۔ دوسرا ہار استاد کے گلے ڈالا اور اس سے گلے ملا۔ پھر رانا سہیل کو ہار پہنایا اور جھجکتے ہوئے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

"گلے ملو یار...... آج کون سا ہاتھ ملانے کا موقع ہے۔" رانا نے اُسے کھینچ کر گلے لگا لیا۔

رانا سہیل نے خود مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ پہلے استاد پھر شیراز اور نجم کا منہ میٹھا کرایا۔ پھر شیراز اور استاد نے رانا کے منہ میں مٹھائی کا ٹکڑا رکھا۔

اسی وقت شوکت اور نعیم بھی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھے۔ رانا سہیل نے ایک شاپنگ بیگ استاد اور شیراز کی طرف بڑھا دیا۔ ان کو مبارکباد دی اور گلے ملے۔

"کپڑے بدل لو بھائی لوگو!" رانا سہیل نے ان کو متذبذب دیکھ کر کہا۔

"یعنی......" استاد نے شاپنگ بیگ تھام کر اس کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں...... یہ تمہاری بھابی کی طرف سے ہے۔"

"جیو......" استاد نے خوش ہو کر کہا۔

پانچ منٹ میں انہوں نے کپڑے بدل لیے۔ استاد نئی شلوار قمیض اور شیراز پینٹ شرٹ اور جرسی میں خوب جچ رہا تھا۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ ہنگامہ ہاؤ ہو میں حلق تر کیے گئے۔ پھر وہ سب ٹک کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" رانا نے ضروری کاغذات پر استاد اور شیراز کے دستخط کرانے کے بعد پوچھا۔

"پروگرام......!" استاد نے کہا اور شیراز کی طرف دیکھا۔

"کوئی اور پروگرام نہ بنانا استاد۔ سب سے پہلے استانی۔" وہ ایک دم کہہ گیا۔

"ہاں......ہاں......" استاد نے اثبات میں سر ہلایا اور دھیرے سے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔"

اسی وقت کمرے میں وہی مسحور کن خوشبو کا جھونکا داخل ہوا۔ جیسے کوئی دبے پاؤں آ کر شیراز کی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کو ہو۔

ہر شخص نے اس خوشبو کو محسوس کیا۔ عجیب سکون اور فرحت دیتی مہک تھی وہ اور سب کو یہی لگ رہا تھا کہ اس سے پہلے اس نے ایسی خوشبو کبھی محسوس نہیں کی۔ شاید وہ کسی دوسری دنیا کی مہک تھی۔

"اور میں......" شیراز بے کل سا ہو گیا۔ "میں کب چلوں نجم تمہارے ساتھ۔"

"کہاں؟" وہ انجان بن گیا۔

"مری سینٹی ٹوریم...... محمود اصغر کے پاس۔"

"ایک آدھ دن نکال لو یار۔ پھر چلیں گے۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں نجم...... میں فوراً اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کی یاد بڑی شدت سے تڑپا رہی ہے مجھے...... تمہارے کہنے پر میں نے اس سے خط یا فون کا رابطہ بھی نہیں رکھا۔ اب اور انتظار نہیں ہوتا مجھ سے......" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"اچھا...... تو کل صبح نکل چلیں گے۔ میری گاڑی سروس کے لیے گئی ہے۔ آج شام مل جائے گی۔" نجم نے جیسے مجبور ہو کر کہا۔

استاد بڑی گہری نظروں سے نجم کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے نجم مری کے ذکر پر کچھ پریشان ہو

گیا ہو۔ مگر کیوں؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"چلو...... صبح ہی سہی...... مگر یہ حتمی پروگرام ہے۔" شیراز نے تسلی چاہی۔

"ہاں ہاں...... میں کب اسے بدلنے جا رہا ہوں۔" نجم پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ اس بار استاد نے صاف محسوس کیا کہ نجم کچھ چھپا رہا ہے۔ شیراز تو اپنی رو میں کچھ جانچ نہ رہا تھا مگر استاد کی جہاندیدہ نگاہوں نے تاک لیا کہ نجم سب کچھ مجبوراً مان رہا ہے۔

"تو ہماری بھابی کو لینے کب جا رہے ہو استاد؟" رانا نے پوچھا۔

"کب جانا چاہیے؟" استاد نے کرسی پر پہلو بدلا اور مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا۔

"میری جان...... میں تو چاہتا ہوں تم ابھی چلے جاؤ۔ دیر کس بات کی ہے۔ چاہو تو میں ساتھ چلوں۔"

"نہیں رانا...... جاؤں گا تو میں اکیلا...... مگر ابھی نہیں۔"

"تو پھر کب؟"

"جس رات اسے پہلی بار دیکھا تھا' کیا وقت ہوا تھا اس وقت؟" استاد نے کھوئی کھوئی نظروں میں ماضی کو اجالتے ہوئے پوچھا۔

"آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کا وقت تھا۔"

"تو بس...... ٹھیک اسی وقت رات کو جاؤں گا۔"

"اور تب تک کیا کرو گے؟"

"ماسٹر کو لے کر سڑکوں پر گھوموں گا۔ لمبی ڈرائیو کروں گا۔ آزاد فضاؤں میں جی بھر کر سانس لوں گا۔" استاد بولتا چلا گیا۔ "واپسی کے احساس کے بغیر جیوں گا۔"

"چلو...... یونہی سہی......" رانا اٹھ گیا۔ "آؤ...... تم لوگوں کو باہر تک چھوڑ دوں۔" وہ سب رانا سہیل کے ساتھ چل پڑے۔ ایک چھوٹا موٹا جلوس لگتا تھا۔

پانچ منٹ بعد جب ان دونوں نے سنٹرل جیل کی چار دیواری سے باہر قدم رکھا تو بے اختیار دل سے "الحمدللہ" نکلا اور لبوں کو چھوتا ہوا نظروں کے تعاقب میں آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔ تشکر بھری نگاہوں میں اپنے خالق کے حضور پیش کرنے کے لیے سوائے نمی کے کیا تھا۔ اور وہ وافر تھی۔

شوکت استاد کی سیاہ کار لے آیا۔ نعیم اور رانا' استاد اور شیراز کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کے

باہر متعین سپاہی الرٹ کھڑے تھے۔ آخر ان کا باس سامنے موجود تھا۔ وہ سانس بھی رک رک کر سنبھل سنبھل کر لے رہے تھے۔

"اچھا بھئی پروفیسر...... اللہ کے حوالے۔" رانا نے شیراز سے مصافحہ کیا۔ نجم سے ملا۔ شیراز نے نعیم سے بھی ہاتھ ملایا اور استاد رانا کی طرف بڑھا۔

"اچھا بھئی رانا...... اجازت۔"

"استاد...... اجازت ہی اجازت ہے مگر...... ایک بات تو تم نے بتائی ہی نہیں؟" رانا نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

"وہ کیا؟" استاد نے پوچھا۔

"بھابی کو لے کر جاؤ گے کہاں؟"

"اپنے گھر جاؤں گا اور کہاں جاؤں گا۔" استاد نے حیرت سے جواب دیا۔

"نہیں...... تم وہاں نہیں جاؤ گے۔" رانا نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"تو پھر......؟" استاد اب بھی حیران تھا۔

"استاد کہلاتے ہو۔" رانا کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ "اپنا مرتبہ نہیں پہچانتے۔ تم بھابی کو لے کر سیدھا میرے گھر آؤ گے۔ میں نے اوپر کا پورشن تمہارے لیے تیار کروا دیا ہے۔ تم وہاں رہو گے۔"

"مگر......" استاد نے کہنا چاہا۔

"استاد کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔ میں نے تمہیں اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ انکار مت کرنا استاد۔"

"رانا......" استاد چند لمحوں تک اسے تکتا رہا پھر اس کے گلے لگ گیا۔

"اب تک ہر اچھا بُرا کام ساجھے میں کیا ہے استاد...... باقی کی زندگی اکٹھے رہ کر گزار لیں تو کیا حرج ہے؟"

"ٹھیک ہے رانا...... جیسے تو کہے...... میں شمشاد کو لے کر سیدھا تیری طرف آؤں گا۔"

وہ رانا کے سینے سے الگ ہوا اور تیزی سے کار کی طرف بڑھ گیا جس کا دروازہ کھولے شوکت کھڑا تھا۔

شیراز استاد کے بعد اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا۔ استاد نے سختی سے ہونٹ پر ہونٹ جما

رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے ابلتے جذبات کو راستہ نہ دینا چاہتا تھا۔

سیاہ کار نے دھیرے سے حرکت کی۔ پھر کسی پرندے کی طرح سڑک پر اڑتی چلی گئی۔



بازارِ حسن حسبِ معمول جگمگا رہا تھا۔ رونقیں عروج پر تھیں۔ چہل پہل میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ استاد نے گاڑی ٹھیک اسی جگہ روکی، جہاں پہلی مرتبہ بریک لگائی تھی۔ تب شوکت ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ آج وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ شیراز اس کے ساتھ والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

"ماسٹر...... تم بیٹھو...... میں اکیلا جاؤں گا۔" استاد نے اسٹیئرنگ پر جمی انگلیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں عجیب سی بے تابی تھی۔

شیراز جواب میں سر ہلا کر رہ گیا۔ بولا کچھ نہیں۔ وہ استاد کی اندرونی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ یہ جذباتی لمحے زندگی میں جب بھی آتے ہیں انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان کی پذیرائی کیسے کرے۔ ان کو چوم چاٹ کر کہاں رکھے کہ ان کے تقدس میں کمی نہ رہ جائے۔ ان کو اپنی توہین کا احساس نہ ہو۔

کچھ دیر استاد آنکھیں بند کیے سر سینے پر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے حرکت کی۔

دروازہ کھولا اور پاؤں سڑک پر رکھا۔

بھاگ کر ایک ہار بیچنے والا اس کے قریب آ گیا۔

"ہار باؤ جی...... ہار......" اس نے موتیے اور گلاب کے ہار اور گجرے اس کے سامنے کیے۔ استاد نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا۔ پھر گردن گھما کر کار سے باہر نکل آئے شیراز کی طرف دیکھا۔ ہاتھ اس ہار والے کے سینے پر رکھ کر اُسے نرمی سے ایک طرف ہٹایا اور آگے بڑھ گیا۔

"اے...... اِدھر آؤ۔" شیراز نے واپس جاتے ہار والے کو آواز دی۔

"جی باؤ جی...... ہار لیں جی...... گجرے بھی ہیں۔" وہ لپک کر اس کی طرف آ گیا۔

شیراز نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی جیب میں ٹھونسا اور اس کے ہاتھ سے وہ چھڑی لے لی جس پر اس نے ہار اور گجرے ٹانگ رکھے تھے۔ پھر کچھ سوچتے ہوا آہستہ روی سے آگے چل پڑا۔ ہار بیچنے والا اُسے حیرت سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایسے دریا دل گاہک سے شاید اُسے بڑی دیر بعد واسطہ پڑا تھا۔

استاد نے شمشاد بلڈنگ کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ایک دم ڈیوڑھی سے نکل کر کوئی اس کی طرف بڑھا۔

"جی باؤ جی......"

"شمشاد کہاں ہے؟" استاد نے اُس تنومند آدمی کو غور سے دیکھا۔

"بائی جی!"

"میں نے پوچھا شمشاد کہاں ہے؟" استاد نے اس کی بات کاٹ کر بڑے سخت لہجے میں کہا۔

وہ آدمی گھبرا گیا۔

"اوپر...... اوپر ہیں جی......" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

استاد نے بازو گھما کر اس کو ایک طرف دھکا دیا اور سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ آدمی گرتے گرتے بچا۔ کچھ کہنے لگا۔ پھر نجانے کیا سوچ کر زبان روک لی اور سر جھٹک کر اپنی جگہ واپس چلا گیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر دائیں بائیں جاتا کاریڈور تھا۔ بائیں طرف سے پھر سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ دائیں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ سامنے بھی سات آٹھ فٹ دور ایک کمرے کا بند دروازہ تھا۔

استاد نے ایک پل کو کچھ سوچا۔ پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے دی۔

"کون؟" اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

اور...... استاد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے لگا اگر وہ آواز دوبارہ اس کے کانوں میں پڑی تو دل پسلیاں توڑ کر باہر آ گرے گا۔

استاد کے ہونٹ ہلے...... آواز نہ نکلی۔

بے اختیار اس نے دوبارہ دستک دی۔

ٹھک...... ٹھک...... ٹھک......!

بڑی ٹھہری ہوئی...... بند کھولتی ہوئی دستک تھی۔

ایک دم کوئی دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

اور...... استاد کا اٹھا ہوا ہاتھ پہلو میں گر پڑا۔

سامنے شمشاد اپنے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کھڑی اُسے دیوانہ وار تکے جا رہی تھی۔

"استاد......" وہ اس کے قدموں میں گرتی چلی گئی۔ اس نے استاد کے پاؤں جکڑ لیے۔

"تم آ گئے...... تم آ گئے استاد......"

پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔ "مجھے لینے آئے ہو ناں!"

"ہاں......" استاد کے ہونٹوں سے پھول جھڑے...... اور اس نے شانوں سے تھام کر لرزتی شمشاد کو اٹھا کر سینے میں چھپا لیا۔

وہ اس کے دل میں گھسی جا رہی تھی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ استاد کو خود میں سمو لیتی۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر انتظار کی پیاس بجھاتے رہے۔ دُوریوں کے نوحے گاتے رہے۔ فراق کی برسات میں بھیگتے رہے۔ وصال کے دامن سے لپٹتے رہے۔

"باجی......" ایک آواز ابھری تو وہ ہوش میں آئے۔ یہ نازو تھی جو نینی کے ساتھ کھڑی حیرت سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ استاد نے آہستہ سے آنکھیں وا کیں۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں مستی سکون بن کر تیر رہی تھی۔ شمشاد اس کے پہلو سے لگی اسے لے کر اندر چلی آئی۔

"کب آئے؟" شمشاد نے استاد کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی......" وہ مسکرایا۔

"نازو......" شمشاد نے ساڑھی کے ساتھ پہلو میں لٹکتی چابیوں کا گچھا نکالا۔ "یہ لے...... آج سے یہ سب تیرا اور نینی کا ہے۔"

"اور باجی تم......؟"

"میں جا رہی ہوں نازو...... آج سے میرا اس جگہ سے ہر تعلق ختم ہو گیا۔ اور سن!" اس نے نازو کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ "میری بات کو غور سے سن...... آج سے تو دھندہ نہیں کرے گی۔ میری جگہ کام کرے گی۔ آج سے تجھ پر صرف ایک مرد حلال اور باقی سب حرام۔ حلال وہ جس سے تو دو بول پڑھوا لے۔ بول...... منظور ہے۔"

"منظور ہے باجی......" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"ہو سکے تو نینی کی کہیں شادی کر دے۔ اسے بھی اس گند سے نکال دے۔" شمشاد نے نینی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھ...... میں یہاں سے خالی ہاتھ جا رہی ہوں۔ سب کچھ تجھے دے کر۔ کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔ تو بھی کوئی استاد تلاش کر لینا...... دل میں آس باندھ لے گی...... خود کو خلوصِ نیت کے ہاتھ بیچ دے گی تو ایک دن مل جائے گا جو تجھے ان سیڑھیوں سے اُتار کر گھر کی چار دیواری میں لے جائے گا۔" اس نے بدن سے سارے زیور اُتار کر نازو کو تھما دیئے۔ نازو آبدیدہ ہو گئی۔ نینی بھی سسک پڑی۔

"لو...... اللہ کے حوالے...... چلو استاد...... میں تیار ہوں۔"

شمشاد نے سر پر ساڑھی کا پلو جمایا اور سر جھکا لیا۔

اسی وقت دروازے پر شیراز نمودار ہوا۔

"استاد...... دلہن کو سُونا سُونا ہی لے کر جاؤ گے۔" وہ مسکراتا ہُوا اندر داخل ہوا۔ پھر اس نے ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاب کے ہار استاد اور شمشاد کے گلے میں ڈالے۔ گجرے نازو اور نینی کی

طرف بڑھائے جوانہوں نے شمشاد کے ہاتھوں میں پہنا دیئے۔ پھولوں کے زیور میں کانوں کے بُندے بھی تھے جو شمشاد کو دلہن بنا گئے۔ ''میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا شمشاد جی...... میں نے کہا تھا ناں ایک بار ضرور آؤں گا۔'' شیراز نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

استاد نے شمشاد کی طرف دیکھا جس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

آگے آگے شیراز' پیچھے پیچھے استاد اور شمشاد سیڑھیوں سے اترے۔ نازو اور نیئی ان پر پھول برسا رہی تھیں۔ بازار والے حیران تھے' پریشان تھے' پھر جب تک بات ان کی سمجھ میں آتی' شیراز نے ان کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کار ڈرائیو کرتا بازار سے نکل گیا۔



رانا سہیل نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے مین گیٹ پر استاد اور شمشاد کا استقبال کیا۔ اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر استاد کو سلام کیا۔ شمشاد کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ رانا کی دونوں بیٹیوں نے شمشاد کے پری وش حُسن کو حیرت سے دیکھا۔ پھر اس پر پھولوں کی پتیاں برساتی اندر لے گئیں۔ رانا کے بیٹے نے استاد کا ہاتھ تھام لیا اور اپنی توتلی زبان میں اس سے باتیں کرتا ساتھ چل پڑا۔ شیراز رانا کے ساتھ آخر میں اندر داخل ہوا۔

خوشگوار حیرت کا لمحہ تو وہ تھا جب ڈرائنگ روم میں شوکت' نعیم' نجم اور طاہر گوندل کے ساتھ استاد اور شیراز نے نکاح خواں کو بھی دیکھا۔

رانا کی بیوی اور بچیوں نے شمشاد کو دلہن بنایا۔ آدھ گھنٹے بعد جب وہ سرخ ساڑھی میں ملبوس شمشاد کو لے کر ڈرائنگ روم میں آئیں تو کمرے میں جیسے چنار کے پھولوں نے آگ لگا دی۔ استاد حسن کی اس مورت کو حیران حیران نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

نکاح ہوا۔

مبارک سلامت کا شور بلند ہُوا۔

ریکارڈنگ کی گئی۔

کھانا کھایا گیا اور...... استاد اور شمشاد کو ان کے پورشن کے ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور پھر وہ آپس میں گپیں مارنے بیٹھ گئے۔ رانا سہیل نے نجم اور شیراز کو سب سے آخر میں رخصت کیا۔ اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔

نجم اسے اپنی گاڑی میں اس کے گھر پر اتار کر صبح آٹھ بجے اس کے پاس پہنچ جانے کا کہہ کر نکل پڑا۔

سڑک پر کافی آگے آ کر اس نے گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور کسی گہری سوچ میں گم ہو

گیا۔



باتیں کرتے کرتے رات کے دو بج گئے۔

نہ استاد سنتے سنتے تھکا نہ شمشاد کہتے کہتے رُکی۔ زندگی بھر کی تھکان ایک دوسرے سے کہہ سن کر اتارنے میں جو مزہ آ رہا تھا اس سے وہ دونوں ہی حظ اٹھا رہے تھے۔

''ارے...... دو بج گئے۔'' اچانک استاد دیوار گیر کلاک کی ٹن ٹن سن کر چونکا۔

''ہاں......'' شمشاد بھی حیران رہ گئی۔ ''وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

اسی وقت استاد کا موبائل بول پڑا۔

''ارے...... اس وقت یہ کس کا فون آ گیا؟'' استاد نے موبائل اٹھایا۔ ''اوہ...... یہ تو نجم کی کال ہے۔'' استاد نے سکرین دیکھ کر جلدی سے بٹن دبایا۔

''ہیلو......'' اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''استاد...... میں بول رہا ہوں نجم۔''

''ہاں ہاں...... خیریت ہے ناں!''

''کچھ کہہ نہیں سکتا......'' نجم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' استاد الرٹ ہو گیا۔ ''کھل کر کہو یار۔''

''استاد...... مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی رات خراب کر رہا ہوں مگر......'' نجم کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''رسمیات میں نہ پڑو یار...... جلدی سے کہہ ڈالو جو بھی بات ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

پھر...... جواب میں نجم نے جو کچھ کہا۔ اُسے سن کر لمحہ بہ لمحہ استاد کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ پل پل اس کے چہرے کی رونق اداسی میں بڑھتی گئی۔ شمشاد بڑے غور سے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ پھر تقریباً دس منٹ بعد نجم نے بات ختم کی۔

''ٹھیک ہے...... میں اور شمشاد تمہیں وہیں ملیں گے۔'' استاد نے دھیرے سے کہا۔

''استاد......!'' نجم نے کہنا چاہا۔

''کچھ نہیں نجم...... میں سنبھال لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''شکریہ استاد......'' نجم کی آواز میں غم ہی غم جھلک رہا تھا۔

استاد نے موبائل آف کر کے تپائی پر ڈالا اور دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلا کر سر جھکا لیا۔

''کیا بات ہے۔ کس کا فون تھا؟'' شمشاد نے استاد کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"بتایا ناں...... نجم کا فون تھا۔"

"وہ تو میں جان گئی' مگر بات کیا ہے؟ آپ ایک دم اس قدر پریشان کیوں ہو گئے؟"

شمشاد ایک گھریلو عورت کی طرح تم سے آپ پر آ چکی تھی اور اس کے لہجے میں ایک محبت کرنے والی بیوی کی گھبراہٹ موجود تھی۔

"شمشاد...... ہماری آج کی رات سُونی رہ جائے گی۔" استاد نے اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے آپ کے ساتھ گزری ہوئی ہر رات پیاری ہے۔ آپ ہیں تو رونق ہی رونق ہے۔ بات بتایئے۔" وہ اُسے فریفتہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"پھر بھی شمشاد...... اس پہلی سہاگ رات کا قرض میں بعد میں ادا کروں گا۔ سمجھ لو ابھی ہم سفر میں ہیں۔"

"میں نے کہا ناں...... بات بتایئے۔ میرا دل ہول رہا ہے۔" شمشاد جیسی شیرنی کی آواز بھرا گئی۔

"بات شیراز سے متعلق ہے شمشاد......" استاد نے کہنا شروع کیا۔

شمشاد سنتی گئی اور اس کا چہرہ اداسی اور یاسیت کے رنگوں سے پھیکا پڑتا گیا۔ اس کی حالت بھی استاد سے مختلف نہ رہی۔

"تو کس وقت روانہ ہونا ہے ہمیں؟" استاد نے بات ختم کی تو شمشاد نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"میرا خیال ہے...... پانچ بجے نکل چلیں...... کافی لمبا سفر ہے......" استاد نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"تین بج رہے ہیں...... دو گھنٹے باقی ہیں۔ رانا صاحب سے کیا کہیں گے؟"

"بتانا پڑے گا اُسے بھی......" استاد نے آہ بھر کر کہا۔

شمشاد جواب میں سر جھکا کر رہ گئی۔

کمرے میں خاموشی اور اداسی بال کھولے ہر طرف گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔





نجم حسب وعدہ آٹھ بجے آ گیا۔

شیراز تیار تھا۔ ناشتہ وہ کر کے آیا تھا۔ شیراز اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور مری کے لیے انہ ہو گیا۔

راولپنڈی پہنچ کر انہوں نے ہلکا پھلکا لنچ کیا۔ فوراً ہی وہ آگے روانہ ہو گیا۔ شیراز کی بے تابی دیکھ کر نجم کا دل دھڑک رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ گھبرائے جا رہا تھا۔

مری سینی ٹوریم ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا اور لوگوں کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ مری کی وہوا کا ٹی بی کے خاتمے میں بہت بڑا ہاتھ ہے پھر بھی علاج کے نام پر وہاں بہت اچھا کام ہو رہا

نجم نے گاڑی سینی ٹوریم کی طرف جانے والی سڑک کے بجائے جب ایک دوسری سڑک پر ڑی تو شیراز بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس طرف کہاں؟ سینی ٹوریم تو دوسری طرف۔"

"مجھے علم ہے۔" نجم نے آہستہ سے کہا۔ "ایک اور جگہ کام ہے۔ پہلے ذرا وہ کر لیں۔"

"یار...... کام بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم ادھر چلو۔" شیراز نے خفگی سے کہا۔

"مانا کرو یار......" نجم نے نرمی سے کہا اور گاڑی روک دی۔

"یہ تو قبرستان ہے۔" شیراز نے باہر جھانکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... ذرا فاتحہ کہہ لیں۔ پھر چلتے ہیں۔" نجم باہر نکل آیا۔

"کوئی عزیز دفن ہے یہاں؟" شیراز بھی گاڑی سے نکل آیا۔

"بہت گہرا......" نجم نے مختصراً کہا۔

"ارے...... یہ تو استاد کی گاڑی لگتی ہے۔" شیراز نے چونک کر ذرا آگے کھڑی سیاہ کار کی نمبر

پلیٹ پر نظر جما کر کہا۔

"استاد کی گاڑی؟" نجم نے آہستگی سے کہا۔ "ہوسکتا ہے استاد بھی آیا ہو۔ اس کا بھی بہت گہرا رشتہ ہے اس عزیز سے جو یہاں دفن ہے۔"

"نجم......" شیراز اس کے پیچھے لپکا۔ "بات تو سنو۔"

"چلے آؤ یار......باتیں بھی کر لیں گے۔" نجم نے قدم قبرستان کے احاطے میں رکھ دیا۔

شیراز کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ وہ نجم کے پیچھے لپکا جو تیز تیز قدموں سے اس چھوٹی سی خوبصورت قبر کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے چاروں طرف چار ستون کھڑے کر کے اوپر چھت ڈالی گئی تھی اور منقش ٹائلوں سے قبر کو چھوٹے موٹے مزار کی شکل دے دی گئی تھی۔ قبر چاروں طرف سے کھلی تھی اور ......قبر کے پائنتی دور ہی سے شیراز کو استاد اور شمشاد بیٹھے دکھائی دے گئے۔

"نجم......!" شیراز نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پھولے سانس کے ساتھ کہا۔

"رکو......مجھے بتاؤ تو معاملہ کیا ہے؟ یہاں کون دفن ہے جو استاد اور شمشاد بھائی بھی یہاں موجود ہیں۔"

نجم نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور سیدھا جا کر استاد کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے گہرے ہوتے سائے شیراز کے دل میں ہزاروں وسوسوں کا طوفان اٹھا گئے۔

استاد سر پر سفید رومال باندھے اگربتیوں سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھ رہا تھا اور شمشاد سر پر ساڑھی کا آنچل ڈالے سر جھکائے کچھ پڑھ رہی تھی۔

شیراز قبر سے کچھ دور رک گیا۔ اُسے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا۔ خوف اُسے یوں مسل رہا تھا جیسے وہ قبر پر پہنچا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں تارے سے ناچ رہے تھے مگر یہ تارے روشن نہیں اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"نجم......!" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُسے خوفزدہ آواز میں پکارا۔

"یہ کس کی قبر ہے یار؟"

نجم نے آہستہ سے رخ پھیر کر اس کی طرف پشت کر لی۔ بولا کچھ نہیں۔

اسی وقت خوشبو کا وہی جانا پہچانا جھونکا لہراتا ہوا آیا اور شیراز کے چہرے کے گرد یوں متحرک ہو گیا جیسے اس کے بوسے لے رہا ہو۔ غیر اختیاری طور پر اس کے قدم حرکت میں آئے۔ مشینی انداز میں ایک ایک قدم اٹھاتا وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا...... پھر وہ سرہانے کی طرف قبر کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔

ڈرتے ڈرتے اس نے قبر کے تعویذ سے نگاہ اوپر اٹھائی اور کتبے کو دیکھا۔

ایک دم جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ جسم سے جان نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا گیا۔ وہ چکرایا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اگر استاد ہاتھ بڑھا کر اُسے تھام نہ لیتا تو وہ ساتھ والی قبر پر گر پڑا ہوتا۔

خوشبو کا جھونکا اس کے گرد اضطراب کے عالم میں تیر رہا تھا۔

قبر کے کتبے پر لکھا محمود اصغر......اس کی نظروں میں دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ بڑبڑایا اور استاد کی گود میں گر پڑا۔

"استاد......" اس نے دیوانوں کے عالم میں استاد کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"استاد......یہ......یہ......" وہ پاگلوں کی طرح کتبے پر لکھے نام کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"یہ سچ ہے ماسٹر......یہ سچ ہے۔" استاد نے آنسو ضبط کرتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"نہیں استاد......" وہ جیسے ڈر کر سہم گیا۔

"ہاں ماسٹر ہاں۔" استاد نے اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "یہ سچ ہے۔ محمود اصغر ہی کی قبر ہے"

"استاد......" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ پھر بے قابو ہوتا چلا گیا۔ وہ یوں تڑپا جیسے آج کے بعد کبھی اس کے دل میں درد نہ ہوگا۔ وہ یوں سسکا جیسے دوبارہ کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں گے۔

نجم رخ پھیرے کھڑا تھا......شمشاد ساڑھی کے پلو میں منہ چھپائے ہچکیاں لے رہی تھی اور استاد......وہ اُسے دلاسے دے رہا تھا۔

"نجم......تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی......تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" وہ ذرا سنبھلا تو جگر خراش لہجے میں بولا۔

"کیا بتاتا تمہیں؟ تم برداشت نہ کر پاتے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ تھا کہ محمود اصغر نے مجھے منع کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں تم سے اس کی حالت اور موت کا ذکر کروں۔"

"اوہ میرے خدا!......میں کیا کروں......میں اس سے مل بھی نہ سکا۔" شیراز نے سر کے بال لیے۔ اسی وقت خوشبو کا وہ جھونکا ایک بار پھر شیراز کے گرد یوں متحرک ہو گیا جیسے بے قراری کا اظہار کر رہا ہو۔ سب لوگ اس خوشبو کو محسوس کر رہے تھے۔

"یہ خوشبو......یہ مہک......" ایک دم شیراز کے لبوں سے نکلا......وہ فضا میں گھور رہا تھا اور

مہک اس کے دل ودماغ پر چھائے جارہی تھی۔

"یہ محمود اصغر کی مہک ہے شیراز...... وہ تو پل پل تمہارے ساتھ رہا ہے...... اب بھی تمہارے پاس موجود ہے۔" استاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا...... "میں نہ کہتا تھا یہ کسی بہت پیارے کی خوشبو ہے جو ہر آڑے وقت میں تمہارا حصار بن جاتی ہے۔"

"ہاں استاد...... تم ٹھیک کہتے تھے۔" شیراز کی کمزور سی آواز ابھری۔ "میرا ابھی اس طرف دھیان نہ جاسکا۔"

پھر وہ نجم کی طرف متوجہ ہُوا۔

"یہ کب ہُوا نجم......" اس کا اشارہ محمود اصغر کی موت کی طرف تھا۔

"جس رات میں سینی ٹوریم والوں کے خط پر یہاں پہنچا۔" نجم آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ "محمود اصغر کی حالت بہت خراب تھی۔ ایم ایس نے مجھے بتایا کہ وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'بھائی کیوں نہیں آئے؟' میں اس سے جھوٹ نہ بول سکا۔ شیراز جس طرح مرتے دم کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکتا اسی طرح کسی مرتے ہوئے انسان سے بھی جھوٹ نہیں بولا جاسکتا۔ یہ تجربہ مجھے اس دن ہُوا۔ اس نے میری مختصر بات سنی تو اس کی حالت اور بگڑ گئی۔ اس نے کہا...... وکیل انکل...... بھائی کو میرے بارے میں ہرگز نہ بتایئے گا۔ میں جانتا ہوں کچھ دیر بعد میری موت واقع ہو جائے گی۔ میں بچ نہیں سکوں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں بھائی کو میرے بارے میں ابھی کچھ پتہ نہ چلے۔ وہ اور دکھی ہو جائیں گے لیکن انہیں کہیے گا وہ کبھی خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ میں پل پل ان کے ساتھ رہوں گا۔ وہ کبھی خود سے مجھے دور نہ پائیں گے۔"

ایک پل کو نجم رکا۔ شیراز سر جھکائے سن رہا تھا۔ پھر نجم نے دوبارہ زبان کو حرکت دی۔

"اسے انتہائی نگہداشت وارڈ سے نکال کر ایمرجنسی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کی آخری سانسیں چل رہی تھیں' جب اس نے سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر ایک چھوٹے سے کاٹیج کی تصویر دیکھی...... بولا...... 'وکیل انکل...... بھائی سے کہیے گا میرے لیے ایسی ہی چھوٹی سی کوٹھی بنوائے۔ مگر اس کی دیواریں نہ ہوں۔ دم گھٹتا ہے ان کے اندر میرا......' پھر اس کا سانس اکھڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے بڑی جان ماری۔ بڑی کوشش کی مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ خون کے ساتھ گوشت کے لوتھڑے آرہے تھے منہ سے...... آخری بات جو اس نے دم دینے سے پہلے کہی وہ یہ تھی شیراز کہ اس نے میرا ہاتھ اپنے کمزور' تپتے ہوئے ہاتھوں میں جکڑ کر کہا۔ 'وکیل انکل...... اُوپر اذان ہو رہی ہے' بلاوا آرہا ہے' مجھے جانا ہے۔ بھائی سے کہیے گا کبھی کبھی میری قبر پر ضرور آیا کرے۔ میں ہمیشہ اس کا انتظار کروں گا۔ بھائی...... بھائی۔'"

پھر اس نے کلمہ پڑھا اور آخری بار خون آلود قے کر کے رخصت ہو گیا۔ اور شیراز...... میں تمہیں بتاؤں...... اس کی موت پر سینی ٹوریم کے عملے میں سے کون ہو گا جو رویا نہیں۔ کوئی ڈاکٹر...... کوئی نرس ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو...... مگر...... میں جو محسوس کر رہا تھا وہ کسی اور کے دھیان میں نہ تھا۔ میں نے صاف محسوس کیا شیراز کہ محمود اصغر کے کھلے ہونٹوں سے مرنے کے فوراً بعد خون نہیں نکلا' لوتھڑے نہیں نکلے' سب ختم ہو گیا مگر کمرے میں ایک مسحور کن مہک پھیل گئی جواب بھی ہم سب کے ساتھ موجود ہے۔ جو وقت پڑنے پر ہمیشہ تمہارے گرد حفاظت بن کر پھیل جاتی رہی۔ یہ محمود اصغر کی روح ہے شیراز۔ وہ جب بھی آئے گا' یہ خوشبو' یہ مہک اس کی آمد کی نشانی کے طور پر تمہارے دل ودماغ میں تازگی' طمانیت اور آسودگی بھر دے گی۔"

نجم خاموش ہو گیا۔

شیراز آنکھیں بند کیے قبر کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا اور بس!

"تو یہ ہے وہ پارک جس میں زمین خرید کر تم نے میرے محمود اصغر کے لیے چھوٹی سی کاٹیج بنوا دی...... تین چار دن تم اسی لیے یہیں رکے رہے تھے نجم۔"

"ہاں......" نجم نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "میرا جی نہ چاہا کہ اس کی آخری خواہش پوری کیے بغیر لوٹ جاؤں۔"

"بہت اچھا کیا۔ ورنہ مجھے تم سے گلہ رہتا۔" وہ آہستہ سے بولا۔ پھر اس نے نجم کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"ایک بات بتاؤ نجم۔"

"کیا؟" نجم نے اسے سوالیہ انداز میں کہا۔

"جب محمود اصغر نے دم دیا تو اس کے ہونٹوں پر وہی معصوم' بے مثال سی فرشتوں جیسی مسکراہٹ تھی کہ نہیں؟"

"تھی شیراز...... میں آج تک وہ مسکراہٹ فراموش نہیں کر سکا۔ مجھے آج بھی لگتا ہے جیسے میں نے محمود اصغر کی نہیں مسکراہٹ کی موت کا نظارہ کیا تھا۔"

"ہاں......" شیراز کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں جانتا تھا۔ وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ کوئی نہیں۔ اس کی مسکراہٹ چھینتے وقت موت کے دل پر بھی ہاتھ پڑا ہو گا نجم۔"

"بس کر ماسٹر...... بس کر......" استاد نے اُسے دوبارہ کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ "سینہ شق

کرے گا میرا...... صبر کر...... میں نے اس بچے کی صرف باتیں سنی ہیں۔ کچھ تم سے کچھ نجم سے اور میں سہہ نہیں پا رہا۔ تُو کب برداشت کر سکے گا یہ صدمہ۔ مگر برداشت تو کرنا ہے' سہنا تو ہے' اس لیے خاموش ہو جا' ارے پگلے' تیرے لیے تو سب سے بڑا سکھ یہ ہے کہ وہ ہر پل تیرے ساتھ ہے۔ اگر تو اسے نہیں بھولا تو وہ کیا تجھ سے دور ہے۔ وہ تو موت کی حد میں پھلانگ کر تجھ تک آ جاتا ہے۔ مزہ لے اس عنایت کا...... اس مہربانی کا......'' استاد نے آسمان کی طرف دیکھا اور بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ جو اوپر بیٹھا سارا کھیل رچائے ہوئے ہے ناں۔ وہ زخم دیتا ہے تو مرہم پہلے تیار رکھتا ہے۔ اس نے جدائی کو کیسے حسین ملن سے نوازا ہے۔ بس وہ دکھائی نہیں دیتا تجھے' ہے تو تیرے آس پاس۔ تیرے ساتھ ساتھ' تیرے اردگرد' دیکھ اب بھی وہ تیرا ہی طواف کر رہا ہے۔ تیرے ہی بوسے لے رہا ہے۔ تجھے ہی تسلیاں دے رہا ہے۔'' استاد نے اِدھر اُدھر رقصاں خوشبو کی طرف شیراز کا دھیان دلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تجھے نہیں لگتا کہ وہ تیری آمد پر بے قرار ہے تو خوش بھی ہے۔ تو مضطرب ہو گا۔ تڑپے گا تو اسے بے چین کرے گا۔ ضبط کر لے۔ خود پر اس کی یادوں کا خول چڑھا لے۔ اُسے سکون سے رہنے دے۔ چل ہاتھ اٹھا...... اس کے لیے۔ دعا کر...... اسے صرف یہی ایک چیز درکار ہے...... اس کی کمی نہ آنے دے اُسے۔''

شیراز نے نجم اور شمشاد نے استاد کی تقلید میں ہاتھ اٹھائے اور سر جھکا کر دعا کی آسودگی میں اترتے چلے گئے۔

خوشبو ان کے گرد رقصاں تھی۔ خوشبو...... ان کے سروں پر...... رخساروں پر...... دعا کے لئے اٹھے ہاتھوں پر بوسے دے رہی تھی۔ محمود اصغر کی مہک ان کے دلوں میں' ان کے احساسات میں روح کے رشتوں کا اعتراف نقش کر رہی تھی۔

دور کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی...... کسی محمود اصغر کو نماز کے لیے پکارا جا رہا تھا اور کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی محمود اصغر اس بلاوے پر نماز کے لیے بھاگا جا رہا تھا...... قضا سے بچنے کے لیے...... ادا کی سعادت کے لیے۔

ختم شد